خزاں کی بارش

دلہن کا فرار

اے حمید

PDFBOOKSFREE.PK

اسے پتھر کے درمیان ایک گول بڑا پائپ آگے کو جاتا نظر آیا وہ پائپ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا جہاں
پائپ ختم ہو کر باہر کو جاتا تھا وہاں ایک چھوٹا سا جنگلا لگا ہوا تھا۔ ندیم نے اسے پکڑ کر زور سے اپنی
طرف کھینچا جنگلا لوہے کا تھا اور اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا۔ ندیم سوچنے لگا کہ نذرل نے تو کہا تھا یہاں
سے ایک کھلا راستہ باہر جاتا ہے پھر سوچا کہ کھلا راستہ کیسے ہو سکتا ہے یقیناً اس کی مراد اس جنگلے ہی سے
تھی مجھے اس جنگلے کو کسی طرح توڑنا ہوگا وہاں پتھر ضرور پڑے تھے مگر ندیم پتھر سے ضرب نہیں لگا سکتا
تھا اس کی آواز پر سنتری چوکنے ہو کر وہاں آ سکتے تھے۔ ندیم ان پتھروں کو ہلانے کی کوشش
کرنے لگا جن میں آہنی جنگلا لگا تھا۔ یہاں ایک پتھر اپنی جگہ سے ہلا ہوا تھا۔ ندیم نے اس پر اپنا
سارا زور صرف کر دیا اور تھوڑی سی کوشش کے بعد پتھر باہر نکل آیا اب دوسرے پتھر کا اکھاڑنا
مشکل نہیں تھا تین چار پتھر نکالنے کے بعد جنگلا اپنی جگہ سے ہل گیا۔ ندیم نے اسے ایک طرف کو
پاؤں کے زور سے موڑ دیا جب وہاں ایک آدمی کے گزرنے کی جگہ پیدا ہو گئی تو ندیم اس میں سے
نکل کر اندھیرے میں دوسری طرف آ گیا۔ دوسری طرف بھی سیمنٹ کا پائپ آگے جا رہا تھا یہاں
پہلی بار اسے جنگل کی ٹھنڈی ہوا محسوس ہوئی۔ وہ جیل کی زمین دوز دیواروں سے باہر نکل آیا تھا
اس کے اردگرد جنگلی جھاڑیوں کی بھرمار تھی۔ پائپ ان کے بیچ میں سے گزرتا تھا۔ ندیم جھاڑیوں کے
باہر آ کر بیٹھ گیا اور اندھیرے میں آنکھیں کھول کر تکنے لگا۔ نذرل نے اسی جگہ آنے کو کہا تھا۔
وہ سانس روکے کالی سیاہ جھاڑیوں کی اوٹ میں دبکا بیٹھا رہا۔ اتنے میں پتوں پر کسی کے چلنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی آواز سنائی دی: ندیم نے چونک کر پیچھے دیکھا اندھیرے میں اس نے نذرل بابا کو پہچان لیا تھا۔

نذرل نے آہستہ سے کہا "جلدی سے میرے پیچھے پیچھے آجاؤ۔"

اور وہ آگے آگے چل پڑا۔ یہ کسی ٹیلے کی ڈھلان تھی اور وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ ندیم نے نذرل کو اس اندھیرے میں بھی اپنی آنکھوں کے سامنے رکھا اور اس کے پیچھے پیچھے چلتا گیا۔ ڈھلان سے اترنے کے بعد ایک ہموار جگہ آگئی پھر درختوں میں چڑھائی تھی اس چڑھائی کے بعد ایک گھاٹی آگئی۔ نذرل گھاٹی میں اتر گیا۔ اس گھاٹی میں برساتی نالہ تھا جو خشک تھا جب برسات ہوتی تھی تو نالہ بھر جاتا تھا۔ بارش کے ختم ہونے کے چند دنوں بعد ہی نالہ بالکل خشک ہو جاتا تھا۔ اس کا سارا پانی سمندر کی طرف بہہ جاتا تھا۔ یہ دونوں اندھیرے میں خشک نالے میں جنوب کی طرف چلتے گئے کافی دیر چلنے کے بعد سیاہ کالی چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ چٹانیں ختم ہوئیں تو سامنے ایک پہاڑی کھڑی تھی وہ پہاڑی کے دامن میں اس کی دوسری جانب آگئے یہاں آکر نذرل ندیم کو جھاڑیاں ادھر اُدھر ہٹا کر ایک سرنگ میں لے گیا جس کی چھت اتنی اونچی تھی کہ انھیں جھک کر اس میں داخل ہونا پڑا۔

نذرل نے کہا "یہاں تم اس وقت تک چھپے رہو گے جب تک کہ کرشنا جہاز انڈمان سے ہندوستان کے لیے روانہ نہیں ہوتا میں تمھیں اس میں سوار کرنے کی کوشش کروں گا ایک ترکیب میرے ذہن میں ہے۔"

ندیم اندھیرے میں غار میں بیٹھ گیا اس نے کہا "نذرل چچا! میرے فرار ہونے سے تم پر تو کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔؟"

وہ بولا "میری بات تم چھوڑو... میرا کام گنتی کی آواز لگانا ہے میں نے گنتی پوری کر دی تھی... مجھے کوئی نہیں پوچھے گا۔ ہاں سنتری سکنہ لال ضرور معطل ہو گا۔ مجھے معلوم تھا آج شوراتری ہے اور یہ لوگ اوپر والے آفس میں رات کو اودھم مچائیں گے اب میں جاتا ہوں میرا زیادہ دیر یہاں رہنا ٹھیک نہیں... میں کل کسی وقت آکر تمھیں کھانے کو روٹی چاول دے جاؤں گا۔"

ندیم نے جب اس خدشے کا اظہار کیا کہ جیل کے لوگ اس کی تلاش میں ادھر تو نہیں آئیں گے تو نذرل بولا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو... میں انھیں غلط راستے پر ڈال دوں گا اس طرف نہیں آنے دوں گا۔ ...اگر آ گئے تو تمھاری قسمت پھر تم جانو اور تمھاری قسمت... میں نے ایک سچّے مسلمان کے ناتے تمھاری مدد کی ہے تم مسلمان ہو بے گناہ ہو اور پاکستانی ہو تمھاری مدد کرنے کے لیے مجھے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہیئے... اب میں جاتا ہوں... ہاں! دن کی روشنی میں اس غار سے ہرگز باہر مت نکلنا رات کو بھی نکلو تو جھاڑیاں غار کے منہ پر ڈال دیا کرنا۔ اللہ تمھارا نگہبان ہو۔"

غار کے اندھیرے میں نذرل کا سایہ باہر نکل گیا۔ ندیم نے اس کے جانے کے بعد غار کا جائزہ لیا اسے دکھائی تو کچھ نہیں دے رہا تھا۔ ہاتھ سے دیواروں کو ٹٹول کر دیکھا۔ پتھریلی دیوار تھی جس میں کہیں کہیں سے خشک گھاس باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ وہاں مچھر بھی تھے مگر ندیم کو سب سے زیادہ ڈر سانپ بچھو کا تھا لیکن آزادی کے احساس نے اس خوف کو بھی کافی حد تک زائل کر دیا تھا۔ جنگل میں سناٹا چھایا ہوا تھا کسی وقت کسی درندے کی عجیب سی آواز گونج جاتی تھی یہ آواز بھیڑیئے کی آواز سے کافی مشابہت رکھتی تھی۔ اس قسم کی آوازیں اسے جیل کی کوٹھڑی میں بھی آیا کرتی تھیں۔

ندیم نے باقی ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔

صبح کی ہلکی ہلکی سلیٹی رنگ کی روشنی غار میں آنے لگی تو وہ اٹھ کر غار کے منہ پر آکر بیٹھ گیا۔ سامنے جنگلی جھاڑیاں تھیں اس نے جھاڑیوں کو ایک طرف ہٹا کر دیکھا۔ اس کے سامنے اونچی نیچی زمین پر گھنے درختوں، اونچی گھاس اور جھاڑیوں کا سلسلہ دور پہاڑی تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ اس قدر دشوار گزار علاقہ تھا کہ لگتا تھا ادھر کبھی کوئی نہیں آیا۔ ہوا میں سبزے کی مہک رچی ہوئی تھی۔ ندیم اٹھ کر غار میں واپس آگیا۔ اس کے پاس سگریٹ بھی نہیں تھے جن کو پھونک کر وہ وقت گزار لیتا۔ غار کی زمین ریتلی تھی اور اس کا رنگ سرخی مائل تھا۔ جیل کا سائرن رات کو نہیں بجا تھا لیکن ندیم کو یقین تھا کہ اب تک اس کے فرار کا پتہ چل گیا ہو گا کالے پانی کی جیل میں زیادہ قیدی نہیں تھے اس لیے وہاں سائرن نہیں بجایا گیا تھا۔ لیکن جیسا کہ بعد میں نذرل چچا نے اسے بتایا اس کے فرار کا علم رات دو بجے اسی وقت ہو گیا تھا جب سنتری نشے میں مدہوش وہاں آیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور اس کو کوٹھڑی کا دروازہ کھلا ہوا ملا۔ سنتری سکنہ لعل کو حراست میں لے لیا گیا تھا اور کالے
پانی کی پولیس اور فوج نے مل کر جنگل میں اس کی تلاش شروع کر دی تھی۔ غار میں دن کے وقت
بھی حبس اور مچھر برابر ندیم کو تنگ کر رہے تھے۔ انھیں بھگانے کے لیے وہ دھونی بھی نہیں لگا سکتا
تھا۔ ندیم کو پیاس لگ رہی تھی مگر وہ پانی پینے غار سے نکل کر جنگل میں نہیں جا سکتا تھا۔
نذرل چچا نے اسے منع کیا تھا۔ دوپہر کے قریب نذرل چچا آ گیا۔ وہ ندیم کے لیے ڈبل روٹی
اچار اور پانی سے بھرا ہوا چھوٹا مشکیزہ ساتھ لایا تھا۔ ندیم نے سب سے پہلے پانی پیا۔
نذرل نے اسے بتایا کہ اسے جگہ جگہ تلاش کیا جا رہا ہے۔

جیل میں نذرل چچا کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ نہ صرف یہ کہ اس نے زندگی کے تیس برس وہاں
نوکری کرتے گزار دیئے تھے بلکہ وہ ایک دیانت دار اور فرض شناس ملازم تھا۔ چنانچہ اس
نے جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو یہ مشورہ دیا کہ قیدی یقینی طور پر اس جزیرے سے نکل کر انڈیمان
کے دوسرے کسی جزیرے میں جا چھپا ہے وہ اس جزیرے میں ٹھہرنے کا خطرہ مول نہیں لے
سکتا۔ انڈیمان کے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں یوں اس نے جیل کے حکام اور پولیس
کو غلط راستے پر ڈال دیا تھا۔ ان جزیروں کو کھنگالنے تک کافی وقت گزر جاتا اور اس دوران
نذرل چچا ندیم کو وہاں سے نکال کر جہاز میں سوار کرا دیتا۔ اب نذرل نے ندیم کو وہ اسکیم بتائی
جس پر عمل کرتے ہوئے ندیم کو "کرشنا" جہاز کے ذریعے واپس ہندوستان جانا تھا۔ ہندوستان
واپس جانے کا فیصلہ ندیم نے اس لیے کیا تھا کہ انڈیمان سے ان دنوں بحری جہاز صرف ہندوستان
کو ہی جاتے تھے۔ کولمبو یا انڈونیشیا کی جانب کوئی جہاز نہیں جاتا تھا۔ ویسے بھی ندیم ہندوستان
سے نجمی کو ساتھ لیے بغیر پاکستان نہیں جا سکتا تھا۔ جب نذرل چچا نے ندیم کو اسکیم بتائی تو ایک بار
تو ندیم کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے اسے قبر میں بند کرنے کی تیاریاں ہو رہی
ہیں۔ اسکیم یہ تھی۔

ہندوستان سے جو بحری جہاز آتے تھے وہ مٹی کا تیل، نمک، دالیں اور دوسری چیزیں لاتے
تھے یہاں سے واپس جاتے ہوئے کالی مرچ الائچی اور مقامی کاریگروں کے بنائے ہوئے ناریل کی
لکڑی کے نوادرات چھوٹے چھوٹے بت، ایش ٹرے، پاندان، سجاوٹ کی چیزیں اور پٹ سن کی ٹوکریاں

وغیرہ اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ الائچی اور کالی مرچیں تو بوریوں میں بھری جاتی تھیں لیکن نوادرات لکڑی
کے بڑے بڑے بکسوں میں پیک کر کے بھیجی جاتی تھیں۔ پٹ سن کی نوادرات کی برآمد کا کام نذرل چچا کا
ایک رشتے دار کرتا تھا۔ یہ مال نذرل کے مکان کے ایک گودام میں لکڑی کے بڑے بڑے کریٹوں میں بھرا
جاتا تھا۔ نذرل چچا نے ندیم کو بتایا کہ اسے نوادرات کے ایک کریٹ میں لٹا کر "کرشنا" بحری جہاز میں
لاد دیا جائے گا۔ کلکتے کی بندرگاہ پر یہ مال ایک بہت بڑے گودام میں رکھوا دیا جاتا ہے جہاں سے
وہاں کا ایک مارواڑی سیٹھ آ کر اسے چھڑا کر لے جاتا ہے اور اپنے گودام میں رکھوا دیتا ہے۔
نذرل نے کہا "اس مارواڑی سیٹھ کے گودام میں پہنچنے کے بعد تم لکڑی کے کریٹ کو کھول کر باہر نکل
آؤ گے۔ اس گودام سے باہر نکلنا تمھارے لیے اتنا مشکل نہیں ہوگا۔ کیا خیال ہے؟ تم اس کے لیے
تیار ہو؟ یہ ذہن میں رکھنا کہ اس کے سوا تمھارے لیے یہاں سے نکلنے کا اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔"
ندیم نے نذرل کی اسکیم کو بڑے غور سے سنا تھا۔ خیال ہی خیال میں اس نے اپنے آپ کو لکڑی کے
بکس میں بند پایا تو اس کا دم گھٹنے لگا اس نے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھ کر کہا "چچا! لکڑی کے
بکس میں مجھے ہوا کہاں سے آئے گی؟"
نذرل بولا "اس کا بندوبست کر دیا جائے گا۔ لکڑی کے بکس میں سوراخ کر دوں گا جن میں
سے تمھیں تازہ ہوا آتی رہے گی۔"
ندیم نے پوچھا "اگر میرے بکس کے اوپر دوسرے کریٹ رکھ دیئے گئے تو مجھے ہوا کہاں سے
آئے گی؟"
نذرل چچا نے کہا "میں اپنے رشتے دار کے ساتھ بندرگاہ پر جاؤں گا اور کوشش کروں گا کہ
تمھارے کریٹ کے اوپر کوئی دوسرا کریٹ نہ رکھا جائے بلکہ سب سے اوپر تمھارا کریٹ ہو۔ ویسے
اتنا خطرہ تو تمھیں مول لینا ہی ہوگا یہ تمھاری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اس کے علاوہ کریٹ
کے پہلوؤں میں بھی تمھارے منہ کے قریب سوراخ ہوں گے تمھیں وہاں سے بھی ہوا ملتی رہے گی۔"
ندیم نے زندگی اور آزادی کے لیے موت کے منہ سے گزرنے کا فیصلہ کر لیا اس نے کہا کہ
میں تیار ہوں۔ نذرل چچا نے ندیم کی بہادری کی تعریف کی اور ایک بار پھر تاکید کرتے ہوئے کہا "لیکن
یہ بات یاد رکھنا اگر تم کسی وقت بھی پکڑے جاؤ تو میرا نام مت لینا۔" ندیم نے اسے یقین دلایا کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ تشدد سہتے سہتے مر جائے گا مگر اس کا نام زبان پر نہیں لائے گا۔ نذرل چچا دوسرے روز رات کو آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

یونہی ندیم نے اس غار میں دو ہفتے گزار دیئے "کرشنا" جہاز کے آنے میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا کہ ایک روز شام سے پہلے اسے جنگل میں کچھ انسانی آوازیں سنائی دیں۔ آوازیں قریب آتی معلوم ہو رہی تھیں کیا پولیس کے آدمی ادھر آ رہے ہیں؟ اس خیال سے ہی ندیم کو پسینہ آ گیا وہ غار سے نکل کر جھاڑیوں کی اوٹ میں آ گیا اور شاخوں کو ایک طرف ہٹا کر درختوں کی طرف نگاہ دوڑائی اسے درختوں کے نیچے جھاڑیوں کے اوپر انسانی سر دکھائی دیئے۔ یہ چھ سات آدمی تھے لیکن ان میں سے کسی نے بھی پولیس یا فوج کی وردی نہیں پہن رکھی تھی پولیس اور فوج کی ٹوپیوں کو ندیم دور ہی سے پہچان لیتا تھا لیکن یہ انٹیلی جنس کے آدمی بھی ہو سکتے تھے۔ ندیم نے سوچ لیا کہ اگر وہ اس طرف آئے تو وہ وہاں سے بھاگ جائے گا لیکن ان کی آوازیں دور ہونے لگیں۔ انسانی سر بھی جھاڑیوں کے پیچھے غائب ہو گئے پھر آوازیں بھی ختم ہو گئیں۔ ندیم نے اطمینان کا سانس لیا مگر اب اسے غار میں بھی بے چینی لگی رہی کہیں یہ لوگ اوپر سے ہو کر غار میں نہ آ جائیں۔ ظاہر ہے ان کے پاس اسلحہ ہوگا اور ندیم ان کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ لیکن خیریت ہی رہی اور ان لوگوں کی آوازیں پھر سنائی نہ دیں۔

سورج غروب ہو گیا۔ درختوں پر پرندوں کا شور گونج اٹھا پھر رات کا اندھیرا چھا گیا اور سب آوازیں خاموش ہو گئیں۔ ندیم احتیاط کے طور پر غار کے اندر رہنے کی بجائے غار کے منہ کے قریب ایک گھنی جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ گیا جہاں سے وہ جنگل میں دائیں بائیں اور سامنے نگاہ ڈال سکتا تھا۔ جب رات گہری ہو گئی تو اسے فضا میں مخصوص سیٹی کی آواز سنائی دی۔ نذرل اندر آنے سے پہلے ایک پرندے کی طرح ہلکی سی سیٹی بجا دیتا تھا جس سے ندیم سمجھ جاتا کہ نذرل چچا آ رہا ہے سیٹی کی آواز سنتے ہی ندیم لپک کر غار کے اندر آ گیا تھوڑی دیر بعد نذرل چچا غار میں داخل ہوا وہ روٹیاں اچار اور پانی کا مشکیزہ ساتھ لایا تھا جب ندیم نے اسے بتایا کہ آج وہاں سے کچھ آدمی گزرے تھے۔ تو نذرل کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ کچھ سوچنے لگا پھر سر اٹھا کر بولا "بیٹا! تمھیں آج رات ہی میرے ساتھ گودام میں چلنا ہوگا کرشنا جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز ہو چکا ہے وہ تین دن بعد

انڈیمان سے روانہ ہوگا میرا خیال تھا کہ میں تمھیں کل یہاں سے لے جاؤں گا مگر لگتا ہے اس جنگل میں بھی تمھاری کھوج شروع ہو گئی ہے اس لیے بہتر ہے کہ تم آج ہی میرے ساتھ یہاں سے نکل چلو۔"

ندیم نے اچار کے ساتھ روٹی کھائی۔ جی بھر کر پانی پیا۔ نذرل چچا کہنے لگا "تم اسی جگہ ٹھہرو میں باہر جا کر دیکھ آؤں۔"

وہ غار سے نکل گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا اور کہنے لگا "چلو سب ٹھیک ہے میرے پیچھے پیچھے چلنا۔ شہر کی آبادی شروع ہو تو مجھ سے کچھ فاصلے پر ہو جانا۔" ندیم نے جنگل میں نذرل کے عقب میں چلنا شروع کر دیا۔ اندھیرے میں دونوں دیر تک چلتے رہے۔ انھوں نے جنگل کا سارا علاقہ عبور کر لیا تو ڈھلان سے اترتے ہوئے فاصلے پر ندیم کو مکانوں کی ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ نذرل آگے آگے تھا۔ وہ اسے آبادی سے کچھ فاصلے پر جنوب کی طرف ایک بستی کے سرے پر لے گیا۔ یہاں روشنی کہیں کہیں تھی۔ نذرل رک گیا اور بولا۔

"اب تم میرے اور اپنے درمیان کچھ فاصلہ رکھ لو گودام میرے مکان کے عقب میں ہے اور میرا مکان سامنے والی بستی کے کونے میں ہے۔ آ جاؤ۔"

نذرل چلا تو ندیم رکا رہا۔ جب وہ اس سے دس پندرہ قدم دور ہو گیا تو ندیم بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ آخر وہ ایک مکان کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ آگے گودام کا لکڑی کا برآمدہ تھا۔ دالان میں ناریل کے درخت اندھیرے میں اپنے بھوتوں ایسے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ نذرل ندیم کو ایک گودام میں لے گیا جس کے اندر لکڑی کے کھوکھے اور دوسرا سامان بکھرا پڑا تھا۔ چھت کے ساتھ دھیمی روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ نذرل بولا۔

"یہی وہ گودام ہے جہاں لکڑی کے کھوکھوں میں ہندوستان جانے والا سامان بھر کر لایا جاتا ہے۔ یہاں ان کھوکھوں پر کمپنی کے پتے لکھے جاتے ہیں۔ میں نے اپنے رشتہ دار سے تمھارے بارے میں ساری بات کر لی ہے۔ تم پریشان مت ہونا۔ وہ بھی میری طرح پاکستان کا سچا عاشق ہے۔ وہ بڑی خوشی سے تمھیں کھوکھے میں بند کر کے ہندوستان پہنچانے پر تیار ہو گیا ہے۔ چونکہ یہ ان کی ساکھ کا معاملہ ہے اس لیے وہ تم سے صرف یہ چاہتا ہے کہ جب تم کلکتہ میں سیٹھ کے گودام سے باہر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نکلو تو اس سے پہلے اس کھوکھے میں آگ لگا دینا جس میں بند ہو کر تم نے سفر کیا تھا۔"

ندیم نے کہا: "میں آگ ضرور لگا دوں گا۔ لیکن اتنی جلدی اسے آگ لگ جائے گی۔"

اس پر نذرل نے اسے بتایا کہ ماچس اور مٹی کے تیل کی ایک بوتل اس کے ساتھ رکھ دی جائے گی۔ نذرل کہہ رہا تھا: "یہ محض اس لیے ہے کہ اگر سیٹھ کو علم ہو گیا کہ ایک کھوکھے میں مال آدھے سے بھی کم تھا تو میرے رشتہ دار کی ساکھ کو نقصان پہنچے گا۔"

ندیم نے کہا: "چچا! اگر میں خیریت سے کلکتہ پہنچ گیا اور سیٹھ کے گودام میں پہنچ کر کھوکھے سے باہر بھی نکل آیا تو یقین کرو کہ میں اس کے سارے گودام کو آگ لگا کر ہی گودام سے باہر نکلوں گا۔"

نذرل بولا: "سارے گودام کو آگ لگانے کی ضرورت نہیں بیٹا۔ تم صرف وہی کھوکھا جلا دینا جس میں بند ہو کر تم جاؤ گے۔ اچھا اب تم یہاں کہیں لیٹ کر آرام کرو۔ میں صبح آؤں گا۔ ساتھ ہی میرا مکان ہے جہاں میرے بیوی بچے رہتے ہیں۔ تم آواز بالکل نہ نکالنا۔"

نذرل چلا گیا۔ دوسرے دن وہ صبح صبح ایک پرانا سا تھرماس لے کر آ گیا۔ اس میں گرم گرم چائے تھی۔ ساتھ وہ ڈبل روٹی کے ٹکڑے بھی لایا تھا۔ ندیم نے بڑے مزے سے چائے پی۔ کتنے دنوں کے بعد چائے نصیب ہوئی تھی۔

نذرل کہنے لگا: "آج شام کو مال کے کھوکھے اس گودام میں آ کر لگا دیئے جائیں گے۔ اس وقت میں تمھیں دوسری کوٹھڑی میں چھپا دوں گا۔ کیونکہ میرے رشتہ دار کے ساتھ مزدور بھی ہوں گے۔ دو دن بعد یہ مال یہاں سے بندرگاہ کی گودی پر پہنچا دیا جائے گا۔ اسی روز رات کو مال کر شنا جہاز پر لاد دیا جائے گا اور اس رات کی صبح کو جہاز کلکتہ کی طرف روانہ ہو جائے گا سمندری سفر دو دن میں طے ہو گا۔ تیسرا دن تمھیں کلکتہ کے گودام میں آئے گا۔ اس کے بعد تم وہاں سے نکل جانا۔"

شام کو نذرل چچا نے ندیم کو گودام کی ساتھ والی کوٹھڑی میں چھپا کر باہر سے تالا لگا دیا۔ اس کا رشتہ دار ٹرک پر مال لدوا کر مزدوروں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ بھرے ہوئے کھوکھے گودام میں ایک طرف لگا دیئے گئے۔ جب سارا سامان گودام میں پہنچ گیا تو نذرل کے رشتہ داروں نے

ٹرک ڈرائیور اور مزدوروں کو وہاں سے رخصت کر دیا۔ پھر نذرل کی طرف جھک کر رازداری سے بولا۔

"پاکستانی لڑکا کہاں ہے؟"

نذرل نے بند کوٹھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا رشتہ دار بولا: "اب اسے گودام میں لے آؤ میں تمھارے گھر جا رہا ہوں۔ جس رات سامان بندرگاہ کی گودی پر جانے والا ہو گا اس روز شام کو آ کر میں اس پاکستانی نوجوان کو اس کے لیے تیار کیے گئے خاص کھوکھے میں بند کر دوں گا۔ یہ خاص کھوکھا گودام میں مال کے ساتھ ہی پہنچا دیا گیا۔"

نذرل کا رشتہ دار اس کے گھر کی طرف مڑ گیا اور نذرل نے کوٹھڑی کھول کر ندیم کو وہاں سے نکالا اور گودام میں لے جا کر کہا: "ان کھوکھوں میں ایک خالی کھوکھا بھی ہے۔ اس کھوکھے میں لیٹ کر تم بحری جہاز میں سفر کرو گے۔" ندیم نے لکڑی کے اس بکس کو ایسے دیکھا جیسے بلی اس پنجرے کو دیکھتی ہے جس میں اسے بند کیا جا رہا ہو۔ یہ کھوکھا لمبائی میں چھ فٹ اور چوڑائی میں ساڑھے تین فٹ تھا۔ اس کے اندر گدیلا بچھا کر سرھانہ رکھ دیا گیا تھا۔ مٹی کے تیل کی ایک پلاسٹک کی بوتل، ماچس، بسکٹوں کا ڈبہ، پانی سے بھرا ہوا مشکیزہ، خشک میووں کی تھیلی بھی رکھ دی گئی تھی۔ دو دن بعد جب رات کے پچھلے پہر ندیم اس کھوکھے میں اتر کر لیٹ گیا تو اسے وہ بڑا آرام دہ لگا۔ نذرل چچا اور اس کا رشتہ دار اس کے پاس ہی گودام میں موجود تھے۔ ان کے سوا وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ جہاز کی رولنگ اور دھچکوں سے بچنے کے لیے ندیم کے دائیں بائیں فوم کے لمبے تکیے اس طرح پھنسا دیئے گئے کہ ندیم کو دھچکے بھی نہ لگیں اور اسے ہلنے جلنے میں بھی آسانی ہو۔ کھوکھے کی اونچائی اتنی رکھی گئی تھی کہ ندیم گھٹنے اوپر اٹھا سکتا تھا لکڑی کی دیواروں میں منہ کے قریب دائیں بائیں چھ چھ گول سوراخ ہوا کی آمدورفت کے لیے رکھے ہوئے تھے۔

نذرل چچا بولا: "بیٹا گھبرانا بالکل نہیں۔ سمندر ان دنوں پرسکون ہوتا ہے۔ ہچکولے نہیں لگتے۔ معمولی سی رولنگ ہوتی ہے۔ تمھیں ہوا برابر آتی رہے گی اور ہم تمھارے کھوکھے کو جہاز میں اس طرح رکھوائیں گے کہ تمھارے اوپر کوئی دوسرا کھوکھا نہ رکھا جائے۔ اب میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھوکھے کو بند کرتا ہوں۔ ذرا دیکھو تمھیں ہوا کتنی آتی ہے۔" یہ کہہ کر نذرل چچا نے کھوکھے کے اوپر لکڑی کا تختہ رکھ دیا۔ کھوکھے کے اندر اندھیرا چھا گیا۔ ندیم کو یوں محسوس ہوا جیسے اسے قبر میں بند کر دیا گیا ہے۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اوپر والے تختے اور دائیں بائیں کے سوراخوں میں سے تازہ ہوا کھوکھے میں آ رہی تھی۔ نذرل نے تختہ اٹھا دیا۔ اس کا رشتہ دار بولا "دم تو نہیں گھٹتا تھا نا بیٹا؟"

"جی نہیں۔" ندیم نے آہستہ سے کہا۔ اسے دم گھٹنے کا احساس ضرور ہوا تھا۔ مگر یہ تکلیف اسے ہر حالت میں برداشت کرنی تھی۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ آزادی حاصل کرنے اور نجمی کے شہر کلکتے پہنچنے کے لیے اسے اس جان گسل مرحلے سے بہرحال گزرنا تھا۔

نذرل کہنے لگا "تمھارے پاس ضرورت کی ہر شے رکھ دی گئی ہے۔ جہاز دوسرے روز شام کو کلکتہ پہنچ جائے گا۔ ہم نے مارواڑی سیٹھ کو تار دے دیا ہے کہ وہ سامان جلدی چھڑا لیا کرے۔ یقیناً وہ پرسوں شام ہی کو سامان چھڑا کر ساتھ لے جائے گا اور تمھیں بندرگاہ کے گودام میں نہیں جانا پڑے گا۔" نذرل چچا نے گھڑی دیکھی۔ اس کا رشتہ دار بولا "میرا خیال ہے اب کھوکھا بند کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ مال گودی تک لے جانے کے لیے ٹرک آتا ہی ہوگا۔"

پھر ندیم کی طرف متوجہ ہو کر کہا "تختے میں کیل اس طرح ٹھونکی جائیں گی کہ تم تھوڑی سی کوشش کر کے اسے اوپر اٹھا سکو گے۔ ایک ہتھوڑی تمھارے پاس رکھ دی گئی ہے۔" نذرل چچا نے ندیم کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرا اور کہا "بیٹا! خدا تمھیں بہت جلد خیریت سے پاکستان پہنچائے میری طرف سے اپنے ماں باپ اور دوسرے پاکستانی دوستوں کو سلام کہنا۔ ہم ہمیشہ پاکستان کی سلامتی کی دعائیں کرتے رہیں گے۔"

ندیم نے نذرل چچا کا ہاتھ تھام کر چوم لیا۔ اس کی آواز جذباتی ہو گئی۔ اس نے نذرل اور اس کے رشتہ دار کا شکریہ ادا کیا۔ نذرل چچا نے جیب سے دو سو روپے انڈین کرنسی کے نکال کر ندیم کو دیئے اور کہا "یہ کلکتہ میں تمھارے کام آئیں گے۔ خدا حافظ بیٹا۔"

کھوکھے کے اوپر تختہ لگا دیا گیا۔ ندیم اندھیرے میں کھوکھے کے اندر خاموش لیٹا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ تختے کو کیلوں سے اس طریقے سے جوڑا گیا کہ وہ اندر سے تھوڑی سی

ضرب لگانے سے کھل سکتا تھا۔ باہر ٹرک کھڑے ہونے اور مزدوروں کی آواز سنائی دی۔ اس وقت گودام میں سے سارا مال ٹرک میں رکھا جانے لگا۔ نذرل کے رشتہ دار نے ندیم والے کھوکھے کو بڑی احتیاط سے دوسرے کھوکھوں کے اوپر رکھوایا اور ٹرک میں بیٹھ کر بندرگاہ کی گودی کی طرف روانہ ہو گیا۔

دوسرے دن سات بجے کرشنا جہاز کوانڈیمان سے روانہ ہونا تھا۔ ندیم چپ چاپ کھوکھے کے اندر بالکل سیدھا لیٹا تھا دل میں خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ وہ اسے صحیح سلامت کلکتہ پہنچا دے۔ ٹرک بندرگاہ پہ پہنچ گیا۔ نذرل کے رشتہ دار نے اپنی نگرانی میں سامان جہاز کے لوئر ڈیک میں رکھوایا۔ اس بات کا اس نے خاص خیال رکھا کہ ندیم والا کھوکھا دوسرے کھوکھوں کے اوپر رکھا جائے اور ایسا ہی ہوا۔ وہ کھوکھے کے اندر اندھیرے میں لیٹا خدا کو یاد کرتے ہوئے دل میں کلمہ شریف کا ورد کر رہا تھا۔

دوسری طرف عبدل ملاح بھی شبانہ کو ساتھ لے کر اسی جہاز میں سوار ہو چکا تھا۔ یہ باربردار جہاز تھا اور عبدل کا تعلق چونکہ مرچنٹ نیوی سے تھا اس لیے اسے اور شبانہ کو دو الگ الگ کیبن کپتان نے دے دیئے تھے باقی ملاح بھی ڈیک پر سوار ہو گئے تھے۔ دن کے ٹھیک سات بجے۔۔ "کرشنا" بحری جہاز نے لنگر اٹھایا اور آہستہ آہستہ بندرگاہ کی جیٹی سے دور ہٹنے لگا۔ شبانہ اور ندیم اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ وہ دونوں ایک ہی جہاز میں سفر کر رہے ہیں۔ ندیم کھوکھے کے اندر لیٹا تھا جہاز کے انجنوں کی آواز سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ جہاز اپنے سفر پہ سمندر میں روانہ ہو گیا ہے۔ ندیم نے ایک لمبا سانس لیا اور آنکھیں بند کر کے خدا سے دعا مانگنے لگا۔

⁂

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جنوری کا مہینہ تھا ان دنوں سمندر پرسکون ہوتا ہے۔

جہاز "کرشنا" سکون سے سمندر میں سفر کر رہا تھا۔ شبانہ اپنے کیبن میں لیٹی لاہور کو یاد کر رہی تھی۔ اسے صرف ایک ہی خیال پریشان کر رہا تھا کہ کلکتہ پہنچنے کے بعد وہ بھارت کی سرحد پار کرکے پاکستان کیسے جائے گی۔ عبدل کو یہ معلوم نہیں تھا کہ شبانہ پاکستانی ہے اور اسے ڈھاکہ سے اغوا کرکے ہندوستان لایا گیا تھا۔ شبانہ نے سوچا کہ عبدل ایک نیک دل مسلمان بزرگ ہے وہ کلکتہ پہنچ کر اسے سب کچھ بتا دے گی وہ ضرور اس کی مدد کرے گا۔ شبانہ کلکتہ کے وکیل صاحب کے ہاں دوبارہ نہیں جانا چاہتی تھی یوں ان کے پولیس کے نظروں میں آجانے کا اندیشہ تھا۔ عبدل نے شبانہ سے کہہ رکھا تھا کہ کلکتہ پہنچ کر تم میرے گھر میں اترنا میں تمھیں اپنی حفاظت میں ڈوبے ہوئے جہاز کے کپتان صاحب کے بنگلے پر پہنچا دوں گا۔ میں نے ان کا بنگلہ دیکھا ہوا ہے ٹالی گنج میں ہے۔ شبانہ وہاں نہیں جانا چاہتی تھی۔ کیونکہ نیک دل کپتان اب اس دنیا میں نہیں تھا وہ تو جہاز کے ساتھ ہی سمندر کے نذر ہو گیا تھا اور وہ اس کی بھانجی بھی نہیں تھی اس کے بیوی بچے صاف عبدل سے کہہ دیں گے کہ یہ لڑکی ہماری رشتے دار نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ میں کلکتہ پہنچ کر عبدل کو ساری بات بتا دوں وہ ضرور مجھے کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچا دے گا وہ جہاز راں ہے جہاز کی کمپنی کا ملازم ہے وہ ضرور اسے کسی ایسے جہاز میں سوار کروا دے گا جو رنگون یا کولمبو جا رہا ہو۔

کرشنا جہاز ہموار رفتار اور ہلکی بے معلوم سی رولنگ کے ساتھ کھلے سمندر میں اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا جہاز کے لوئر ڈیک کے گودام میں ندیم کا کھوکھا بھی دوسرے سامان کے ساتھ

پڑا تھا اس کے اندر ندیم لیٹا خدا کو یاد کر رہا تھا اس کا خیال تھا کہ کھوکھے میں بند ہونے سے اس کا دم ضرور گھٹے گا لیکن ایسا نہ ہوا۔ اسے سوراخوں میں سے برابر تازہ ہوا آ رہی تھی۔ کھوکھے میں اس نے کئی بار پہلو بھی بدلا اور گھٹنوں کو بھی اوپر کیا صرف وہ اٹھ کر بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے پلاسٹک کے چھوٹے ڈبے میں سے تھوڑی سی خشک بھنی ہوئی مچھلی نکال کر ڈبل روٹی کے دو ٹکڑوں کے ساتھ کھائی مشکیزے کو منہ لگا کر پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ فضا میں جہاز کے انجن کی آواز کے سوا دوسری کوئی آواز اسے نہیں آ رہی تھی ندیم کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس وقت دن ہے یا شام ہو گئی ہے وقت انتہائی سست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ جب اسے دوبارہ بھوک لگی تو اس نے اندازہ لگایا کہ رات ہو گئی ہے تھوڑا بہت کھا کر ندیم ایک طرف پہلو کے بل لیٹ گیا یوں اسے کچھ سکون محسوس ہوا۔ نیند اسے نہیں آ رہی تھی۔ جہاز میں اب رولنگ شروع ہو گئی تھی۔

لیکن رولنگ زیادہ نہیں تھی۔ نہ جانے کس وقت تھوڑی دیر کے لیے ندیم کی آنکھ لگ گئی۔ ایک ہی پہلو پر لیٹے رہنے سے اور کچھ کھوکھے کے اندر کی بند فضا کے باعث بہت جلد اس کی آنکھ کھل گئی اس کا جسم اٹھ کر بیٹھنے کا تقاضا کر رہا تھا مگر وہ اٹھ کر بیٹھ نہیں سکتا تھا اس نے دوسری طرف پہلو بدل لیا جسم جیسے لکڑی کی طرح اکڑ گیا تھا۔ ندیم نے لیٹے لیٹے اپنی ٹانگوں اور بازوؤں کو دبانا شروع کر دیا۔ وہ بہت جلد تھک گیا اور اس کا سانس پھول گیا کیونکہ بند کھوکھے میں آکسیجن وافر مقدار میں نہیں آ رہی تھی اس نے محسوس کیا کہ جب سے وہ کھوکھے میں بند ہوا ہے اس کے سانس لینے کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔ ندیم کبھی آنکھیں بند کرتا کبھی کھول کر اندھیرے میں کھوکھے کی چھت کے سوراخوں کو دیکھنے کی کوشش کرتا۔ ان سوراخوں کو وہ اپنی انگلی سے کئی بار چھو چکا تھا۔

اسی جہاز کے درمیانے ڈیک کے ایک کیبن میں شبانہ برتھ پر لیٹی سونے کی کوشش کر رہی تھی عبدل دوسرے کیبن میں گہری نیند سو رہا تھا اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ جہاز رات کی تاریکی میں کالے پانی کے سمندر میں لہروں کو چیرتا ہوا اپنی منزل کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ رات گزر گئی۔ ندیم کا جسم پتھر کی طرح ہو رہا تھا اس کی رات سوتے جاگتے گزری تھی اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ رات گزر گئی ہے اور باہر سمندر پر سورج کی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب اسے بھوک لگی تو سمجھ گیا کہ دوسرا دن طلوع ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے بازوؤں کو دباتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا۔ اب صرف دس بارہ گھنٹوں کا سفر باقی تھا۔ شام کو جہاز کلکتے پہنچنے والا تھا۔ ندیم نے اپنی ٹانگوں پر زور زور سے رگڑ کر مالش کی۔ پھر کچھ بسکٹ ایک ٹوسٹ اور تھوڑے سے خشک میوے کھا کر پانی پیا اور پہلو کے بل لیٹ گیا۔ مگر جلد ہی سیدھا ہو گیا۔

اوپر والے کیبن میں شبانہ عبدل کے ساتھ ناشتہ کر رہی تھی۔ ناشتہ کے بعد وہ ڈیک پر سمندر کی تازہ ہوائیں آ گئی۔ سمندری ہوا میں اس کے بال اڑنے لگے۔ اس نے سر پر ساڑھی کا پلّو کر لیا۔ اور سیاہ سمندر کی وسعتوں کو دیکھنے لگی۔ چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ اور دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر کھلی ہوا میں سمندر کا نظارہ کرنے کے بعد شبانہ نیچے اپنے کیبن میں آ کر لیٹ گئی۔ اس کے ذہن کو ایک بار پھر پریشان خیالوں نے گھیر لیا۔

جہاز اپنے سفر پر رواں دواں تھا۔ دوپہر بھی گزر گئی۔ جب سورج مغربی افق میں سمندر پر چمکنا شروع ہوا تو دور زمین کی لکیر دکھائی دی۔ جہاز کے ملاح ایک دوسرے کو دور سے نظر آتی زمین کی کالی لکیر دکھانے لگے۔ عبدل نے شبانہ کے کیبن میں جا کر کہا کہ اوپر چلو بیٹی، زمین نظر آ گئی ہے۔ ہم کلکتہ پہنچنے والے ہیں۔ شبانہ جلدی سے عبدل کے ساتھ جہاز کے عرشے پر آ گئی۔ زمین کی سیاہ لکیر ایک قوس کی طرح نظر آ رہی تھی۔ شبانہ کو زمین دیکھ کر کوئی خوشی نہ ہوئی۔ وہ دشمن کی سرزمین سے نکل کر دوبارہ دشمن ہی کی سرزمین میں داخل ہو رہی تھی۔ صرف اتنی تسلّی اسے ضرور ہوئی تھی کہ اس کا جہاز خیریت سے ساحل کے قریب پہنچ گیا تھا اور اس میں کوئی دھماکہ نہیں ہوا تھا۔ شبانہ پر ایک بار پھر اضطراری کیفیت طاری ہو گئی۔ عبدل اس کے پاس ہی کھڑا قریب آتے ساحل کی لکیر دیکھ رہا تھا۔ اب آبی پرندے بھی جہاز کے اوپر منڈلانے لگے تھے۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ ساحل دور نہیں۔ شبانہ نے سوچا کہ وہ کلکتہ پہنچ کر ہی عبدل کو اپنے بارے میں بتائے گی۔ سمندری ہوا کے شور میں وہ اطمینان سے بات نہیں کر سکتی تھی۔

ایک گھنٹے بعد ساحل اور قریب آ گیا۔ اب سمندر میں ایک جگہ پر ڈولتے ہوئے غبارے بھی گزرنے لگے جو جہاز کو راستہ دکھا رہے تھے۔ سورج غروب ہوا تو اس کی سرخ روشنی میں کنارے کے درخت صاف نظر آ رہے تھے۔ جہاز اب سمندر سے نکل کر دریائے ہگلی میں داخل ہو چکا تھا۔ پانی کا رنگ گدلا ہو گیا تھا۔ شام کا سرمئی اندھیرا پھیل گیا تھا۔ کلکتے کی بندرگاہ پر روشنیاں...

ہو رہی تھیں کہ جہاز نے بندرگاہ کے قریب پہنچ کر وسل دینی شروع کر دی۔

ندیم نے جہاز کے بھونپوں کی بار بار بلند ہوتی آوازیں سنیں تو سمجھ گیا کہ جہاز گودی پر لگنے والا ہے۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور ہاتھ سے اپنی ٹانگوں اور بازوؤں کی مالش کرنے لگا۔ جہاز گودی کے ساتھ جا کر لگ گیا۔ فوراً لنگر پھینک دیا گیا۔ انجن بند ہوئے تو ندیم کی جان میں جان آئی۔ اب وہ یہ انتظار کرنے لگا کہ کب اس کا کھوکھا دوسرے سامان کے ساتھ جہاز سے باہر نکالا جاتا ہے۔

دوسری طرف عبدل نے شبانہ کو ساتھ لیا اور بندرگاہ سے باہر آ گیا۔ شام ہو چکی تھی۔... بندرگاہ کے باہر ہی اسے رکشہ مل گیا۔ عبدل شبانہ کو لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ڈیڑھ ایک گھنٹے کے بعد جہاز کا سامان باہر نکالا جانے لگا۔

مارواڑی سیٹھ کو انڈیمان کے تاجر کا تار مل گیا تھا اور وہ مال کو وصول کرنے اپنے آدمیوں کے ساتھ بندرگاہ پر موجود تھا۔ مزید دو گھنٹے مال کو کلیئر کروانے میں لگ گئے۔ ندیم کھوکھے کے اندر لیٹا تھا۔ سوراخوں میں سے بندرگاہ کی روشنی کھوکھے میں آ رہی تھی۔ گودی پر اس کا کھوکھا دوسرے کھوکھوں پر رکھا گیا تو اسے دھچکا لگا تھا مگر فوم کے تکیوں نے اسے چوٹ نہیں لگنے دی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے کھوکھے کو ٹرک میں رکھا جا رہا ہے۔ پھر ٹرک کلکتے کی سڑک پر روانہ ہو گیا۔ مارواڑی سیٹھ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ اس کا گودام رپن اسٹریٹ میں تھا۔ سیٹھ نے مال گودام میں جا کر گروا دیا۔ ندیم کو دروازہ بند کرنے کی آواز آئی اور پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ یہ ندیم کی خوش قسمتی تھی کہ اس کا کھوکھا دوسرے کھوکھوں کے نیچے نہیں دبا تھا۔ کُل سات کھوکھے تھے اور ندیم جس کھوکھے میں بند تھا وہ کونے میں دو کھوکھوں کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ جب ندیم کو یقین ہو گیا کہ گودام میں اب کوئی مزدور یا چوکیدار نہیں ہے تو اس نے اپنی ٹانگ کے پاس پڑی ہوئی ہتھوڑی اٹھائی اور اوپر لگے تختے کے کنارے سے لگا کر زور سے دبانا شروع کر دیا۔ پندرہ بیس منٹ کی کوشش کے بعد وہ تختے کو اکھاڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ تختہ دوسری طرف کر کے ندیم نے اپنا آدھا دھڑ اوپر اٹھا لیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی کمر لکڑی کی بن چکی ہے۔ وہ جلدی سے دوبارہ لیٹ گیا۔ پھر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ تازہ اور وافر مقدار میں آکسیجن نے اس کی توانائی کو کافی حد تک بحال کر دیا۔ ایک بار پھر اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اوپر والا دھڑ اوپر اٹھا کر باہر دیکھا۔ یہ ایک اونچی چھت والا چھوٹا سا گودام تھا جس کی چھت سے بلب لگا تھا۔ بلب کی روشنی میں ندیم نے گودام کا جائزہ لیا۔ پھر ٹانگوں کو ہتھیلیوں سے زور زور سے رگڑا اور کھوکھے سے نکل آیا۔ باہر نکلنے سے پہلے اس نے مٹی کے تیل کی بوتل اور ماچس اٹھالی تھی۔ فرش پر کھڑے ہونے سے اس کی ٹانگیں لڑکھڑا سی گئیں۔ ندیم نے دو تین بیٹھکیں نکالیں۔ دورانِ خون نارمل ہو گیا۔ گودام کے دروازے کے پاس جا کر اس نے جھری میں سے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ باہر ایک تنگ سی گلی تھی جہاں ہلکی روشنی ہو رہی تھی یہ کھمبے پر لگے بلب کی روشنی تھی۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ ندیم کو کسی وقت باہر سے کسی موٹر گاڑی اور بگھی کے گزرنے کی آواز آجاتی تھی۔ ندیم وہاں سے نکلنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ گودام میں کوئی روشندان بھی نہیں تھا۔ ندیم نے دروازے کا جائزہ لیا۔ یہ لکڑی کا دروازہ تھا جس کے باہر تالا لگا تھا۔ یہ تالا لوہے کے کنڈے کو پھنسا کر لگایا گیا تھا دروازے کے دونوں کواڑوں کے درمیان ذرا دبانے سے ایک لمبی جھری نمودار ہو گئی۔ اس جھری میں سے وہ کنڈا تھوڑا سا نظر آنے لگا جس میں تالا لگایا گیا تھا۔ اب ندیم گودام میں لوہے کی سلاخ تلاش کرنے لگا۔ گودام میں اس قسم کی چیزیں مل جایا کرتی تھیں۔ اور ندیم کو بھی بہت جلد کونے کے سامان میں سے لوہے کی ایک مضبوط سلاخ مل گئی۔ اس نے سلاخ کو جھری میں زور لگا کر کنڈے میں پھنسا دیا۔ اب اس نے سلاخ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر کو جھٹکا دیا۔ کنڈا اپنی جگہ سے ہل گیا تین چار جھٹکوں کے بعد کنڈا ایک جانب سے اکھڑ کر لٹکنے لگا ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ ندیم کو ایسا محسوس ہوا جیسے بہشت کا دروازہ کھل گیا ہو۔ اس نے کواڑ کو ذرا سا کھول کر گلی میں جھانکا۔ یہ ایک تنگ گلی تھی جہاں بلڈنگوں کے پچھواڑے لگتے تھے اور بلب کی روشنی میں اسے کئی جگہ کچرے کے ڈھیر بھی پڑے دکھائی دیئے۔ یہ کچرا بلڈنگ میں رہنے والوں نے کچن کی کھڑکیوں سے نیچے پھینکا تھا۔ کلکتے میں اس قسم کی گلیاں ضرور رکھی جاتی ہیں اور انھیں کچرا گلی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ کچرا گلیاں تنگ کھولیوں والی عمارتوں کے پچھواڑے کے درمیان بنائی جاتی ہیں۔ کھولیوں اور فلیٹوں میں رہنے والے کچن میں سے کوڑا کرکٹ ان گلیوں میں پھینک دیتے ہیں۔ جہاں صبح و شام کارپوریشنوں کے ٹرک آکر کچرا اٹھا کر

لے جاتے ہیں۔

ندیم نے کیواڑ بند کر دیا۔ اب اسے اپنے کھوکھے کو آگ لگانی تھی تاکہ اس کے فرار کا کوئی ثبوت گودام میں باقی نہ رہے۔ اس نے مٹی کے تیل کو اپنے کھوکھے پر اچھی طرح سے چھڑک دیا۔ پھر ماچس جلائی اور کھوکھے کو دکھا دی۔ مٹی کے تیل نے فوراً آگ پکڑ لی اور کھوکھے میں سے شعلے بلند ہونے لگے۔ اس کے ساتھ ہی ندیم کیواڑ کھول کر گودام سے نکل کر کچرا گلی میں آگیا۔۔۔ نذرل چچا کے دیئے ہوئے دو سو روپے ندیم کی جیب میں پڑے ہوئے تھے۔ کلکتہ شہر کے بازاروں سے ندیم کافی حد تک واقف تھا۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ پولیس ضرور اس کی تلاش میں ہو گی۔ کیونکہ انڈیمان سے یہاں پولیس ہیڈ کوارٹر میں اس کے فرار کی اطلاع پہنچ چکی ہو گی۔ ندیم دھوتی کرتے میں ملبوس تھا۔ یہ لباس نذرل چچا نے اسے دیا تھا۔ گلی سے گزر کر ندیم بازار میں آکر سر جھکائے ایک طرف چلنے لگا۔ بازار میں اِکا دُکا لوگ آجا رہے تھے۔ فلیٹوں اور کھولیوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ دکانیں بند تھیں۔ ندیم سمجھ گیا کہ رات کافی گزر چکی ہے۔ تھوڑی دیر میں وہاں آگ کا شور مچنے والا تھا۔ ندیم تیز تیز قدموں سے بازار میں سے نکل کر ایک دوسرے بازار کی طرف مڑ گیا۔ یہ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ کونسا علاقہ ہے۔ کلکتہ ایک بہت بڑا شہر تھا اور ندیم اس کے سارے علاقوں سے واقف نہیں تھا۔ وہ ایک بڑی سڑک پر آگیا جس کی دونوں جانب اونچی رہائشی عمارتیں تھیں۔ اسے بہت جلدی کسی جگہ پناہ لینے کی ضرورت تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے کہاں پناہ مل سکتی ہے۔ کلکتے میں ایک ہی جگہ تھی جہاں وہ چھپ سکتا تھا اور یہ امجدیہ ہوٹل والے جبار سیٹھ کی بیٹھک ہی ہو سکتی تھی۔ اب اسے ایک رکشہ یا ٹیکسی کی ضرورت تھی جو اسے زکریا اسٹریٹ پہنچا دے۔ ایک خالی ٹیکسی کو ہاتھ دے کر ندیم نے روک لیا۔ دوسرے لمحے ٹیکسی زکریا اسٹریٹ کی طرف جا رہی تھی۔

ندیم زکریا اسٹریٹ کے شروع میں ہی ٹیکسی سے اتر گیا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ بازار میں زیادہ رونق نہیں تھی۔ ندیم کو سیٹھ جبار کی بیٹھک کا پتہ تھا۔ وہ امجدیہ ہوٹل کے پچھواڑے اسی بلڈنگ میں تھی۔ وہ بازار میں سر جھکائے چلتا ہوا ہوٹل کے پچھواڑے سیٹھ کی بیٹھک کے پاس آکر رک گیا۔ بیٹھک کا دروازہ بند تھا اسے معلوم تھا کہ سیٹھ جبار رات دس بجے کے بعد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنی بیٹھک میں آجاتا ہے۔ اس نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ سیٹھ جبار کے بوڑھے بنگالی نوکر نے دروازہ کھول کر ندیم کو غور سے دیکھا وہ اس کی شکل سے شناسا تھا۔ پھر بھی اس نے پوچھا کہ کس سے ملنا ہے۔ ندیم نے سیٹھ کا نام لیا اور نوکر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد سیٹھ جبار خود وہاں آ گیا۔ اس نے ندیم کو جلدی سے اندر آنے کا اشارہ کیا اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ وہ ندیم کو اپنی بیٹھک میں لے گیا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم ابھی تک پاکستان نہیں گئے؟"

بیٹھک میں سوائے ان دونوں کے اور کوئی نہیں تھا۔ ندیم پلنگ کی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور اسے ساری روداد سنا دی۔ سیٹھ جبار سگریٹ سلگائے غور سے سنتا رہا۔ وہ پلنگ پر بیٹھا تھا۔ جب ندیم اپنی کہانی سنا چکا تو سیٹھ جبار سگریٹ کا گل جھاڑتے ہوئے بولا۔

"برخوردار تم کو اب تک پاکستان چلے جانا چاہیئے تھا۔ میں نے تمھارا انتظام بھی کیا مگر تم غائب ہو گئے۔ اب حالات ایسے ہیں کہ اگر چہ جنگ بندی ہو چکی ہے مگر فوجیں سرحدوں پر کھڑی ہیں ڈھاکا جانے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دونوں ملکوں کے سفارت خانے بھی بند ہیں۔ میں تمھارے لیے صرف یہی کر سکتا ہوں کہ تمھیں کچھ دن اپنے پاس چھپائے رکھوں۔ اگرچہ اس میں میرے لیے بہت خطرہ ہے لیکن تم مسلمان ہو اور مصیبت میں پھنسے ہوئے ہو۔ تمھاری مدد کرنا میرا فرض ہے۔ تمھارا یہاں میری بیٹھک میں رہنا مناسب نہیں۔ رات گہری ہو جانے دو۔ میں تمھیں دریا پار ایک جگہ لے چلوں گا۔ وہاں تمھیں اس وقت تک رہنا ہوگا جب تک کہ دونوں ملکوں کی فوجیں سرحدوں سے پیچھے نہیں ہٹ جاتیں تب میں تمھیں اپنے آدمی کے سپرد کر دوں گا جو تمھیں انڈیا کا بارڈر کراس کروا دے گا۔ خبردار اب اپنی چندا کا خیال دل میں مت لانا۔ ورنہ ساری زندگی یہاں کی جیلوں میں سڑتے رہو گے۔ ایسا کرو اوپر والی کوٹھڑی میں جا کر آرام کرو۔ تم نے کھانا کھایا ہے؟"

ندیم نے کہا "کھوکھے میں رکھی ہوئی تھوڑی سی مچھلی شام کو کھائی تھی"۔ سیٹھ جبار نے ندیم کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا "تم نے کمال کر دیا جو ایک لکڑی کے کھوکھے میں بند ہو کر یہاں پہنچے میں تمھاری بہادری کی داد دیتا ہوں تم اوپر چلو۔ میں تمھارے لیے کھانا بھجواتا ہوں۔"

ندیم اوپر والی کوٹھڑی میں آ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں بوڑھا نوکر جو مسلمان بنگالی تھا اور سیٹھ جبار کا خاص آدمی تھا ندیم کے لیے کھانا لے کر آ گیا۔ ساتھ سگریٹ کی ڈبی اور ماچس بھی تھی۔ ندیم نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ پھر سگریٹ سلگا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ پیٹ میں اناج پڑتے ہی اس کا خیال نجمی کی طرف نکل گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ نجمی کے بغیر وہ کیسے بارڈر کراس کر سکتا ہے؟ نہیں نہیں۔ وہ نجمی کو یہاں اکیلا چھوڑ کر کبھی واپس نہیں جائے گا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے کر جائے گا، اب یہی اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ اناج کے خمار سے ندیم کی آنکھیں بار بار بند ہونے لگیں۔ اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں دبایا اور چادر اوپر کر لی۔ اس کے ساتھ ہی وہ گہری نیند میں کھو گیا۔

ادھر شبانہ نے بھی نیک دل بزرگ ملاح عبدل کے آگے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ وہ عبدل کے چھوٹے سے مکان میں چارپائی پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ادھیڑ عمر عبدل اس کے سامنے مونڈھے پر بیٹھا تھا۔ عبدل کی بوڑھی بیوی ابھی انھیں کھانا کھلانے کے بعد برتن لے کر باہر گئی تھی۔ شبانہ کی دردبھری داستان کا عبدل پر بہت اثر ہوا تھا۔ مشرقی پاکستان سے کئی عورتوں کو مکتی باہنی والے اغوا کر کے لے آئے تھے جن میں بعض فرار ہو گئی تھیں اور کچھ نے خودکشی کر لی تھی۔ عبدل نے شبانہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے حوصلہ دیا اور کہا کہ وہ اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھے۔

"بیٹی! تم اگر چاہو تو ساری زندگی اس گھر میں رہ سکتی ہو۔ مجھے اپنا باپ ہی سمجھو۔ میں مسلمان ہوں اور کسی مسلمان بچّی کو مصیبت میں دیکھ کر آنکھیں نہیں پھیر سکتا۔"

شبانہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا کہ وہ پاکستان جانا چاہتی ہے۔ عبدل نے کہا "اگر تمھاری یہی خواہش ہے تو میں تمھیں پاکستان پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ یہی ہو سکتا ہے کہ جس روز میں اپنے کسی دوسرے جہاز پر رنگون جاؤں تو تمھیں بھی ساتھ لیتا چلوں۔ رنگون سے جیسا کہ تم نے مجھے بتایا ہے تم اپنے ملک کے سفارت خانے میں پناہ حاصل کر سکتی ہو۔"

شبانہ بھی یہی چاہتی تھی۔ اس کے ذہن سے ایک بوجھ سا اتر گیا۔ عبدل بولا "اب تم آرام کرو بیٹی۔ کل میں اپنی کمپنی کے دفتر جا کر رپورٹ کروں گا اور یہ بھی معلوم کروں گا اب کس جہاز پر میری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈیوٹی لگنے والی ہے۔ ہماری کمپنی کے جہاز رنگون کے علاوہ جاپان اور افریقہ بھی جاتے ہیں۔"

دوسرے روز عبدل جانے لگا تو اس نے شبانہ کو پیار کیا اور بولا "بیٹی! میں نے اپنی بیوی کو بھی سمجھا دیا ہے۔ تم بھی خیال رکھنا گھر سے باہر مت نکلنا۔ اگر کسی نے پولیس کو خبر کر دی تو وہ لوگ تمھارے ساتھ مجھے بھی ایک پاکستانی کو پناہ دینے کے الزام میں پکڑ لیں گے۔"

عبدل اپنی بیوی کے ساتھ اس مکان میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس کے بچے اپنے اپنے گھروں میں الگ رہتے تھے۔ عبدل اپنی کمپنی کے آفس میں رپورٹ کرنے چل دیا۔ عبدل کی بیوی نے شبانہ کو نئی سوتی ساڑھی پہننے کو دی اور اپنی طرف سے بھی اسے تسلّی دی۔ اس نے بھی شبانہ کی ساری دکھ بھری داستان سن لی تھی۔ وہ بھی عبدل کی طرح ایک نیک اور پارسا بنگالی مسلمان خاتون تھی۔ عبدل کا مکان جھگی ٹولہ بستی کے کونے میں ایک گندے تالاب کے کنارے پر واقع تھا۔ اس بستی میں زیادہ تر ملّاح مچھیرے اور مل مزدور رہتے تھے۔ شبانہ دن بھر مکان کے اندر ہی رہتی۔ جس قسم کی آبادی میں عبدل کا مکان تھا وہاں ایسا ہو نہیں سکتا تھا کہ شبانہ کے بارے میں لوگوں کو پتہ نہ چلتا۔ عبدل کے گھر میں محلّے کی عورتوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اگرچہ شبانہ دن کے وقت زیادہ تر کوٹھڑی میں رہتی لیکن اس کے باوجود محلّے میں یہ خبر پھیل گئی کہ عبدل کے گھر میں ایک نئی لڑکی آگئی ہے۔ خدا جانے وہ اسے کہاں سے لایا ہے۔ جب یہ خبر عبدل تک پہنچی تو اس نے یہی بہتر سمجھا کہ لوگوں کو شبانہ کے بارے میں ایک فرضی کہانی گھڑ کر سنا دی جائے۔ اس نے شبانہ کے بارے میں یہی بتایا کہ وہ اس کے ایک بہاری مسلمان دوست کی بیٹی ہے جو اس کے ساتھ رنگون جا رہا تھا۔ مگر بدقسمتی سے جہاز کے ساتھ ہی سمندر میں ڈوب گیا۔ لوگوں نے عبدل کے بیان پر اعتبار کر لیا اور اب شبانہ مکان کے دالان میں آکر عبدل کی بیوی کا کھانا وغیرہ پکانے میں ہاتھ بھی بٹانے لگی۔ لیکن اس کا ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ اڑتے اڑاتے یہ خبر روپا نامی ہندو بنگالی بدمعاش کے کانوں تک بھی پہنچ گئی جو اس بستی کے قریب ایک کھولی میں جوا کراتا تھا۔ ہم قارئین کی یاد دہانی کے لیے یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ وہی روپا بدمعاش تھا جس نے اپنے ساتھی کالی بدمعاش سے مل کر نجمی کو خضرپور جیٹی والے ہریل سے خریدا تھا۔ نجمی نے ہریل اور اس کی موٹی بیوی کو ہلاک کر کے اپنی انتقام کی آگ سرد کر لی تھی۔ لیکن ابھی روپا اور کالی بدمعاش سے بدلہ لینا باقی تھا۔ روپا بدمعاش نے جب یہ سنا کہ عبدل ملّاح کے مکان پر کوئی بہاری لڑکی آئی ہے جس کا رنگ گورا ہے اور عبدل کہتا ہے کہ اس کا باپ سمندر میں ڈوب گیا تھا......

تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ ڈھاکا اور چٹاگانگ سے کئی لڑکیاں اغوا ہو کر کلکتے لائی گئی تھیں۔ مگر ان کے دام اتنے اونچے تھے کہ روپا اور کالی کوئی لڑکی بھی نہیں خرید سکے تھے۔ روپا نے کالی بدمعاش کو بلا کر کہا "دادا! عبدل کے گھر جو بہاری لڑکی پڑی ہے تمھارا اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔"

کالی بدمعاش بیڑی کا کش لگا کر بولا "دادا! سنا ہے وہ گوری چٹی ہے۔"

روپا بدمعاش کی چھوٹی چھوٹی مکّار آنکھیں سکڑ گئیں۔ سر کھجاتے ہوئے بولا "کالی! کسی کٹنی کو عبدل کے گھر بھیج کر معلوم کرو کہ یہ لڑکی کون ہے۔"

کالی کے پاس بنارس کی ایک چالاک عورت موجود تھی۔ اس عورت کا نام سندری تھا اور عمر پچاس سے اوپر ہو رہی تھی۔ اس کی ساری عمر جرائم پیشہ لوگوں میں گزری تھی۔ بھیس بدلنے میں بھی اسے کمال حاصل تھا۔ وہ بیراگن کا بھیس بدل کر عبدل کے گھر جا پہنچی۔ بنگال کے مسلمان دین اسلام کے ارکان کی اگرچہ سختی سے پابندی کرتے ہیں لیکن ان پر ہندو کلچر کا بھی گہرا اثر ہے۔ عبدل کی بیوی نے بیراگن کو دیکھا تو اس کی آؤ بھگت کی۔ اس کو کھانا کھلایا۔ شبانہ نے سندری بیراگن کے لیے چائے بنائی۔ مکار سندری نے گھور کر شبانہ کو دیکھا اور پھر ہر ہر مہادیوں کا نعرہ لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے مراقبے میں چلی گئی ہو۔ شبانہ اور عبدل کی بیوی ادب سے ایک طرف خاموش بیٹھی تھیں۔ سندری بیراگن نے آنکھیں بند کیے ایک بار پھر اولکھ نرنجن۔ جے کالی ماتا" کا نعرہ لگایا اور آنکھیں کھول دیں۔ پھر شبانہ کو آگے بلا کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا اور کہا "بچی! بھگوان نے تیرے کشٹ دور کر دیئے ہیں تو کالی ماتا کی مرضی سے عبدل کے گھر پہ آئی ہے۔ جا اندر جا کر آرام کر۔"

شبانہ چپکے سے اٹھ کر اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد مکّار بیراگن نے عبدل کی بیوی کی طرف اپنی لال لال آنکھیں گھمائیں اور کہا "مجھے معلوم ہے کہ یہ لڑکی ڈھاکا سے لائی گئی ہے۔ پرنتو میں تیری زبان سے سنوں گی۔ کالی ماتا کی یہی مرضی ہے۔ مجھے بتا دے عبدل اس لڑکی کو کہاں سے لایا ہے پھر کالی میا تمھیں اپنی شرن میں لے لے گی۔"

عبدل کی ادھیڑ عمر بیوی ضعیف الاعتقاد تھی۔ فوراً اس نے عیّار بیراگن کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور اسے شبانہ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

بیراگن سندری مسکرائی۔ بولی "کالی ماتا کی اچھا پوری ہو گئی۔ اب تجھے کوئی چنتا کرنے کی ضرورت نہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھگوان تیری رکھشا کریں گے۔ میرے بارے میں عبدل کو کچھ نہ بتانا۔ میں پھر آؤں گی اور تمھیں کالی میا کی مالا کا پوتر منکا دوں گی۔"

سندری بیراگن جے کالی ماتا کا نعرہ لگا کر وہاں سے چل دی۔ روپا بدمعاش کی جوئے کی بیٹھک میں آتے ہی اس نے کالی اور روپا کو شبانہ کی اصل حقیقت بیان کر دی۔ روپا نے کالی کی طرف دیکھا۔ دونوں ایک عجیب انداز میں مسکرائے۔ روپا نے سندری کو دس روپے انعام دے کر رخصت کر دیا۔ تین دن بعد عیار سندری نے ایک بار پھر بیراگن کا روپ بھرا اور اس وقت عبدل کے مکان پر جا پہنچی جب اسے معلوم تھا کہ عبدل گھر پر نہیں ہوگا۔ عبدل کی بیوی نے بیراگن کو سلام کر کے مونڈھے پر بٹھایا اور شبانہ کو چائے بنانے کے لیے کہا۔

عیار بیراگن نے گدڑی میں سے کالے رنگ کا ایک منکا نکال کر عبدل کی بیوی کو دکھایا اور بولی "کالی ماتا تجھ سے بڑی خوش ہیں۔ اس بے آسرا بچی کو اپنے ہاں رکھ کر تو نے کالی ماتا کا جی موہ لیا ہے۔ اس نے تیرے لیے اپنی مالا کا منکا بھیجا ہے۔ لے۔ تیرے بھاگ کھل جائیں گے۔"

عبدل کی بیوی نے منکا لے کر چوما۔ آنکھوں سے لگایا اور ساڑھی کے پلّو میں باندھ کر رکھ لیا۔ کہنے لگی "میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

بیراگن نے پوچھا "تمھاری بچی کہاں ہے؟"

عبدل کی بیوی نے کہا "وہ اندر کوٹھڑی میں سو رہی ہے۔" بیراگن یہی سننا چاہتی تھی۔ فوراً آنکھیں بند کیں اور بولی "ابھی چائے مت بنانا۔ تیرے لیے کالی ماتا نے ایک حکم دیا ہے۔ اس منکے کو لے کر ابھی تالاب والے میدان میں جا اور وہاں اسے کسی جگہ مٹی میں دبا دے۔ تین دن مٹی میں دبے رہنے کے بعد یہ منکا سونے کا بن جائے گا۔ فوراً جا۔ کالی ماتا اس وقت تجھ پر بڑی مہربان ہے۔" عبدل کی ضعیف الاعتقاد بیوی نے چائے کی کیتلی وہیں رکھی اور مکان سے باہر نکل گئی۔

اسے نکلے بمشکل ایک منٹ ہی گزرا ہوگا کہ روپا اور کالی بدمعاش اندر گھس آئے۔ کالی نے ایک خالی بوری کاندھے پر ڈال رکھی تھی۔

روپا بدمعاش نے آتے ہی بیراگن سے دھیمی آواز میں پوچھا "لڑکی کہاں ہے؟"

بیراگن نے کہا "اندر سو رہی ہے۔"

دونوں بدمعاش کوٹھڑی میں گھس گئے۔ شبانہ بانس کی کھاٹ پر گہری نیند سو رہی تھی۔ روپا نے جیب سے رومال نکال کر اس پر بے ہوشی کی دوائی کے قطرے ڈالے اور شبانہ کی ناک پر رکھ کر اسے ہاتھ سے دبا دیا۔ شبانہ نے ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کی۔ کالی بدمعاش نے اس کے بازوؤں کو پکڑ لیا۔ شبانہ دوسرے سانس پر بے ہوش ہو چکی تھی۔ انھوں نے فوراً شبانہ کو بوری میں بند کیا۔ کالی نے بوری کاندھے پر رکھی اور دونوں تیز تیز قدموں کے ساتھ مکان سے باہر نکل گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کالی بدمعاش نے ناریلوں کی بوری کاندھے پر رکھی ہو۔ بستی کے باہر کالی کی ٹیکسی کھڑی تھی۔ انھوں نے بوری میں بند بے ہوش شبانہ کو کار کی پچھلی سیٹ پر ڈالا۔ روپا بدمعاش اس کے پاس ہی بیٹھ گیا اور کالی کار کو اسٹارٹ کر کے وہاں سے نکال کر لے گیا۔ ان کے جانے کے فوراً بعد عیار بیراگن بھی عبدل کے مکان سے چل دی تھی۔ جب عبدل کی بیوی منکا میدان میں دبا کر واپس آئی تو دیکھا کہ بیراگن غائب ہے۔ ادھر ادھر دیکھا۔ جب وہ کہیں نظر نہ آئی تو شبانہ کی کوٹھڑی میں گئی۔ یہ دیکھ کر اس کا سانس اوپر کا اوپر رہ گیا کہ شبانہ بھی غائب ہے۔ سر کو پکڑ کے وہیں بیٹھ گئی۔ دوپہر کے بعد عبدل آ گیا۔ اسے شبانہ کی گمشدگی کا علم ہوا تو پریشان ہو کر اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ سارا علاقہ چھان مارا مگر شبانہ کا کچھ پتہ نہ چلا۔ مایوس ہو کر اپنے مکان پر واپس آ گیا۔

اس وقت شبانہ روپا بدمعاش کی ایک خفیہ کمین گاہ میں چارپائی پر بے ہوش پڑی تھی۔ کمین گاہ دریا پار ایک ویران جنگل میں واقع تھی۔ یہاں روپا بدمعاش منشیات کا اسٹاک چھپا کر رکھتا تھا۔ شبانہ کو جس وقت ہوش آیا تو اس نے ایک تنگ سی کوٹھڑی میں اپنے آپ کو پایا۔ چھت میں بانس پڑے تھے کونے میں ٹین کے پیپے رکھے ہوئے تھے۔ کونے میں ایک اسٹول تھا جس پر رکھی ہوئی لالٹین جل رہی تھی۔ شبانہ کی گردن دکھ رہی تھی اور سر جیسے پتھر ہو گیا تھا۔ اسے باہر دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ شبانہ نے بڑی مشکل سے گردن ہلا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ روپا اور کالی بدمعاش اندر داخل ہوئے۔ روپا بدمعاش آگے تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کیمرہ تھا جس پر فلیش لگی ہوئی تھی اس نے آتے ہی شبانہ کو بنگلہ میں گالی دی اور کالی سے کہا "مارے اسے اٹھا کر بٹھا۔"

کالی نے شبانہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے چارپائی پر بٹھا دیا۔ شبانہ کا رنگ اڑ گیا تھا اور دل خوف کے مارے بیٹھا جا رہا تھا۔ کالی بدمعاش نے شبانہ کی گردن میں ہاتھ ڈال دیا۔ شبانہ کے جسم میں اتنی طاقت ہی نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہی تھی کہ وہ کالی بدمعاش کو پرے ہٹا سکتی۔ روپا بدمعاش نے اوپر تلے شبانہ کی تین تصویریں کھینچ لیں۔ پھر کیمرے سے فلیش گن اتارتے ہوئے بولا "لٹا دے اس کو کالی۔"

کالی نے شبانہ کو چارپائی پر لٹا دیا۔ دونوں باہر نکل گئے۔ شبانہ سمجھ گئی کہ اسے عبدل کے گھر سے اغوا کر لیا گیا ہے اور یہ وہ بدمعاش لوگ ہیں جو اسے بیہوش کرنے کے بعد یہاں لے آئے ہیں۔

کچھ دیر بعد شبانہ کے جسم کی توانائی کچھ بحال ہوئی تو اس نے اٹھ کر دروازے کی جھریوں میں سے باہر جھانکا۔ یہ رات کا وقت تھا۔ باہر کوئی روشنی نہیں تھی۔ اندھیرا تھا۔ کوٹھڑی کے آگے لکڑی کا چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ اس برآمدے کی سیڑھیوں کے پاس اسے ایک آدمی بیٹھا نظر آیا۔ یہ پہرہ دار ہی ہو سکتا تھا۔ شبانہ چارپائی پر واپس آ کر بیٹھ گئی اس کے ساتھ جو سلوک ہونے والا تھا اس کا وہ بخوبی اندازہ لگا سکتی تھی۔ اس کی عافیت اسی میں تھی کہ جس طرح سے بھی ممکن ہو وہ وہاں سے نکل بھاگے۔ وہ اٹھ کر دوبارہ دروازے کے پاس گئی۔ یہ لکڑی کا دروازہ تھا اور باہر سے تالا لگا تھا۔ برآمدے میں بیٹھا ہوا آدمی اب سگریٹ پی رہا تھا۔ اندھیرے میں جب وہ کش لگاتا تو سگریٹ کا گل سرخ ہو کر چمک اٹھتا۔ یہ آدمی اسے وہاں سے بھاگنے نہیں دے گا۔ یقیناً اس کے پاس اسلحہ بھی ہوگا۔ یہ لوگ جرائم پیشہ ہیں اور کسی کو قتل کر دینا ان کے لیے معمولی بات ہے۔ شبانہ کے ذہن میں اسی قسم کے خیالات گردش کر رہے تھے وہ چارپائی پر سر تھام کر بیٹھ گئی۔ اس نے سر اٹھا کر کوٹھڑی کی دیواروں کو دیکھا دیواریں پتھر کی بنی ہوئی تھیں۔ کوئی روشندان تک نہیں رکھا گیا تھا۔ چھت میں کڑیوں کی جگہ موٹے موٹے بانس ڈالے گئے تھے۔ فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ شبانہ نے ساری رات اسی پریشانی کے عالم میں کاٹ دی۔

دن کی روشنی دروازے کی جھریوں میں سے کوٹھڑی میں آنے لگی۔ شبانہ کا حلق خشک ہو رہا تھا اسے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ باہر سے تالا کھولنے کی آواز آئی۔ شبانہ چارپائی پر لیٹ گئی۔ ایک بھاری بدن کی عورت ایک اسلحہ بردار مرد کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ شبانہ نے اسے فوراً پہچان لیا۔ یہ وہی مکار عورت تھی جو بیراگن کے روپ میں عبدل کے گھر آئی تھی۔ یہ عیار عورت سندری تھی، سندری نے آگے بڑھ کر شبانہ کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے اٹھا کر بٹھا دیا۔ اور بولی "چل ری۔ باہر تالاب پر چل کر نہا لے۔" شبانہ چپکے سے اٹھ کر سندری کے ساتھ باہر آ گئی۔ صبح

روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ درختوں پر پرندے بول رہے تھے۔ دور سے ریل کے انجن کی سیٹی کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ سندری شبانہ کو لیے آگے آگے چل رہی تھی۔ رائفل والا آدمی پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ سندری نے شبانہ کو تالاب کے پاس لے جا کر کہا "یہاں منہ ہاتھ دھو لے بھاگنے کی کوشش نہ کرنا نہیں تو ہمارا آدمی گولی مار دے گا۔"

شبانہ پر دہشت طاری تھی۔ آنکھوں میں آنسو بھی نہیں آ رہے تھے۔ جب وہ منہ ہاتھ دھونے سے فارغ ہوئی تو سندری نے اسے ساتھ لیا اور جھونپڑی میں آ گئی۔ شبانہ کو تھوڑے سے چاول اور آلوؤں کی ترکاری کھانے کو دی گئی جسے شبانہ نے زہر مار کیا۔ اس نے سندری سے پوچھا "تم لوگ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟"

سندری نے شبانہ کو گھور کر دیکھا اور بولی "تمھیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ اب چپکے سے لیٹ جا" دروازہ بند کر کے باہر تالا لگا دیا گیا۔ شبانہ کوٹھڑی میں اکیلی رہ گئی۔ بہت جلد اسے احساس ہو گیا کہ وہ ایک کمزور عورت ہے اور ان جرائم پیشہ لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مکار سندری چوبیس گھنٹے اس کی نگرانی کرتی تھی۔ دو اسلحہ بردار غنڈے کوٹھڑی کے آس پاس منڈلاتے رہتے تھے۔ شبانہ کو وہاں قید میں پڑے تین دن گزر گئے۔ چوتھے روز شام کے وقت باہر ایک جیپ آ کر درختوں میں رک گئی اس میں روپا اور کالی بدمعاش کے ساتھ دو نئے آدمی بھی سوار تھے۔ روپا بدمعاش ان میں سے ایک آدمی کو جسے وہ دادا بھائی کے نام سے پکار رہا تھا اپنے ساتھ لے کر شبانہ کی کوٹھڑی میں آ گیا۔ اس روز سندری نے اپنے ہاتھ سے شبانہ کے بالوں میں کنگھی کی تھی اور اسے نئی ساڑھی بھی پہنائی تھی۔ شبانہ کو دوسرے ایجنٹ کے ہاتھ فروخت کیا جا رہا تھا۔ دادا بھائی نے جھک کر غور سے شبانہ کو دیکھا پھر روپا بدمعاش کو لے کر باہر چلا گیا۔ سات ہزار میں سودا طے ہو گیا۔ دادا بھائی نے روپا بدمعاش کو سات ہزار روپے اسی وقت ادا کر دیئے اور کہا "لڑکی کو میرے اڈے پر پہنچانا اب تیرا کام ہے۔"

روپا بدمعاش نوٹوں کو جیب میں ٹھونستے ہوئے بولا "اس کی تم فکر نہ کرو دادا بھائی۔ مال ایک گھنٹے میں تیرے اڈے پر پہنچ جائے گا۔"

دادا بھائی اپنے ساتھی کے ہمراہ جیپ میں بیٹھ کر چلا گیا۔ روپا بدمعاش نے کالی بدمعاش کو ساتھ لیا اور شبانہ کی کوٹھڑی کی طرف بڑھا۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اندھیری کوٹھری میں صرف ایک موم بتی جل رہی تھی۔

اس کی دھیمی روشنی میں شبانہ بانس کی چارپائی پر سر جھکائے بیٹھی اپنی بدقسمتی پر آنسو بہا رہی تھی کہ روپا اور کالی بدمعاش اندر داخل ہوئے۔ سندری ان دونوں کو دیکھ کر باہر نکل گئی۔ شبانہ نے سہمی ہوئی نظروں سے ان جرائم پیشہ ہندو بنگالیوں کو دیکھا اور پہلی بار ہاتھ جوڑ کر التجا کی کہ وہ اس پر رحم کریں۔

روپا اور کالی بدمعاش وہاں شبانہ پر رحم کرنے نہیں بلکہ اسے وہاں سے لے جانے اور دادا بھائی کے پاس فروخت کرنے کے لیے آئے تھے۔ ان پر شبانہ کی التجاؤں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ کالی بدمعاش بیڑی کا کش لگانے کے بعد شبانہ کے پاس بیٹھ گیا اور بڑے نرم لہجے میں بولا۔

"ہم تو خود تمھیں یہاں سے نکال کر تمھارے ملک پاکستان پہنچانا چاہتے ہیں مگر کیا کریں مجبور ہیں۔ سرحدوں پر دونوں ملکوں کی فوجیں کھڑی ہیں۔"

روپا بدمعاش اسٹول پر بیٹھ گیا، صافے سے منہ پر آیا ہوا پسینہ پونچھا اور کہنے لگا۔

"ابھی ہم تمھیں اپنے ایک دوست کے ہاں لے جا رہے ہیں وہاں تمھیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ دو ایک روز وہاں رہنا۔ پھر ہم تمھیں پاکستان پہنچا دیں گے۔ چلو آؤ ہمارے ساتھ۔"

شبانہ پڑھی لکھی لڑکی تھی اگرچہ پے در پے مصیبتوں نے اس کے ذہن کو ماؤف کر دیا تھا لیکن وہ خوب سمجھتی تھی کہ یہ دونوں جرائم پیشہ بدمعاش اسے کہاں اور کیوں لے جا رہے ہیں۔ لیکن اس کے پاس کوئی چارہ کار نہیں تھا وہ مجبور تھی۔ ان دونوں بدمعاشوں کے سامنے بے بس تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کیا تو وہ تشدد پر اتر آئیں گے

شبانہ نے دل میں سوچ لیا تھا کہ وہ ان کو اپنے اوپر تشدد کرنے کا موقع نہیں دے گی جیسے وہ کہیں گے ویسے ہی کرے گی اور جونہی اسے کوئی موقع ملا وہ ان کے چنگل سے نکل کر فرار ہو جائے گی۔ چنانچہ وہ خاموشی سے اٹھی اور ان کے ساتھ کوٹھری سے باہر آ گئی۔

رات گہری ہو رہی تھی۔ روپا بدمعاش اور کالی بدمعاش نے سندری سے کہا "ہم دادا بھائی کے پاس جا رہے ہیں تم اڈے کا خیال رکھنا۔"

دونوں بدمعاش شبانہ کو لے کر راتوں رات دادا بھائی کے خفیہ ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ یہ جگہ کلکتہ شہر کے جنوب مغرب میں ایک ویران مقام پر تھی اور اس کے چاروں طرف تاریکی میں دور بندرگاہ کے مال گوداموں کی بلند چھتیں پہاڑیوں کی طرح ابھری ہوئی تھیں۔ دادا بھائی بھی ایک ہندو بنگالی تھا وہ بردہ فروشوں کا ایجنٹ تھا اور اس سے پہلے کئی عورتوں کو فروخت کر چکا تھا۔ اس نے شبانہ کو ایک کوٹھری میں بند کر دیا اور روپا اور کالی کو طے شدہ رقم ادا کر دی۔ دونوں بدمعاش شبانہ کو دادا بھائی کے حوالے کر کے چلے گئے۔

دادا بھائی کا یہ خفیہ اڈا ایک چھوٹے سے کوارٹر نما جھونپڑے کی شکل میں تھا۔ دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کوئی مزدور رہ رہا ہے۔ آس پاس کوئی دوسرا کوارٹر بھی نہیں تھا۔ دادا بھائی بڑا تجربہ کار اور کائیاں بردہ فروش تھا۔ اسے یہ کام کرتے ایک عمر ہو گئی تھی۔ وہ اپنا مال اکثر آندھرا پردیش میں جا کر فروخت کرتا تھا۔ وہاں اسے اپنے مال کی زیادہ قیمت ملتی تھی۔ اپنے کوارٹر پر اس نے کسی بھی خریدی ہوئی لڑکی کو رات بھر نہیں رکھا تھا۔ چنانچہ دادا بھائی نے شبانہ کے آنے سے پہلے ہی وہاں سے آندھرا پردیش کی طرف کوچ کر جانے کا پورا انتظام کر رکھا تھا۔

ایک بند جیپ کوارٹر سے تھوڑی دور تاڑ کے درختوں میں تیار کھڑی تھی۔ دکن ایکسپریس نئے ٹائم ٹیبل کے مطابق ہاوڑا اسٹیشن سے صبح کے چار بج کر دس منٹ پر روانہ ہوتی تھی۔ اس ٹرین کے ایک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں چار نشستوں والا ایک کوپے پہلے سے بک تھا۔ دادا بھائی کے ساتھ اس کے دو بااعتماد اور خونخوار قسم کے غنڈے بھی جا رہے تھے۔

دادا بھائی شبانہ کی کوٹھری میں آ گیا اس کے ہاتھ میں پستول تھا اس نے آتے ہی پستول کا رخ شبانہ کی طرف کیا اور اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں نے تمھیں بیس ہزار کے عوض خریدا ہے اور صبح کی گاڑی سے تمھیں ایک دوسرے شہر لے جا رہا ہوں جہاں تمھیں میرے چھوٹے بھائی کے پاس رہنا ہوگا میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میرے ساتھ میرے دو باڈی گارڈ بھی جا رہے ہیں جو کئی خون کر چکے ہیں، ان کے لیے اور میرے لیے بھی کسی کو گولی مار کر ہلاک کر دینا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اگر تم اپنا منہ بند رکھو گی اور آرام سے ہمارے ساتھ سفر کرو گی تو ہم تمھیں کچھ نہیں کہیں گے۔ لیکن اگر تم نے شور مچانے کی ذرا بھی کوشش کی ہمارے ساتھ جو ہوگا وہ ہم بعد میں دیکھ لیں گے۔ لیکن تمھیں اسی وقت گولی مار دیں گے۔ تم سمجھ دار عورت ہو میری بات اچھی طرح سمجھ گئی ہو گی۔ اب تم آرام کرو میرے آدمی باہر پہرہ دے رہے ہیں۔ صبح ساڑھے تین بجے تمھیں اٹھا دیا جائے گا۔"

دادا بھائی پستول اپنی صدری کی جیب میں ڈال کر کوٹھری سے نکل گیا اس کے جانے کے بعد شب۔ ۔پنا چہرہ ہاتھوں میں رکھ کر رونے لگی۔ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ جانے رات کا کیا بجا ہوگا کہ اسے نیند آ گئی اور وہ سو گئی۔ صبح ٹھیک ساڑھے تین بجے اسے جگا دیا گیا۔ اسے ایک قیمتی ریشمی ساڑھی پہننے کو دی گئی۔ دادا بھائی اور اس کے غنڈوں نے بھی شریفانہ لباس پہن لیا تھا۔ شبانہ کو دادا بھائی نے ایک بار پھر سمجھا دیا کہ وہ راستے میں شور مچانے کی ہرگز کوشش نہ کرے۔ شبانہ کو جیپ میں پیچھے دادا بھائی نے اپنے پاس بٹھا لیا پستول اس نے شبانہ کی پسلیوں کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ جیپ رات کے پچھلے پہر کی نیلگوں فضا میں کلکتے کی ویران سڑکوں پر ہوڑہ ریلوے اسٹیشن کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ اسٹیشن پر پہنچ کر دادا بھائی نے پستول ہاتھ میں لے کر اس پر صافہ ڈال دیا تھا اور پستول کی نالی شبانہ کے جسم کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ وہ اسی طرح اسے چلاتا بظاہر مسکرا مسکرا کر باتیں کرتا اس پلیٹ فارم پر آ گیا جہاں دکن ایکسپریس تیار کھڑی تھی۔

دونوں غنڈے شریفانہ لباس میں ملبوس ایک ایک بھرا ہوا پستول جیبوں میں ڈالے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ وہ شبانہ کے بالکل ساتھ لگے ہوئے تھے۔ ٹرین کے فرسٹ کلاس کوپے میں ان کی سیٹیں ریزرو تھیں۔ ڈبے میں داخل ہوتے ہی دادا بھائی نے شبانہ کو کونے میں بٹھایا پستول اس کی پسلیوں کے ساتھ لگا کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کوپے فرسٹ کلاس کا تھا جو کہ ریزرو تھا۔ کوئی دوسرا شخص اندر نہیں آ سکتا تھا۔ کھڑکیوں پر شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ یہ ہلکے نسواری رنگ کے

ایسے شیشے تھے کہ باہر سے دیکھو تو اندر کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک غنڈہ باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آ گیا۔ ٹرین ٹھیک وقت پر چل پڑی۔ ناشتہ دان یہ لوگ ساتھ لائے تھے۔ شبانہ خاموش بیٹھی حیرت زدہ آنکھیں کھولے کھڑکی کے شیشے میں سے باہر دیکھ رہی تھی۔ باہر کی روشنیاں ہلکے نسواری شیشے میں سے دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھیں۔ شبانہ نے دل میں طے کر لیا تھا کہ چاہے اس کی جان کیوں نہ چلی جائے وہ معمولی سا موقع ملنے پر بھی ان لوگوں کے چنگل سے بھاگ جائے گی ٹرین سارا دن چلتی رہی۔ شبانہ کسی اسٹیشن پر بھی باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دو غنڈے ہر وقت پستول لیے اس کے سر پر موجود رہتے تھے۔ دن کی روشنی میں بھی کھڑکی کے شیشے چڑھے رہتے۔ ان شیشوں میں سے باہر کا منظر دھوپ میں بھی صاف نظر نہیں آتا تھا۔ کمپارٹمنٹ ائر کنڈیشنڈ تھا۔ دادا بھائی بھی ہر وقت چوکس رہتا کسی اسٹیشن پر ٹرین رکتی تو دادا بھائی پستول نکال کر شبانہ کے قریب ہو بیٹھتا اور اس کے خونی غنڈے ڈبے کے باہر نکل کر کھڑے ہو جاتے۔ دن گزر گیا۔ شام کا اندھیرا چھانے لگا۔ پھر رات ہو گئی۔ شبانہ نے حیدر آباد دکن کے بارے میں صرف کتابوں میں ہی پڑھا تھا۔ اسے امید تھی کہ یہاں مسلمانوں کی آبادی کافی زیادہ ہے اور اسے کسی نہ کسی مسلمان خاندان میں پناہ مل جائے گی۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ کہاں اور کیسے ان غنڈوں سے چھٹکارا حاصل کرے۔ وہ مسلسل کسی موقع کی تلاش میں تھی لیکن یہ خونخوار درندے اسے ایک پل کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے کہ ٹرین کی رفتار ہلکی ہونے لگی۔ دادا بھائی نے اپنے آدمی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "کونسا اسٹیشن آ رہا ہے۔؟"

اس غنڈے نے کہا۔

"اورنگ آباد کا اسٹیشن آ رہا ہے دادا بھائی مگر وہ تو ابھی پندرہ منٹ کے بعد آئے گا ٹرین کیوں آہستہ ہو گئی۔"

دوسرے غنڈے نے بیڑی سلگاتے ہوئے کہا۔

"لائن کی مرمت ہو رہی ہو گی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دادا بھائی نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"تھوڑی دیر آرام کر لوں۔ ہمیں تو اورنگ آباد سے بھی آگے جانا ہے۔ تم دونوں خبردار رہنا۔"
اور دادا بھائی اپنی سیٹ پر چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ شبانہ کو بہت جلد اس کے خراٹوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ کونے میں اپنی نشست پر لیٹی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ سو رہی ہے۔ دونوں غنڈوں کو بھی نیند آ رہی تھی مگر وہ جاگتے رہنے پر مجبور تھے۔ کمپارٹمنٹ میں صرف ایک بلب کی روشنی تھی۔ شبانہ نے تھوڑی سی آنکھ کھول کر دیکھا دونوں غنڈے دوسرے دروازے والی سیٹ پر نیم دراز تھے۔ ٹرین کی رفتار اس طرح ہلکی تھی۔ دو منٹ بعد شبانہ نے دیکھا کہ دونوں غنڈوں کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ اونگھ رہے تھے۔ اس سے بہتر موقع اس ماحول میں شبانہ کو نہیں مل سکتا تھا۔ وہ آہستہ سے اپنی نشست سے اٹھی اور دبے پاؤں ٹائیلٹ کی طرف مڑی۔ اس نے ایک منصوبہ فوراً ذہن میں تیار کر لیا تھا۔ اگر دونوں میں سے کوئی جاگ پڑا تو وہ کہہ دے گی کہ ٹائیلٹ جا رہی ہوں۔ اس میں کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ شبانہ کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ٹائیلٹ کے دروازے کے پاس آ گئی مگر دونوں غنڈوں میں سے کسی کو خبر نہ ہوئی۔ ان کی گردنیں سینوں پر لٹکی ہوئی تھیں اور ٹرین کی کھٹا کھٹ کی تال پر آہستہ آہستہ جھول رہی تھیں۔ کمپارٹمنٹ کا دوسرا دروازہ ٹائیلٹ کے دروازے کے ساتھ ہی تھا۔ ٹرین کی رفتار اتنی ہلکی تھی کہ شبانہ نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر وہ دروازے میں سے باہر چھلانگ لگا دے تو اسے زیادہ چوٹیں نہیں آئیں گی۔ ٹائیلٹ کے پاس پہنچ کر شبانہ نے تجسس آمیز نگاہوں سے ایک نگاہ بائیں جانب ڈالی دادا بھائی چادر اوڑھے سو رہا تھا۔ دونوں غنڈے بھی گردنیں جھکائے سو رہے تھے۔ وہ پچھلی رات کے بھی جاگے ہوئے تھے۔ اور اب جو اونگھ آئی تو نیند کی آغوش میں چلے گئے تھے۔ یہ شبانہ کی خوش قسمتی تھی۔ قدرت نے اسے فرار ہونے کا سنہری موقع فراہم کر دیا تھا۔ شبانہ نے ٹائیلٹ کے دروازے کی بجائے کمپارٹمنٹ کا دروازہ آہستہ سے کھول دیا۔ ٹرین کی کھٹا کھٹ کے شور میں دروازہ کھلنے کی آواز دب کر رہ گئی۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اندر آیا۔ باہر اندھیرا تھا۔ شبانہ کے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے اللہ کا نام لیا اور باہر اندھیرے میں کود گئی۔ کودنے سے پہلے اس نے اپنے جسم کو سمیٹ لیا تھا اور دل میں خدا سے دعا کی تھی کہ وہ پتھروں کی بجائے جھاڑیوں میں گرے

خدا نے اس کی دعا قبول کر لی تھی اور وہ جھاڑیوں میں ہی گری۔ جھاڑیوں میں گرتے ہی وہ نیچے کی جانب لڑھکتی چلی گئی۔ یہاں کافی نشیب تھا۔ شبانہ نے اپنے آپ کو گیند کی طرح کر لیا تھا۔ وہ لڑھکتی ہوئی ایک کھیت کی مینڈا نے جا لگی۔ اس نے وہیں پڑے پڑے بغیر اپنے جسم کو ہاتھ لگائے اپنے بدن کا جائزہ لیا۔ خوش قسمتی سے جھاڑیوں میں گرنے اور ٹرین کی رفتار سست ہونے کی وجہ سے اسے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ صرف ساڑھی کئی جگہوں سے پھٹ گئی تھی اور بازوؤں پر کچھ خراشیں آ گئی تھیں۔ شبانہ کو اپنی جگہ سے اٹھنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا اس نے سر اٹھا کر ٹرین کی طرف دیکھا۔ ٹرین کھٹا کھٹ کرتی ہلکی رفتار کے ساتھ کسی قدر اونچائی پر سے آگے گزر گئی تھی اور اس کے آخری ڈبے کی سرخ بتی رات کے اندھیرے میں جگنو کی طرح چمکتی دور ہوتی جا رہی تھی۔ شبانہ کو اس مصیبت کا شدت سے احساس تھا کہ اگر ٹرین میں غنڈے جاگ پڑے اور اسے وہاں نہ پایا تو وہ بھی ٹرین سے چھلانگ لگا کر اس کی تلاش میں ادھر آ جائیں گے وہ جلدی سے اٹھی اور وہاں سے نکل جانے کے لیے کھیتوں کے پار جو روشنی نظر آ رہی تھی اس طرف چلنے لگی۔ اس نے ساڑھی کو جسم کے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا تھا اور تیز تیز قدموں سے چلتی کھیتوں کے درمیان والی پگڈنڈی پر آ گئی۔ اتنا اس نے سن لیا تھا کہ دکن کا شہر اورنگ آباد وہاں سے ٹرین کے ذریعے پندرہ منٹ کی مسافت پر ہے۔ اورنگ آباد کا اس نے نام سن رکھا تھا۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ اس پاس گھپ اندھیرا تھا۔ دور اسے شہر کی روشنیاں جگنوؤں کی طرح جھلملاتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ اس طرف چلنے لگی۔

کھیتوں سے نکل کر اس نے ایک غیر ہموار پتھریلا میدان عبور کیا اور کچے راستے پر آ گئی۔ ایک بار پھر اس نے ٹرین کی سرخ بتی کو دیکھا وہ اب کافی دور جا چکی تھی اور پھر شاید کوئی موڑ گھومنے کے بعد شبانہ کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ شبانہ ایک جگہ پتھر کے پیچھے بیٹھ کر عقب میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکنے لگی۔ وہ تسلی کرنا چاہتی تھی کہ اس کے تعاقب میں دادا بھائی اور اس کے غنڈے تو نہیں آ رہے۔ ستاروں کی دھندلی پھیکی روشنی میں اب وہ اندھیرے میں بھی دیکھ سکتی تھی۔ کھیتوں میں اسے جب کوئی انسانی سایہ اپنی طرف آتا یا حرکت کرتا نظر نہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آیا تو وہ اٹھی اور شہر کی روشنیوں کی طرف چل پڑی۔ پہلے اسے خیال آیا کہ وہ شہر میں کسی پولیس اسٹیشن جا کر پناہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ پھر اس نے سوچا کہ پولیس تو بھارت کی ہے اور ہندو ہو گی۔ پھر اس کے پاس بھارت کی شہریت بھی نہیں ہے۔ پاکستان کا ویزا یا پاسپورٹ بھی نہیں ہے۔ یقینی بات تھی کہ ہندو پولیس اسے فوراً گرفتار کر لے گی اور اس کے ساتھ تشدد کا سلوک کیا جائے گا۔

یہاں کوئی اس کی مدد کرنے والا نہیں ہے وہ کسی سے مدد حاصل نہ کر سکے گی۔ اس نے سوچا کہ یہ دور تک آباد شہر کی روشنیاں ہیں۔ یہاں مسلمانوں کے بہت سے گھر ہوں گے۔ وہ ان میں سے کسی گھر میں پناہ حاصل کرے گی۔ یہی کچھ سوچتی ہوئی شبانہ شہر کی روشنیوں کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی زمین پتھریلی تھی۔ اس کے پاؤں میں چپل تھی جس کا ایک فیتہ ٹوٹ گیا تھا اور اسے چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ پھر بھی وہ چلتی چلی گئی۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ وہ دادا بھائی اور اس کے جرائم پیشہ غنڈوں کی قید سے نکل آئی ہے۔ شہر کی روشنیاں اب ایک ٹیلے کی اوٹ میں آ گئی تھیں۔ ٹیلے پر تاڑ کے درختوں کی چھتریاں ستاروں بھرے آسمان کے پس منظر میں سیاہ دکھائی دے رہی تھیں۔ ٹیلے پر تاڑ کے درختوں کی قطار دوسری طرف نشیب میں جا کر غائب ہو جاتی تھیں۔ شبانہ ٹیلے کی دائیں جانب آ گئی۔ یہاں اندھیرے میں اس نے ایک چھوٹے سے غیر ہموار میدان کو دیکھا جس کے بیچ میں ایک نالہ بہہ رہا تھا۔ نالے پر پل بنا ہوا تھا۔ پل اندھیرے میں خالی تھا۔ وہ پل عبور کر گئی دوسری جانب تھوڑی نشیبی جگہ تھی۔ یہاں سے آگے دائیں جانب شہر کی روشنیاں پھر نظر آنے لگیں۔ وہ پل سے تھوڑی دور ہی پہنچی تھی کہ اسے کسی انسان کے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ شبانہ کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے دادا بھائی اور اس کے غنڈوں کا خیال آ گیا۔ اس نے گھبرا کر جدھر سے آواز آئی تھی ادھر دیکھا۔ اندھیرے میں اُسے کچھ نظر نہ آیا۔ انسانی قدموں کی آواز بائیں جانب آگے بڑھ رہی تھی۔

شبانہ وہیں ایک چھوٹی سی جھاڑی کی اوٹ میں دبک کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھ آواز پر لگی ہوئی تھیں۔ پھر اسے اندھیرے میں ایک انسانی سایہ نظر آیا جو دوڑتا ہوا اس سے بیس قدم کے فاصلے پر سے گزر گیا۔ اس کے پیچھے ایک اور انسانی سایہ دوڑتا ہوا نکل گیا۔ شبانہ کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ یہ دادا بھائی کے غنڈوں کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ انھیں اس کے فرار

کا علم ہو گیا تھا اور وہ اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ وہاں بیٹھے رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ جب دوڑتے قدموں کی آواز اس طرف جا کر غائب ہو گئی جس طرف شہر کی روشنیاں تھیں تو شبانہ اٹھی اور تقریباً دوڑ کر غیر ہموار میدان عبور کر گئی۔ اب اس کے سامنے ایک چار فٹ اونچی پتھر کی دیوار تھی جو نیم دائرے کی شکل میں آگے جا کر دائیں جانب مڑ گئی تھی دیوار کی دوسری طرف گھپ اندھیرا تھا۔ شبانہ کو اور کچھ نہ سوجھا تو دیوار کی دوسری طرف کود گئی۔ دوسری طرف کودتے ہی ایک بلی غراتی ہوئی بھاگ اٹھی۔ شبانہ کا دل خوف کے مارے اچھل کر جیسے اس کے حلق کے قریب آ گیا۔ وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی کہ کونسی جگہ ہے۔ کیا کسی بنگلے کا لان ہے یا کوئی باغ ہے۔ یہاں کہیں کہیں درخت اندھیرے میں بھوتوں کی مانند کھڑے تھے اس نے اندھیرے میں غور سے دیکھا تو اس کے بدن پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔ اس کے سامنے ابھری ہوئی قبریں اور ان پر لگے کتبے ادھر اُدھر پھیلے تھے۔ وہ کسی قبرستان میں آ گئی تھی۔

یہ جگہ اسے انسانی بستی سے زیادہ محفوظ معلوم ہوئی یہاں اسے صبح تک کوئی پریشان نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح رات گزار دے۔ پھر جب صبح کی روشنی پھوٹے گی تو وہ شہر کی طرف چل دے گی۔ اور کسی مسلمان کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹائے گی کوئی نہ کوئی ضرور اسے پناہ دے گا۔ وہ کسی کو نہیں بتائے گی کہ وہ مشرقی پاکستان سے اغوا کر کے یہاں بھارت میں لائی گئی تھی۔ شبانہ نے جھک کر غور سے دیکھا۔ وہ ایک ایسی قبر کے کنارے بیٹھی تھی جس میں گہرا شگاف اندھیرے میں منہ پھاڑے جیسے اسے تک رہا تھا۔ اس شگاف میں سے بلی اس کے کودنے کے بعد بوکھلا کر غراتی ہوئی بھاگ اٹھی تھی۔ شبانہ کو قبر کے شگاف سے خوف آنے لگا۔ وہ اٹھی اور قبروں کے درمیان درختوں کی طرف چلنے لگی۔ اندھیرے میں اسے درختوں کے نیچے ایک جھونپڑی نظر آئی۔ جھونپڑی پر موت کی خاموشی اور تاریکی چھائی تھی۔ شبانہ قبروں کے درمیان سے گزرنے کی کوشش کرتے ہوئے جھونپڑی کے قریب پہنچی ہی تھی کہ ایک جانب سے انسانی آواز بلند ہوئی۔

"ارے وہ یہیں کہیں ہو گی۔"

شبانہ نے دادا بھائی کی آواز پہچان لی تھی۔ اس کا بدن دہشت کے مارے سن ہو گیا۔ دادا بھائی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے غنڈوں کے ساتھ قبرستان میں داخل ہو چکا تھا۔ شبانہ جھونپڑی کی طرف لپکی جھونپڑی کا دروازہ کھلا تھا۔ یہ دروازہ بانس کا تھا اور اندر سے بند نہیں تھا۔ شبانہ جھونپڑی میں گھس گئی۔ اندر کسی نے ہڑبڑا کر کہا "جل تو جلال تو۔ کون ہے۔؟"

شبانہ سمجھ گئی کہ یہ قبرستان کا گورکن ہے۔ اس نے دھیمی آواز میں التجا کرتے ہوئے کہا۔

"میں مسلمان لڑکی ہوں غنڈے میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ خدا رسول کے لیے مجھے بچا لو۔"

اندھیرے میں چارپائی پر سے کوئی اٹھا۔ شبانہ کو ایک آدمی کی سفید داڑھی دکھائی دی۔ اس نے شبانہ سے کہا۔

"بیٹی میری چارپائی کے نیچے چھپ جاؤ۔"

شبانہ پلک جھپکتے ہی چارپائی کے نیچے گھس گئی۔ بوڑھا گورکن جھونپڑی سے باہر نکل آیا اس نے دروازے کو بند کر دیا اور بلند آواز میں کلمہ شریف پڑھ کر بولا۔

"ادھر کون ہے بھائی۔ میری جھونپڑی یہاں ہے۔"

اندھیرے میں سے دادا بھائی گورکن کے سامنے آ گیا۔ مسلمان گورکن نے اسلام علیکم کہہ کر پوچھا۔

"کیوں بھائی کوئی قبر کھدوانی ہے کیا؟ میت ساتھ لائے ہو یا صبح کو لاؤ گے۔؟"

دادا بھائی نے تاریکی میں ادھر ادھر آنکھیں گھمائیں اور بوڑھے گورکن سے کہا "بابا یہاں کسی عورت کو تو نہیں دیکھا؟ میری بیوی ہے اس کا دماغ ٹھیک نہیں۔ آدھی رات کو گھر سے نکل بھاگی ہے۔"

بوڑھے گورکن نے کہا "بیٹا! یہ قبرستان ہے یہاں تو زیادہ تر میتیں ہی آتی ہیں زندہ لوگ کم ہی آتے ہیں۔ میں نے کسی عورت کو ادھر آتے نہیں دیکھا۔ آدھ گھنٹے سے جھونپڑی میں بیٹھا عبادت کر رہا ہوں۔ بھائی تم اپنا نام پتہ بتا دو۔ اگر تمھاری بیگم ادھر آئیں تو میں انھیں تمھارے گھر پہنچا دوں گا۔"

دادا بھائی کے دونوں غنڈے بھی اندھیرے میں سے نکل کر سامنے آ گئے ان کی آنکھوں سے ہی بوڑھے گورکن نے اندازہ لگا لیا کہ بڑے خطرناک قسم کے جرائم پیشہ لوگ ہیں دادا بھائی بولا۔

"کوئی بات نہیں باباجی! ہم اسے خود ہی تلاش کر لیں گے۔"

ایک غنڈہ کہنے لگا "دادا وہ ضرور شہر کی طرف گئی ہو گی چلو ادھر چل کر دیکھتے ہیں۔"

دادا بھائی نے ایک نظر بوڑھے گورکن پر ڈالی۔ بوڑھے گورکن نے کہا "بیٹا! خدا کرے تمھیں تمھاری بیوی مل جائے میں تہجد کی نماز پڑھ کر تمھارے لیے ضرور دعا کروں گا۔"

دادا بھائی نے کوئی جواب نہ دیا اور اپنے غنڈوں کے ساتھ قبرستان کی ڈیوڑھی کی طرف چل دیا۔ گورکن وہیں پانی کا لوٹا لے کر بیٹھ گیا اور وضو کرنے لگا۔ حقیقت میں وہ اندھیرے میں ان غنڈوں کو قبرستان سے جاتے دیکھ رہا تھا جب اسے یقین ہو گیا کہ غنڈے قبرستان کی چاردیواری میں سے نکل گئے ہیں تو وہ پانی کا لوٹا ایک طرف رکھتے ہوئے اٹھا اور جھونپڑی کے دروازے میں آ کر بیٹھ گیا۔ جیب سے مڑا تڑا سگریٹ نکال کر سلگایا اور اس کا کڑوا کش نگلتے ہوئے جھونپڑی کے اندر منہ کر کے بولا "بیٹی! تم جو کوئی بھی ہو اسی چارپائی کے نیچے چھپی رہنا غنڈے ویسے تو قبرستان سے جا چکے ہیں لیکن ان کا اعتبار بھی نہیں ہے۔ تم میری بات کا جواب ہرگز مت دینا ابھی خاموش رہو۔"

شبانہ نے جب سنا کہ دادا بھائی اور اس کے غنڈے ساتھی چلے گئے تو اس کی جان میں جان آئی جب تک وہ جھونپڑی کے باہر کھڑے بوڑھے گورکن سے باتیں کرتے رہے تھے اس کا اوپر کا سانس اوپر ہی رہا تھا تھوڑی دیر بعد بوڑھا گورکن جھونپڑی میں آ گیا شبانہ چارپائی کے نیچے سے نکل آئی۔ گورکن زمین پر بیٹھ گیا اور اندھیرے میں ہی شبانہ سے پوچھنے لگا کہ اب بتاؤ بیٹی تم کون ہو اور یہ غنڈے تمھارے پیچھے کیوں لگے ہوئے تھے؟

شبانہ کا دل چاہا کہ وہ اس نیک دل گورکن کو اپنی ساری بپتا سنا دے چنانچہ اس نے شروع سے لے کر آخر تک اسے اپنی داستان الم بیان کر دی۔ بوڑھا گورکن شبانہ کے حالات سن کر بڑا متاثر ہوا اٹھ کر ایک پل کے لیے دوبارہ جھونپڑی سے باہر گیا شاید وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کہیں دادا بھائی کے غنڈے جھونپڑی کے آس پاس تو نہیں منڈلا رہے۔ واپس آ کر کہنے لگا "بیٹی! ابھی تم رات اسی جھگی میں گزارو۔ صبح میں تمھارے بارے میں کچھ سوچوں گا۔ اب تم سو جاؤ۔۔ بے فکر رہو میں جھونپڑی کے باہر پہرہ دوں گا۔ اللہ نے چاہا تو وہ مفرور غنڈے دوبارہ نہیں آئیں گے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شبانہ نے کسی نہ کسی طرح تنگ و تاریک جھونپڑی میں رات گزار دی۔ صبح ہوئی قبرستان کے درختوں میں چڑیاں چہچہانے لگیں۔ بوڑھا گورکن اندر آیا اس نے شبانہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "بیٹی! تو مسلمان کی اولاد ہے مشرقی پاکستان کی طرح ہم پر بھی بھارتی فوجیوں نے چڑھائی کی تھی ہم پر بھی بڑا ظلم ہوا تھا۔ میں ساری رات تمہارے بارے میں سوچتا رہا۔ یہاں تمہارا رہنا ٹھیک نہیں۔ غنڈے تمہاری تلاش میں یہاں پھر آسکتے ہیں ابھی دن کا اجالا پوری طرح اجاگر نہیں ہوا۔ میرے ساتھ آؤ۔ یہاں سے تھوڑی دور ایک مقبرہ ہے وہاں مقبرے کے باغ میں، میں نے ایک چھوٹی سی کٹیا بنا رکھی ہے تم ابھی وہاں چلی چلو۔ اس کے بعد سوچ لیں گے کہ آگے کیا کرنا ہے۔"

بوڑھے گورکن نے شبانہ کو ایک نیلی چادر دی جو اس نے اپنے جسم کے گرد لپیٹ لی۔ اس نے چادر سے اپنا آدھا چہرہ بھی ڈھانپ لیا اور بوڑھے گورکن کے ساتھ قبرستان سے نکل کر مقبرے کی طرف پیدل ہی روانہ ہوگئی۔ یہ مقبرہ اورنگ آباد شہر سے باہر مضافات میں ایک غیر آباد جگہ پر واقع تھا۔ چونے کے پتھر کا بنا ہوا یہ مقبرہ شبانہ کو خستہ حالت میں لگا۔ بوڑھا گورکن مقبرہ کے عقبی محرابی دروازے سے باغ میں آگیا جو ویرانی کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ یہاں نیم اور املی کے درختوں کے نیچے پتھروں کی دیواروں اور ناریل کی ڈھلواں چھت والی ایک چھوٹی سی کٹیا بنی ہوئی تھی۔ اس کے باہر درخت کے نیچے ایک چھوٹا سا غسل خانہ بھی تھا۔ باہر کھرے میں مٹی کا ٹب پانی سے بھرا پڑا تھا۔ کٹیا کے اندر مٹی کی صراحی میں ٹھنڈا پانی تھا۔ زمین پر لکڑی کا پرانا تخت بچھا تھا۔ ایک طرف بستر لپیٹ کر رکھا ہوا تھا۔ یہاں شبانہ نے منہ ہاتھ دھویا۔ گورکن نے چائے بنا کر اسے پلائی اور شبانہ کو بتایا کہ یہ مقبرہ اورنگ زیب عالمگیر کی ملکہ رابعہ درانی المعروف دل رس بانو کا ہے جو ۱۶۵۷ء میں وفات پانے کے بعد وہاں دفن ہوئی تھی۔

"یہاں بہت کم لوگ آتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی غیر ملکی سیاح کیمرہ گلے میں لٹکائے آنکلتا ہے۔"

شبانہ نے پوچھا کہ اسے کب تک کٹیا میں رہنا ہوگا۔ گورکن کسی سوچ میں تھا۔ کہنے لگا "بیٹی! میں چاہتا ہوں کہ تمھیں کسی طرح سے پاکستان پہنچا دوں۔ لیکن پاکستان یہاں سے بہت دور ہے تمھیں پاکستان پہنچانا ناممکن ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ تمھیں مدراس سے آگے سمندر پار

کروا کر سری لنکا کے ملک میں پہنچا دوں۔ وہاں بھارت کی حکومت نہیں ہے۔ وہاں سے تم آسانی کے ساتھ اپنے وطن جا سکتی ہو۔" شبانہ کو یہ تجویز اچھی لگی۔ اس نے پوچھا کہ مدراس کا سمندر وہاں سے کتنی دور ہوگا اور وہ اسے کیسے پار کر سکے گی۔ بوڑھا گورکن کہنے لگا "مدراس یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ نیچے کی جانب دوسرا صوبہ تامل ناڈو ہے جس کا دارالحکومت مدراس ہے۔ وہاں سے تمھیں ٹرین کے ذریعے تکون تک دھنش کوڈی کے چھوٹے سے اسٹیشن تک جانا ہوگا۔ دھنش کوڈی سے بحری جہاز تمھیں سری لنکا کے شمالی ساحل منارے جائے گا۔ یہ سمندری سفر بڑا مختصر ہے۔ ایک گھنٹے میں تم سری لنکا پہنچ جاؤ گی۔"

شبانہ کی آنکھوں میں پہلی بار امید کی روشنی چمکنے لگی۔ اس نے گورکن بابا سے التجا کی کہ وہ اسے کسی طرح سری لنکا پہنچا دے۔ بوڑھا گورکن بولا "میں غریب آدمی ہوں زیادہ لوگ میرے واقف بھی نہیں ہیں۔ میرا ایک بھانجا یہاں اورنگ آباد ریلوے اسٹیشن کی کینٹین میں کام کرتا ہے۔ بڑا خدا ترس آدمی ہے۔ سچا مسلمان ہے۔ میں اس سے بات کروں گا۔ یہ تمھیں لنکا پہنچانے کا بندوبست کر دے گا۔ اب تم ایسا کرو کہ کٹیا کا دروازہ اندر سے بند کر لو۔ میں شہر اپنی بہن کے ہاں جا کر تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔ اول تو ادھر ویران مقبرے میں کوئی نہیں آتا۔ اگر کوئی نکل ہی آیا تو تم دروازہ ہرگز مت کھولنا۔ اندر سے آواز بھی نہ نکالنا۔"

اتنا کہہ کر بوڑھا گورکن چلا گیا۔ شبانہ تخت پر کچھ دیر بیٹھی سوچتی رہی کہ اگر وہ کسی طرح سری لنکا پہنچنے میں کامیاب ہوگئی تو وہ سیدھی وہاں پر اپنے ملک کے سفارت خانے چلی جائے گی جو اسے پاکستان پہنچا دیں گے۔ پہلی بار شبانہ کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے سر سے آدھا بوجھ اتر گیا ہے۔

ہم شبانہ کو اورنگ آباد حیدر آباد دکن کے اس مقبرے میں چھوڑ کر واپس کلکتے آتے ہیں جہاں ندیم ذکریا اسٹریٹ والے امجدیہ ہوٹل کے پیچھے سیٹھ جبار کی بیٹھک میں چھپا ہوا ہے۔ سیٹھ جبار ندیم کو اپنی بیٹھک میں زیادہ دیر کے لیے نہیں رکھ سکتا تھا کیونکہ پولیس ندیم کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ سیٹھ جبار کے گرفتار ہو جانے کا بھی خطرہ تھا۔

سیٹھ جبار اس کے باوجود ندیم کو بھارتی پولیس کے بھیڑیوں کے آگے ڈالنا کبھی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ جیسا کہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں اس نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ ندیم کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دریا پار والے دلدلی جنگل میں اپنے خفیہ اڈے کے پرانے گودام میں اس وقت تک چھپا دے گا جب تک کہ سرحدوں پر سے فوجیں پیچھے نہیں ہٹ جاتیں۔ اس کے بعد وہ ندیم کو اپنے کسی آدمی کے ساتھ پنجاب کی طرف بھیج کر باڈر کراس کروادے گا۔ اس کا ذکر سیٹھ جبار نے ندیم سے بھی کر دیا تھا۔ ندیم نے بظاہر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ وہ دریا پار والے پرانے گودام میں چھپنے پر راضی ہو گیا تھا لیکن اس نے دل میں طے کر رکھا تھا کہ وہ نجمی سے ہر حالت میں ملے گا۔ اور اسے اپنے ساتھ لے کر ہی پاکستان جائے گا۔ وہ نجمی کو ہندوستان میں چھوڑ کر اکیلا پاکستان نہیں جا سکتا تھا۔ چنانچہ ایک رات سیٹھ جبار نے ندیم کو اپنے ایک آدمی کے ساتھ جیپ میں سوار کروا کر دریا والے خفیہ گودام کی طرف روانہ کر دیا۔

اس گودام میں سیٹھ جبار کبھی منشیات کا اسٹاک رکھا کرتا تھا۔ جب سے اس نے منشیات کا دھندا چھوڑا تھا۔ یہ گودام ویران ہو گیا تھا۔ اگرچہ اس پر ابھی تک سیٹھ جبار کا ہی قبضہ تھا۔ وہاں صرف ایک چوکیدار رہتا تھا۔ اس چوکیدار کو بھی اپنے ہوٹل میں بلوا کر سیٹھ جبار نے سمجھا دیا تھا کہ ندیم اس کا اپنا خاص آدمی ہے اور اسے مناسب وقت آنے پر انڈیا سے اسمگل کروانا ہے اور وہ اس کی ہر طرح سے خبر گیری کرے اور کسی کو کان وکان خبر نہ ہو کہ وہ گودام میں چھپا ہوا ہے۔ یہ گودام ایک انتہائی ویران اور غیر آباد دلدلی علاقے میں تھا۔ اس کے باوجود چوکیدار صبح و شام بڑی چوکسی سے پہرہ داری کرتا۔

ندیم کا مقصد وہاں چھپے بیٹھے رہنا نہیں تھا۔ اسے بہر حال نجمی کے پاس پہنچنا تھا۔ اتنا اسے معلوم تھا کہ نجمی بنگال اور بہار کی سرحد پر واقع ایک جنگل میں اپنی کمین گاہ میں کچھ ڈاکو ساتھیوں کے ہمراہ رہ رہی ہے۔ چنانچہ اس نے ایک روز گودام سے نکل کر نجمی کی تلاش میں نکلنے کا پروگرام بنا لیا۔ اس کے پاس اتنے پیسے تھے کہ وہ ٹرین کے ذریعے گوماہ کے اسٹیشن تک سفر کر سکتا تھا۔ اس سفر میں اس کے پکڑے جانے کا خطرہ قدم قدم پر تھا۔ مگر ندیم ان خطرات سے ٹکرانے کا عادی ہو گیا تھا اور پھر اس کے سامنے اس کی محبوبہ نجمی تھی جس کی کشش اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ ندیم نے ویسے بھی بہاری مسلمانوں کی طرح داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ ایک شام اس نے چوکیدار سے کہا کہ وہ جنگل میں ذرا چہل قدمی کرنے جا رہا ہے۔ چوکیدار نے کہا "بابو یہ علاقہ خطرناک ہے جگہ جگہ گھاسوں میں دلدل چھپی ہوئی ہے۔ تم کہیں دلدل میں نہ پھنس جاؤ۔ میں تمھارے ساتھ

چلتا ہوں۔"

لیکن چوکیدار کو ندیم نے وہیں رہنے پر راضی کر لیا اور خود ناریل کے دلدلی ذخیرے کی طرف چل پڑا۔ وہ کئی دلدلی جنگل عبور کر چکا تھا۔ یہ دریائی دلدل ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔ اب وہ تو گھاس کا رنگ دیکھ کر ہی پہچان لیتا تھا کہ اس کے نیچے دلدل ہے۔ سورج ابھی ابھی غروب ہوا تھا اس کی عنابی روشنی کاسنی اندھیرے میں بدل رہی تھی۔ پہلے تو ندیم چہل قدمی کے انداز میں آہستہ آہستہ ٹہلتا رہا۔ پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ چوکیدار کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے تو اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ وہ دریا کے کنارے آ گیا۔ اسٹیشن کی سمت کا اسے بخوبی اندازہ تھا کوئی ایک میل چلنے کے بعد وہ دریا کو چھوڑ کر آبادی والے علاقے کی طرف ہو گیا۔ یہاں زیادہ تر کارخانوں اور فیکٹریوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ان کے پیچھے کلکتہ کا دوسرا بڑا ریلوے اسٹیشن ہوڑہ تھا۔ ندیم کو یہیں سے گوماہ کے لیے کوئی ٹرین پکڑنی تھی۔ اندھیرا ہونے لگا تھا۔ ندیم کارخانوں سے دور رہ کر چل رہا تھا۔ ایک جگہ اسے موٹر رکشا خالی مل گیا۔ اس میں سوار ہو کر وہ ریلوے اسٹیشن سے ایک فرلانگ دور ہی ریلوے گوداموں کے پاس اتر گیا۔ یہاں چائے کی ایک دکان میں بیٹھ کر وہ چائے پینے لگا۔ وہ کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا تاکہ اندھیرا زیادہ ہو جائے۔ جب رات پوری طرح چھا گئی تو ندیم چائے کی دکان سے نکلا اور گودام کی دیوار پھاند کر اسٹیشن کے یارڈ میں آ گیا اور ریل کی پٹڑیوں کے ساتھ ساتھ پلیٹ فارم کی طرف چل پڑا۔ وہ بکنگ ونڈو پر خود ٹکٹ نہیں خریدنا چاہتا تھا۔ اس نے پروگرام یہ بنایا کہ وہ پلیٹ فارم پر پہنچ کر کسی قلی کو پیسے دے کر ٹکٹ منگوا لے گا۔

ہوڑہ کا اسٹیشن نیلی پیلی اور لال بتیوں سے خوب روشن تھا۔ ندیم کے لیے کلکتہ کے دونوں اسٹیشن یعنی سیالدہ اور ہوڑہ کوئی نئے نہیں تھے اسے معلوم نہیں تھا کہ سیالدہ سے ریل آسام اور تہری پورہ یعنی بنگال کے اندر کی طرف جاتی ہے اور پنجاب، دلی، بہار کی طرف ٹرینیں ہوڑہ سے چلتی ہیں۔ وہ ریل کی پٹڑیوں میں سے گزرتا پلیٹ فارم پر آ گیا۔ پلیٹ فارم کے شروع میں ہی وہ ایک جگہ قلی کو دیکھ کر اس کی طرف مڑا۔ معلوم ہوا کہ بہار کی طرف گاڑی نو بجے رات پلیٹ فارم نمبر ۴ سے روانہ ہو گی۔ ندیم نے قلی کو ایک فرضی قصہ سنایا اور اسے پیسے دے کر گوماہ تک کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھرڈ کلاس کی ایک ٹکٹ منگوالی۔ قلی کو اس کی کمیشن ادا کر دی۔ تھرڈ کلاس میں اس کے لیے سفر
محفوظ تھا کیونکہ ایک تو تھرڈ کلاس میں رش ہوتا ہے اور اسے اپنے آپ کو چھپانے کا موقع
مل جاتا۔ دوسرے پسنجر ٹرینوں کی طرف پولیس زیادہ توجہ نہیں دیتی تھی۔ ان ٹرینوں میں ..
مسافروں کا ہجوم ہوتا تھا۔ پولیس کس کس کو دیکھتی پھرے۔ یہ ایک رات اور ایک دن کا سفر
تھا۔ ندیم کو اگلے روز رات کے وقت گوماہ پہنچنا تھا۔ ٹرین سات بجے ہی آ کر پلیٹ فارم پر
لگ گئی۔ مگر ندیم اس وقت ڈبے میں بیٹھا جب ٹرین کے چلنے میں چند منٹ ہی باقی رہ
گئے تھے۔ پولیس کی طرف سے وہ غافل نہیں تھا۔ ڈبے میں وہ سامان کی اوٹ میں فرش پر
ہی ٹائیلٹ کے پاس دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ جب ٹرین چلی تو اس نے خدا کا شکر
ادا کیا۔

جس وقت ندیم ٹرین میں بیٹھا۔ کلکتہ سے بہار کی طرف روانہ ہوا تھا عین اس وقت یعنی رات
کے نو بجے نجمی اپنی جنگل والی خفیہ کمین گاہ میں اپنے مسلمان وفادار ساتھی بادل کے ہمراہ درختوں
کے نیچے ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے ٹہل رہی تھی۔ شبانہ کو نجمی کا کچھ علم نہیں تھا کہ کہاں غائب
ہو گئی ہے۔ اسے روپا اور کالی بدمعاش سے اپنا انتقام لینا تھا۔ صرف یہی دو اس کے دشمن
اور اس کی عزت کے قاتل باقی رہ گئے تھے۔ اپنے وفادار ساتھی بادل کو نجمی نے سب کچھ بتا
دیا تھا اور اس وقت وہ بادل کے ساتھ یہی مشورہ کر رہی تھی۔ اس کا پروگرام اسی رات کمین گاہ
سے شہر کلکتہ کی طرف روانہ ہونے کا تھا۔ جہاں روپا اور کالی بدمعاش سندری نام کی مکار
ہندو عورت کے ساتھ رہ رہے تھے اور جہاں سے انھوں نے شبانہ کو بردہ فروش دادا بھائی
کے حوالے کیا تھا۔ نجمی اپنے ساتھ زیادہ آدمی نہیں لے جانا چاہتی تھی۔ طے یہ ہوا کہ اس کے ساتھ
صرف بادل ہی جائے گا۔ تیز رفتار طوفانی جیپ ان کے پاس تھی۔ انھوں نے جنگل جنگل ایک
آسان اور خفیہ راستے سے بنگال میں داخل ہو کر دریائے ہگلی کے کنارے روپا اور کالی بدمعاش
کے اڈے تک پہنچنا تھا۔ نجمی کو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ایک قاتلہ ہے۔ اپنے کئی دشمنوں کو موت کے
گھاٹ اتار چکی ہے اور بنگال کی پولیس شدّت سے اس کی تلاش میں ہے۔
دس بجے رات نجمی [illegible] گولیاں اور فالتو رائفلیں اور پانی سے بھرا ہوا مشکیزہ اور

ایک خنجر رکھوایا۔ کھانے کے لیے تھوڑی سی خشک بھنی ہوئی مچھلی بھی ساتھ لی اور اپنے وفادار مسلمان
ساتھی بادل کے ہمراہ جیپ میں بیٹھ کر کلکتہ شہر کی جانب روانہ ہو گئی۔ ٹرین بنگال کی سرحد کی
جانب ایک لمبا چکر کاٹ کر آتی تھی اور اسے بہت وقت لگتا ہے لیکن نجمی جنگل میں سے ہو
کر جس راستے سے جا رہی تھی وہ راستہ زیادہ دور اور زیادہ طویل نہیں تھا۔
انھیں پانچ گھنٹوں میں کلکتہ شہر کی حدود میں داخل ہو جانا تھا۔ بند جیپ گھاٹیوں، کھڈوں،
وادیوں اور ندی نالوں کو عبور کرتی رات کی خاموشی اور تاریکی میں تیز رفتاری سے اپنی منزل
کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ بادل جیپ چلا رہا تھا۔ نجمی اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ دونوں کی
اسٹین گنیں ان کے گھٹنوں پر پڑی تھیں۔ گولیوں کی بیلٹ کمر کے ساتھ بندھی تھی۔ دونوں
نے اپنے سروں پر سرخ رومال باندھ رکھے تھے۔ لباس گوریلوں جیسا تھا۔ یعنی بش شرٹ اور پتلون
پاؤں میں ربڑ کے جوتے تھے۔ نجمی خاموش تھی۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور وہ سوچ
رہی تھی کہ روپا بدمعاش اور کالی بدمعاش اگر اپنے اڈے پر نہ ہوئے تو اسے سخت مایوسی ہو گی اور اسے
دوبارہ کسی دوسری رات کو انھیں قتل کرنے کے لیے آنا پڑے گا۔ بارہ بجے رات انھوں نے ایک دریا
عبور کیا۔ پل ویران تھا۔ اب وہ بڑی پکی سڑک سے ہٹ کر ایک ذیلی سڑک پر آ گئے۔ یہ سڑک آگے
چل کر ناہموار علاقے میں داخل ہو گئی۔ یہاں سے ایک شارٹ کٹ بردوان پرانے محل والے
کھنڈر کی طرف نکل جاتا تھا۔ جونہی ان کی جیپ بنگال کی سرحد عبور کر کے بردوان کو جانے والی
سڑک پر آئی۔ اچانک جھاڑیوں میں سے دو پولیس کانسٹیبل نکل کر سڑک پر آ گئے۔ جو جیپ کو
رکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ نجمی نے بادل سے کہا۔

"جیپ کو روک دو۔"

بادل نے تشویش انگیز نظروں سے نجمی کو دیکھا اور کہا کہ وہ ہم پر فائرنگ کر دیں گے۔
ہمیں نکل جانا چاہیئے۔ نجمی نے سخت لہجے میں حکم دیا۔

"میں کہتی ہوں جیپ کو روک دو۔"

بادل نے کچی سڑک پر بریک لگا دی۔ جیپ بنگالی کانسٹیبلوں کے بالکل قریب جا کر رک
گئی۔ نجمی کی گرفت اپنی اسٹین گن پر مضبوط ہو گئی۔

٭٭٭

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کانسٹیبل بنگال پولیس کے تھے۔ انھوں نے رائفلیں تان رکھی تھیں۔ ابھی انھوں نے وہ خونی اسٹین گنیں نہیں دیکھی تھیں جو بادل اور نجمی کے گھٹنوں پر پڑی تھیں۔ ایک کانسٹیبل نے بنگلہ زبان میں چلّا کر کہا۔

"با ہر آ جاؤ۔"

اس علاقے میں ڈاکے اور قتل کی وارداتیں اکثر ہوتی رہتی تھیں اور پولیس ان ڈاکوؤں کی سرکوبی کے واسطے گشت لگایا کرتی تھی۔

بادل نے بنگلہ میں ہی کہا "ہم بردوان جا رہے ہیں وہاں ہمارا اپنا گھر ہے۔ ہم ڈاکو نہیں ہیں۔"

اس پر دوسرے کانسٹیبل نے نجمی کو کاندھے سے پکڑ کر نیچے کھینچ لیا اور گالی دی۔ نجمی کے بدن میں آگ لگ گئی آگ تو اس کے بدن میں بھارتی پولیس کے ہر آدمی کو دیکھ کر لگ جاتی تھی۔ لیکن اس بدقسمت انسان نے نجمی کو گالی بھی دی تھی۔ نجمی نیچے گر پڑی اس کی اسٹین گن بھی اس کے ساتھ ہی نیچے آ گئی تھی۔

اس نے لیٹے لیٹے اسٹین گن کی نالی کا رخ بنگالی کانسٹیبل کی طرف کیا اور ٹریگر دبا دیا۔ گولیوں کے دھماکے ہوئے اور پورا برسٹ کانسٹیبل کے سینے کو چھلنی کر گیا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر نیچے منہ کے بل گرا۔ دوسرا برسٹ فائر ہوا اور دوسرا کانسٹیبل خاک و خون میں تڑپ رہا تھا۔ یہ دوسرا برسٹ بادل نے فائر کیا تھا۔ نجمی زمین سے اٹھی اور جیپ میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

"چلو بادل ہمیں ابھی روپا اور کالی کا قرض بھی اتارنا ہے۔"

جیپ دو تڑپتی لاشوں کو پیچھے چھوڑ کر بردوان کو دائیں جانب چھوڑتی ہوئی کلکتے کے دریا ہگلی کی جانب روانہ ہو گئی۔ بادل نے جیپ کی رفتار تیز کر دی تھی۔ رات کے اندھیرے میں جیپ کچی سڑک پر اچھلتی ہوئی دوڑتی جا رہی تھی۔ اس سڑک پر یہ لوگ کئی بار کلکتے جا چکے تھے۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ رات ڈھل رہی تھی آسمان پر ستاروں کا رنگ فق ہوتے لگا تھا کہ جیپ مشرق کی طرف سے کلکتے شہر کے مضافات میں داخل ہو گئی۔ بادل کو معلوم تھا اسے کہاں اور کس طرف جانا ہے۔ فیکٹری ایریا ان کی بائیں جانب کافی دور رہ گیا تھا شہر کی روشنیاں دریا پار جھلملا رہی تھیں۔ ہوڑہ برج کی روشنیاں بھی صاف دکھائی دینے لگی تھیں۔ جیپ دریا کے کنارے کنارے روپا اور کالی بدمعاش کے خفیہ اڈے کی طرف دوڑ رہی تھی۔ نجمی دل میں سوچ رہی تھی کہ روپا اور کالی بدمعاش کو وہاں ہونا چاہیئے۔ اس نے بادل سے کہا۔

"جیپ کی رفتار تیز کر دو۔ ہمیں دشمنوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد واپس بھی جانا ہے۔"

بادل نے رفتار مزید تیز کر دی۔ دریا کے کنارے کا راستہ ہموار اور خالی تھا۔ رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ جیپ تھوڑی دیر بعد بائیں جانب دریا کی سڑک سے اتر کر ایک جنگل میں داخل ہو گئی۔ جنگل گھنا نہیں تھا۔ یہ جنگل بھی نہیں تھا۔ بلکہ ناریل سنبل اور املی کے درختوں کا ذخیرہ تھا جو دور تک دریا کے ساتھ پھیلتا چلا گیا تھا۔ ان میں دلدلیں بھی تھیں اور برساتی نالے بھی تھے جو دریا میں طغیانی سے بھر جاتے تھے۔

نجمی اور بادل اس جنگل کے چپے چپے سے واقف تھے۔ انھوں نے ایک خاص مقام پر جا کر جیپ درختوں میں کھڑی کر دی۔ اسٹین گنوں کے میگزین چیک کیے اور جھاڑیوں کو ہٹاتے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگے۔ ان دونوں کو اس امر کا احساس تھا کہ رات ڈھلتی جا رہی ہے اور دن نکلنے والا ہے۔ ایک دلدلی ٹاپو کے اوپر سے ہو کر وہ ایک مقام پر آ کر آہستہ اور محتاط ہو گئے۔

درختوں کے نیچے ایک کوارٹر نما جھونپڑا دکھائی دے رہا تھا۔ جھونپڑی کے اندر روشنی ہو رہی تھی۔ نجمی اور بادل قریب گئے تو انھیں ایک عورت کی آواز بھی سنائی دی۔ نجمی نے بادل کو دوسری طرف سے جھونپڑے کے عقب میں آنے کا اشارہ کیا اور خود جھک کر بائیں جانب سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جھونپڑے کی طرف بڑھی۔ اب اسے عورت کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔ عورت بنگلہ زبان میں کہہ رہی تھی۔

"روپا سو گیا ہے کالی! تم بھی اب سو جاؤ۔"

نجمی وہیں بیٹھ گئی۔ اسے کالی بدمعاش کی آواز سنائی دی۔ "نہیں سندری میں نہیں سوؤں گا۔ میں نہیں سوؤں گا۔"

نجمی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے دونوں قاتل جھونپڑی میں موجود تھے۔ دوسری طرف سے اسے بادل کا سایہ جھاڑیوں میں جھکا جھکا باہر نکلتا نظر آیا۔ کوارٹر نما جھونپڑی کے آگے بانس کی مچان کا برآمدہ تھا دروازہ بند تھا۔ روشنی جھونپڑی کے روشن دان میں سے آ رہی تھی۔ نجمی نے بادل کو ایک خاص اشارہ کیا۔ بادل زمین پر رینگتے ہوئے دروازہ کی ایک جانب درخت کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ اسٹین گن کی نالی کا رخ دروازے کی جانب تھا۔ نجمی نے پتھر اٹھا کر دروازے پر دے مارا۔ کھٹاک کی آواز رات کی خاموشی میں بلند ہوئی۔

جھونپڑی میں جو عورت یعنی سندری بول رہی تھی وہ ایک دم خاموش ہو گئی پھر کسی کے چارپائی سے اٹھنے کی چرچراہٹ سنائی دی۔ نجمی نے دروازے کو اپنے اسٹین گن کی زد میں لے رکھا تھا۔ دروازہ کھلا اور پہلے سندری باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھنے لگی اس کے ساتھ ہی کالی بدمعاش بھی باہر آ گیا۔

"یہ کھڑاک کیسا تھا سندری؟"

اس نے جھومتے ہوئے پوچھا۔ نجمی اسٹین گن تانے اٹھ کھڑی ہوئی جھاڑیوں سے چھلانگ لگا کر باہر نکلی اور کالی کے سامنے آ کر گرجدار آواز میں بولی۔

"یہ تمھاری موت کا کھڑاک تھا کالی! مجھے پہچانتے ہو۔"

جھونپڑی کے کھلے دروازے میں سے روشنی نجمی کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کی شکل دیکھتے ہی کالی بدمعاش کا رنگ اڑ گیا۔ ایک تو نجمی کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی۔ دوسرے کالی بدمعاش کو معلوم ہو چکا تھا کہ چندا ڈاکو بن چکی ہے اور ان تمام لوگوں کو ہلاک کر رہی ہے جو اس کی زندگی کی بربادی کا باعث بنے تھے۔ اس کے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے صرف اتنا ہی

نکل سکا۔

"چندا! چندا! تم، میں میں۔"

نجمی نے بادل کو آواز دی، بادل درخت کی اوٹ سے نکل آیا۔ وہ بھاگ کر جھونپڑے میں داخل ہو گیا، روپا بدمعاش اندر کھاٹ پر گہری نیند سو رہا تھا۔ بادل نے اسے پاؤں سے ٹھوکر مار کر اٹھایا۔ روپا بدمعاش ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اپنے اوپر اسٹین گن تنی ہوئی دیکھی تو سہم گیا۔

بادل، روپا بدمعاش کو گھسیٹ کر جھونپڑے سے باہر لے آیا اور زمین پر نجمی کے قدموں میں لا کر ڈال دیا۔ نجمی نے اس کی گردن پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔

"روپا! تم نے بھی اپنی موت کو ضرور پہچان لیا ہوگا۔"

سندری تھر تھر کانپ رہی تھی۔ کالی کو بادل نے اپنی اسٹین گن کی زد میں لے رکھا تھا۔ بادل نے کرختگی سے کہا۔

"دن نکلنے والا ہے ہمیں ابھی واپس بھی جانا ہے۔ ان کا کام تمام کیے دیتے ہیں۔"

کالی بدمعاش ہاتھ باندھ کر گڑگڑانے لگا۔

"نہیں نہیں چندا بہن! مجھے مت مارنا مجھے مت مارنا۔"

نجمی نے غراتے ہوئے کہا "اس لیے کہ تم دوسری بھولی بھالی لڑکیوں کو اغوا کر کے ان کی زندگیاں برباد کر سکو، نہیں کالی نہیں اب تم کو اس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ تم نے میرے ساتھ جو ظلم کیا اس کا بدلہ میں خود لے رہی ہوں۔ دوسری عورتوں کے ساتھ تم نے جو وحشیانہ سلوک کیا اس کا بدلہ تم سے آگے جا کر لیا جائے گا۔ موت .... جرائم پیشہ ظالموں کو موت!"

نجمی نے آخری جملہ چلا کر ادا کیا اور ٹریگر دبا دیا۔ تڑاتڑ گولیوں کے برسٹ چلنے لگے۔ ایک، دو، تین، چار، پورے چار برسٹ فائر ہوئے اور کالی خون میں لت پت زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ اس کا سارا جسم گولیوں سے چھلنی ہو گیا تھا۔ نجمی نے تڑپتے ہوئے کالی پر مزید برسٹ فائر کیے اور وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ روپا بدمعاش اور سندری دہشت زدہ تھے۔ بادل نے روپا کی طرف اسٹین گن کرتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اسے میں ختم کرنا چاہتی ہوں۔"

نجمی بلند آواز میں بولی۔

"یہ میرا قاتل ہے۔ میں اس سے اپنے قتل کا بدلہ لوں گی۔"

نجمی کی اسٹین گن شعلے اگلنے لگی۔ ان گنت گولیاں روپا بدمعاش کے جسم کو چھیدتی ہوئی گزر گئیں۔ نجمی نے اسٹین گن کا رخ اوپر کر لیا اور سندری کی طرف شعلہ بار نگاہوں سے دیکھا۔

"تم ان کی نائیکہ ہو۔ تمہارے ان ہاتھوں سے بھی کئی بے گناہ معصوم لڑکیوں کی عزتوں کے خون ہوئے ہیں۔ میں جانتی ہوں تم کیا کرتی رہی ہو۔"

سندری نجمی کے پاؤں پر گر کر گڑگڑانے لگی۔

"مجھے معاف کر دو چندا۔ میں بے گناہ ہوں۔ یہ لوگ مجھے بھی اغوا کر کے لائے تھے۔ میں نے ان کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا۔ لیکن میں نے کسی لڑکی کو اغوا نہیں کیا۔ بھگوان کی سوگند کھا کر کہتی ہوں میں بے گناہ ہوں۔"

نجمی ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ سندری کو کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ سندری ہاتھ باندھے کھڑی ہو گئی۔ نجمی نے پوچھا۔

"کیا یہاں کوئی ندیم نام کا شخص آیا تھا۔؟"

نجمی نے اسے ندیم کا حلیہ بیان کیا۔ سندری نے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے کہا۔

"نہیں چندا بیٹی! اس حلیے کے کسی آدمی کو میں نے یہاں نہیں دیکھا۔

سندری نے نجمی کو شبانہ کے بارے میں بالکل نہ بتایا کہ ایک عورت کو ایک روز پہلے انھوں نے دادا بھائی کے ہاتھوں فروخت کیا ہے۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے بتا دیا تو چندا اسے بھی نہیں چھوڑے گی۔ بادل نے اسٹین گن سندری کی گردن سے لگا دی۔

"میں اسے شوٹ کرنے لگا ہوں۔"

نجمی نے ہاتھ کے اشارے سے بادل کو روک دیا۔ ایک گہرا سانس بھر کر اسٹین گن والا ہاتھ نیچے کر لیا اور بوجھل آواز میں بولی۔

"چلو بادل ہمیں بہت دور جانا ہے۔"

سندری کی گھگھی بندھی ہوئی تھی، رنگ فق تھا، ہونٹ خشک تھے۔ جڑے ہوئے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ روپا اور کالی بدمعاش کی چھلنی لاشیں خون میں لت پت ٹھنڈی ہو چکی تھیں۔ نجمی نے لاشوں کی طرف نفرت بھری نگاہ ڈالی۔ ان پر زور سے تھوکا اور بادل کے آگے آگے تیز تیز قدموں سے چلتی درختوں کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔ بادل بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں اپنی جیپ میں بیٹھے تھے اور جیپ دریا کے کنارے کنارے پوری رفتار سے بنگال کی سرحد کی طرف چلی جا رہی تھی۔ پو پھٹ چکی تھی۔ صبح کا نیلا نیلا اولیں اجالا پھیل رہا تھا۔ نجمی نے بادل کو چلا کر کہا

"اوہنی بن کی طرف سے ہو کر چلنا بادل۔"

اور بادل نے ایک فرلانگ چلنے کے بعد جیپ کو ایک کچے راستے پر چلا دیا۔

اب ہم واپس ندیم کی طرف چلتے ہیں۔ ندیم شام کے وقت صوبہ بہار کے پہلے اہم ریلوے اسٹیشن گوماہ پر ٹرین سے اتر گیا۔ شام ہو چکی تھی، اسٹیشن اور شہر کی بتیاں جگمگانے لگی تھیں۔ پلیٹ فارم پر زیادہ رش نہیں تھا۔ ندیم کو یہاں سے امر گڑھ کی طرف سے ہوتے ہوئے جنوب کی سمت اوہنی بن کے جنگل میں داخل ہونا تھا۔ نجمی کی خفیہ کمین گاہ اسی جنگل میں کسی مقام پر تھی۔ ندیم کی اطلاع کے مطابق یہ کمین گاہ شولا گڑھ برانچ لائن والی نہر سے نکل کر جنگل کی طرف جاتی ندی کے کنارے چٹانوں کے پاس تھی۔ جنگلوں میں پھرنا اور اسے تلاش کرنا اب ندیم کے لیے کوئی انوکھا کام نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ رات کے اندھیرے میں بھی نجمی کی کمین گاہ پر پہنچ جائے گا۔ وہ اسٹیشن کے گیٹ کی طرف جانے کی بجائے پلیٹ فارم سے اتر کر ریلوے لائن کی طرف بڑھا۔ ٹکٹ اس کے پاس موجود تھا لیکن وہ گیٹ پر کھڑے ٹکٹ چیکر کے سامنے نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہاں اس کی مڈبھیڑ کسی پولیس کانسٹیبل سے ہو سکتی تھی۔

وہ پلیٹ فارم کی ڈھال اتر رہا تھا کہ ایک ٹی ٹی اس کی طرف بڑھا۔ اس نے ندیم سے ٹکٹ طلب کیا۔ ندیم نے صدری کی جیب سے ٹکٹ نکال کر اسے دیا تو ٹی ٹی نے پوچھا "تم ادھر ریلوے یارڈ میں کس لیے جا رہے ہو؟"

ندیم نے بتایا کہ ادھر ریلوے لائن کے پار اس کے دوست کا گھر ہے۔ ٹی ٹی نے ٹکٹ چیک کر کے ندیم کو واپس کر دیا اور کچھ نہ کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ندیم آگے بڑھ گیا۔ وہ ریلوے لائن پار کر رہا تھا کہ ریلوے کے چوکیدار نے اسے روک لیا۔

"کدھر جا رہے ہو تم ؟"

ندیم بڑا سٹ پٹایا۔ یہ کم بخت بار بار اس کا راستہ کیوں روک رہے ہیں۔ وہ چوکیدار کی طرف پلٹ کر بولا۔

"میرے پاس ٹکٹ ہے بھیا۔ وہ سامنے لائن پار میرے دوست کا کوارٹر ہے مجھے وہاں جانا ہے۔"

چوکیدار نے اس طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر وہاں تو گودام ہیں کوئی کوارٹر نہیں ہے۔"

ندیم نے کہا "گودام کے پار کوارٹر ہے میرے دوست کا۔"

چوکیدار نے ڈنڈا گھماتے ہوئے کہا۔

"گودام کی دوسری طرف بھی کوئی کوارٹر نہیں ہے تم مجھے کوئی چور معلوم ہوتے ہو اور ریلوے گودام میں چوری کرنے کی نیت سے جا رہے ہو۔ ابھی کل رات یہاں سے ہزاروں روپے کا مال چرا لیا گیا ہے۔"

ندیم نے ذرا سا مسکراتے ہوئے کہا۔

"بھائی میں شریف آدمی ہوں۔ چور نہیں ہوں میں تو بردوان سے اپنے دوست سے ملنے آیا ہوں۔"

چوکیدار نے سامنے سے پولیس کے ایک کانسٹیبل کو آتے دیکھا تو رعب سے بولا "چور کے سر پر سینگ نہیں ہوتے اور جدھر تم جا رہے ہو، ادھر کوئی کوارٹر بھی نہیں ہے۔"

ندیم نے پولیس کانسٹیبل کو اپنی طرف آتے دیکھا تو دل زور سے دھڑکا۔ کہیں میں کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ پولیس کانسٹیبل ریلوے کا تھا مگر اس کے کاندھے سے رائفل لٹک رہی تھی ندیم نے چوکیدار سے کہا۔

"بھائی مجھے جانے دو۔ میرا دوست انتظار کر رہا ہوگا اس کی ماں بہت بیمار ہے میں اس کے لیے دوائی لایا ہوں بردوان کے ویدجی سے۔"

اتنے میں کانسٹیبل قریب آ گیا اور بولا۔

"کیا ہو رہا ہے دھنیا ؟"

دھنیا چوکیدار کا نام تھا۔ چوکیدار پہلے سے زیادہ شیر ہو گیا۔ ندیم کی طرف اشارہ کر کے کانسٹیبل سے مخاطب ہوا۔

"یہ مجھے کوئی چور لگتا ہے سنتری جی، کہتا ہے سامنے والے کوارٹروں میں جا رہا ہوں۔ پر ادھر کوئی کوارٹر نہیں ہے۔"

ندیم دل میں اس لمحے کو برا بھلا کہہ رہا تھا جب اس نے گیٹ کی بجائے ریلوے یارڈ کو عبور کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کانسٹیبل نے گھور کر ندیم کو دیکھا اور تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

"کیوں بے کون ہے تو؟ کدھر سے آیا ہے ؟"

ندیم نے وہی کہانی دہرائی تو چوکیدار بول پڑا "سنتری جی اس پر مجھے شک ہے۔ یہ کل والے چوروں کا ساتھی ہے۔ دوسرے گوداموں کا سراغ لگانے آیا ہے۔"

ندیم نے ادھر ادھر دیکھا۔ بھاگ چلو ندیم بھاگ چلو، اس کے دل نے کہا۔ لیکن اتنی دیر میں... کانسٹیبل نے رائفل کاندھے سے اتار کر اپنے ہاتھوں میں تھام لی تھی اور اس کی نالی کا رخ ندیم کی طرف تھا "چلو پولیس چوکی چلو، خبردار اگر بھاگے تو گولی مار دوں گا۔"

ندیم کے پاؤں تلے سے جیسے زمین کھسک گئی اسے اور کچھ نہ سوجھا۔ صدری کی جیب میں جتنے روپے تھے نکال کر سنتری کو پیش کر دیئے اور بولا "یہ لے لو مجھے جانے دو۔ تمھاری بڑی مہربانی ہوگی۔"

سنتری پر اس کا الٹا اثر ہوا اس نے چیخ کر کہا "ابے مجھے گئو ماتا کا ماس کھلاتا ہے۔"

ساتھ ہی اس نے آواز دے کر اپنے ساتھیوں کو بھی بلا لیا۔ پلیٹ فارم کی طرف سے اس کی آواز سن کر تین کانسٹیبل دوڑتے ہوئے آ گئے اور انھوں نے آتے ہی ندیم کو گھیرے میں لے لیا۔ وہ یہ سمجھے کہ ان کے ساتھی نے کل والا چور پکڑ لیا ہے۔ ایک سنتری نے تو ندیم کی گردن پر زور سے مکا مارا۔

"لے چلو اسے چوکی پر۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چار رائفلیں ندیم کے اردگرد تنی ہوئی تھیں۔ وہ پھنس چکا تھا، اس نے ہاتھ نیچے لٹکا لیے اور چاروں سنتری اسے آگے لگا کر ریلوے کی پولیس چوکی پر لے آئے یہ چوکی اسٹیشن کے ساتھ ہی تھی۔ یہاں ہیڈ کانسٹیبل ایک سکھ تھا اس نے ندیم کو آتے ہی دو تین تھپڑ لگا دیئے۔ اور بولا: "اس کو حوالات میں بند کروا دو۔"

ندیم کو گودام میں چوری کے الزام میں حوالات میں بند کر دیا گیا۔ ابھی تک کسی کو یہ پتہ نہیں چلا تھا کہ ندیم وہ ملزم ہے جس کی تلاش میں دلی اور کلکتے کی پولیس ایک عرصے سے سرگرداں ہے اور جو دوبارہ جیل توڑ کر بھاگ چکا ہے اور جس پر پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام ہے۔
ندیم حوالات میں سر پیٹ کر بیٹھ گیا اور وہاں سے فرار ہونے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ صبح یہ لوگ اسے عدالت میں لے جا کر ریمانڈ لے لیں گے اور پھر اس کا سارا... بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ اور وہ کلکتہ یا دلی کی اسپیشل پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ سوال یہ تھا کہ وہ حوالات سے کیسے فرار ہو سکتا تھا۔ حوالات کے دروازے پر لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ باہر مسلح سنتری پہرہ دے رہا تھا۔ سامنے چوکی کا آفس تھا۔ ندیم کا خیال تھا کہ اگلے روز عدالت سے ریمانڈ لینے کے بعد اس سے پوچھ گچھ کی جائے گی لیکن ایک گھنٹے بعد ہی سکھ ہیڈ کانسٹیبل نے اسے چوکی کے ایک کمرے میں بلا لیا اور پوچھ گچھ شروع کر دی۔ ندیم کو ہتھکڑی لگی تھی اور وہ کمرے کے فرش پر بیٹھا تھا۔ سکھ ہیڈ کانسٹیبل نے ندیم کی اردو سے بہت جلد اندازہ لگا لیا کہ وہ پنجابی ہے "اوئے تم پنجابی ہو؟"

ندیم نے کہا "ہاں جی! میرا نام رمیش بھاٹیہ ہے جی میں امرتسر کا رہنے والا ہوں" ندیم نے ایک جھوٹ بولا تو اس کا سلسلہ برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ سکھ ہیڈ کانسٹیبل کو قائل نہ کر سکا کہ وہ کلکتے سے وہاں اپنے دوست سے ملنے آیا تھا۔ سکھ ہیڈ کانسٹیبل نے ایک پل کے لیے بڑے غور سے ندیم کو دیکھا۔ ڈاڑھی کھجاتے ہوئے کچھ سوچا اور باہر نکل گیا۔ سنتری ندیم کے سر پر کھڑا تھا۔ ندیم کا دل ڈوبنے لگا۔ یقیناً سکھ کو اس پر شک ہو گیا ہے۔ دوسرے لمحے سکھ پولیس آفیسر کمرے میں آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک فائیل تھی۔ اس میں سے ایک تصویر نکال کر اس نے ندیم کے سامنے کر دی اور بولا "اس کو پہچانتے ہو؟"

تصویر دیکھتے ہی ندیم کا جسم ٹھنڈا پڑ گیا، یہ اسی کی تصویر تھی۔ ایک زوردار ٹھڈا ندیم کی کمر پر پڑا اور وہ آگے کو گر پڑا۔ سکھ ہیڈ کانسٹیبل نے اسی وقت شور مچا دیا کہ اسے فوراً بند کر دو باہر پوری گارد پہرہ دے گی۔ ندیم کو حوالات میں بند کر کے باہر چار سنتریوں کا پہرہ لگا دیا پندرہ منٹ بعد شہر سے دو پولیس انسپکٹر وہاں آ گئے۔ ان کے پاس بھی فائیل میں ندیم کی تصویر لگی تھی۔ انھوں نے آتے ہی ندیم کو پہچان لیا اور سکھ ہیڈ کانسٹیبل کا شکریہ ادا کیا کہ اس کی مدد سے بھارت کا دشمن نمبر ایک ان کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ ندیم نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اسی رات ندیم کو ایک اسپیشل پولیس کوپے میں ہتھکڑیوں سمیت بٹھا کر کلکتے کی طرف روانہ کر دیا گیا۔
کلکتہ پولیس ہیڈ کوارٹر میں ندیم کا ایک بار پھر چالان کاٹا گیا اور بنگال پولیس اسے اپنی حفاظت میں لے کر دلی کی طرف روانہ ہو گئی۔ دلی میں ندیم پہلی بار پکڑا گیا تھا اور وہیں ایک عدالت سے اسے سزا ہوئی تھی اور دلی جیل توڑ کر ہی وہ فرار ہوا تھا۔ ندیم کو فوری طور پر انٹیلی جنس والوں نے اپنی عملداری میں لے کر اس سے ازسرنو پوچھ گچھ شروع کر دی۔ پولیس نے جان بوجھ کر ندیم کو عدالت میں پیش نہ کیا۔ پولیس کو معلوم تھا کہ ندیم کو عدالت سے ایک بار سزا ہو چکی ہے اور اب جیل سے فرار ہونے کے جرم میں اس سزا میں کچھ اضافہ ہو جائے گا اور ندیم کو ایک بار پھر جیل میں ڈال دیا جائے گا۔ پولیس یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ جیل سے بھاگنے کے بعد کہاں کہاں گیا اور اپنے کن کن جاسوس ساتھیوں سے ملا۔
ندیم کے لیے یہ ایک نیا عذاب تھا اسے پرانے قلعے کے پیچھے ایک کھنڈر کے تہہ خانے میں بند کر دیا گیا۔ اس کھنڈر پر پولیس کا قبضہ تھا اور اس کے تہہ خانے کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ وہاں اگر شیر بھی زخمی ہو کر دھاڑے تو باہر کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔
ندیم پر انسانیت سوز تشدد کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔
شبانہ حیدرآباد دکن کے شہر اورنگ آباد میں اورنگ زیب عالمگیر کی چہیتی بیوی دل رس بانو کے مقبرے کے عقبی باغ کی کٹیا میں تھی۔ وہاں اسے رہتے ہوئے دو روز گزر گئے تھے۔ نیک دل گورکن صبح شام اس کے لیے کھانا لے آتا تھا۔ اس کا بھانجا وقار ریلوے اسٹیشن پر ایک ٹھیکیدار کی کنٹین چلاتا تھا۔ وہ کسی کام سے مدراس گیا ہوا تھا جس کی وجہ سے گورکن اس کے ساتھ شبانہ کے بارے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یں بات نہیں کر سکا تھا۔ دو دن بعد جب واپس آیا تو گورکن نے اسے اعتماد میں لیتے ہوئے شبانہ
کی بات کر دی۔ وقار کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ آدمی سیدھا اور شریف تھا فوراً شبانہ کی مدد
کرنے پر تیار ہو گیا۔ چنانچہ ایک روز اس نے شبانہ کو ساتھ لیا اور مدراس کی طرف روانہ ہو گیا
شبانہ کو وقار نے برقع پہنا دیا تھا تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ وقار نے خود بھی حیدرآبادی اچکن اور
چوڑی موری کا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ اورنگ آباد سے وہ ٹرین میں سوار ہو کر حیدرآباد آئے۔
یہاں سے تامل ناڈو ایکسپریس پکڑی اور مدراس کی طرف چل پڑے۔ وقار نے شبانہ کو سمجھا دیا تھا
کہ وہ کسی بھی اسٹیشن پر ٹرین سے باہر نہ نکلے سفر لمبا تھا۔ حیدرآباد سے قاضی پت، پھر ورنگل
اور وجے واڑہ پہنچے۔ سفر آرام سے کٹ رہا تھا۔ شبانہ کو یقین تھا کہ کوئی غنڈہ اس کا پیچھا نہیں کر
رہا اور وہ ان کی پہنچ سے کافی دور نکل آئی ہے۔ وجے واڑہ سے ٹرین چلی تو تنالی، انگول،
نیلور سے ہوتی ہوئی آخر مدراس سینٹرل کے بہت بڑے اسٹیشن میں داخل ہو گئی۔

شبانہ ان علاقوں میں پہلی بار سفر کر رہی تھی۔ لوگوں کے رنگ گہرے سانولے اور کالے تھے۔
عورتیں دبلی پتلی اور کالی تھیں۔ مدراس اسٹیشن اتنا بڑا تھا کہ شبانہ اپنے محسن وقار کے ساتھ ساتھ
چل رہی تھی کہ کہیں اس بھیڑ میں گم نہ ہو جائے۔ وقار مدراس کئی بار آ چکا تھا۔ وہ شبانہ کو اپنے
ساتھ ایک دوست کے گھر لے گیا اس کے اس دوست کا نام جمال تھا جو میسور کا رہنے والا تھا۔
اور مدراس میں چیٹی اسٹریٹ میں جو مدراس سنٹرل اسٹیشن کے پیچھے ایک گنجان آباد علاقہ تھا رہائش پزیر تھا۔ وقار
نے اپنے مدراس کے دوست سے شبانہ کے بارے میں ابھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ دو روز
پہلے وقار مدراس میں اس کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ جمال نے اپنے دوست وقار کو ایک برقع
پوش عورت کے ساتھ اپنے ہوٹل کی طرف آتے دیکھا تو کچھ حیران سا ہوا۔ جلدی سے
کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل آیا۔ وقار کا خیر مقدم کیا اور کچھ نہ پوچھا کہ اس کے ساتھ برقع پوش
خاتون کون ہے۔ ہوٹل کے اوپر ایک ہی کمرہ تھا جس میں جمال خود رہتا تھا۔ اس نے چابی وقار
کو دی اور کہا۔

"بی بی کو اوپر لے چلو میں تمہارے لیے کھانا بھجواتا ہوں۔"

رات ہو گئی تھی۔ شبانہ ایک بالکل اجنبی شہر میں تھی۔ یہاں کے لوگ کلچرل، زبان، شکلیں،

کھانا وغیرہ ہر شے پاکستان سے مختلف تھی۔ کھانا کھانے کے بعد وقار کو اس کا دوست جمال
اپنے ساتھ نیچے ہوٹل میں لے گیا۔ اب اس نے پوچھا کہ یہ لڑکی کون ہے اور وہ اورنگ آباد
سے اتنی جلدی کیسے آ گیا؟ وقار بولا۔

"میرے دوست اس لڑکی کا نام شبانہ بی بی ہے۔ یہ پاکستان کی رہنے والی ہے اور اسے۔"

وقار نے اپنے دوست جمال کو شبانہ کے بارے میں ساری تفصیل بیان کر دی اور بتایا کہ
وہ اسے اپنے ساتھ سری لنکا لے جا رہا ہے۔ جمال خوش بھی ہوا اور کچھ پریشان بھی ہو گیا کہنے
لگا۔

"تم اس لڑکی کے کاغذات کیسے تیار کراؤ گے۔ تمہارے پاسپورٹ سے کام نہیں چلے گا شبانہ کے
لیے بھی تمھیں الگ پاسپورٹ بنوانا ہوگا۔"

وقار چائے کے کپ میں چمچہ ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔

"میرے دوست اس کا حل بھی میں سوچ کر آیا ہوں۔ یہاں مدراس میں میرا ایک ملنے والا
رہتا ہے وہ کچھ پیسے لے کر لوگوں کو پاسپورٹ بنوا دیتا ہے۔ میں اس سے شبانہ کا پاسپورٹ بنوا
لوں گا۔"

جمال نے کچھ سوچ کر کہا۔

"تم کارگل ہی کی بات تو نہیں کر رہے؟"

"ہاں کارگل ہی کی بات کر رہا ہوں۔" وقار نے چائے کا گھونٹ بھر کر کہا۔

جمال بولا "ارے وہ تو جعلی پاسپورٹ بناتا ہے کئی بار پولیس اس کے دفتر میں چھاپا مار چکی ہے۔"

وقار نے کہا "شبانہ کا جعلی پاسپورٹ ہی بن جائے اسے تو صرف سری لنکا میں داخل کرانا ہے
میرا پاسپورٹ تو اصلی ہے تم اس کی فکر نہ کرو۔"

جمال نے تشویش کے ساتھ کہا "اور اگر لنکا والوں کو پتہ چل گیا کہ شبانہ بی بی کا پاسپورٹ
جعلی ہے تو وہ تمھیں بھی ساتھ ہی پکڑ کر حوالات میں بند کر دیں گے۔"

وقار بولا "اللہ مالک ہے بھائی۔ میں ایک نیک کام کر رہا ہوں خدا ضرور میری مدد کرے
گا۔ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں ہے کہ شبانہ کو لنکا ساتھ لے جاؤں اور اس مصیبت کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماری پاکستانی لڑکی کو لنکا پہنچانا بہت ضروری ہے۔"

جمال خاموش ہو گیا۔ وقار نے کہا "بس میں یہ چاہتا ہوں کہ تم کسی سے بات نہ کرنا۔ یہ راز تمھارے سینے میں راز ہی بن کر دفن ہو جانا چاہیئے۔"

جمال نے وقار کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا "بھائی تم میرے پیارے دوست ہو تمھارے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔ بھلا میں یہ راز کس کو بتا سکتا ہوں۔ تم بتاؤ اگر روپوں کی ضرورت ہے تو میں پیش کر دوں۔"

وقار نے کہا "شکریہ میرے دوست! میں اتنی رقم اورنگ آباد سے لے کر چلا ہوں جو واپسی تک میرے کام آئے۔"

شبانہ ہوٹل کے اوپر والے کمرے میں رات کو سوئی۔ جمال اور وقار نے رات ہوٹل کی دکان میں ہی گزاری۔ دوسرے دن وقار نے شبانہ کے ساتھ اوپر والے کمرے میں ناشتہ کیا اور بتایا کہ وہ اپنے ایک ملنے والے کے پاس اس کے پاسپورٹ کے سلسلے میں جا رہا ہے۔

"تم کمرے میں ہی رہنا میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔"

کارگل ایک بڑا چالاک اور ہوشیار آدمی تھا۔ اس کے پاس ہر قسم کی جعلی مہریں موجود تھیں۔ وقار نے اس سے شبانہ کے پاسپورٹ کی بات کی تو خوش ہو کر بولا "نواب صاحب آپ سے ہم دو سو روپے لے لیں گے کیوں آپ ہمارے پرانے ملنے والوں میں سے ہیں۔ بس آپ لڑکی کی چار پاسپورٹ سائز کی تصویریں لے آیئے اور اس فارم پر دستخط کروا دیجئے گا۔"

وقار نے دو سو روپے اسی وقت ادا کر دیئے۔ کاغذات سنبھالے اور شبانہ کے پاس لے آیا۔ شبانہ نے اس پر جہاں جہاں دستخط کرنے تھے کر دیئے۔ پھر ایک فوٹو اسٹوڈیو میں جا کر پاسپورٹ سائز کی تصویریں اتروائیں دو دن مزید لگ گئے۔ کارگل نے شبانہ کا جعلی پاسپورٹ تیار کر کے وقار کے حوالے کر دیا۔ وقار نے کہا "کارگل صاحب! کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم لنکا میں داخل ہوتے ہی پکڑے جائیں۔"

کارگل نے وقار کا ہاتھ اپنے سینے سے لگا لیا "نواب صاحب! آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ بائی گاڈ اگر کوئی اس پاسپورٹ پر انگلی بھی رکھ دے تو میں اپنی گردن کٹوا دوں۔"

پاسپورٹ بالکل اصلی لگ رہا تھا۔ وقار نے شبانہ کو یہ بالکل نہ بتایا کہ کارگل نے اس کا جعلی پاسپورٹ بنایا ہے۔ اس نے پاسپورٹ شبانہ کو دیتے ہوئے کہا "اپنی واقفیت کی وجہ سے تمھارا پاسپورٹ اتنی جلدی بنا ہے شبانہ۔ ورنہ ایک مہینہ تو اس کام میں ضرور لگ جاتا۔"

شبانہ نے اپنا پاسپورٹ دیکھا۔ بالکل اصلی پاسپورٹ تھا۔ اس کے دل میں وہم تک نہ ہوا کہ یہ پاسپورٹ جعلی ہے۔ وقار اندر سے ضرور ڈر رہا تھا کہ کہیں لنکا کی سرزمین پر معاملہ خراب نہ ہو جائے۔ اگر واقعی کسٹم والوں کو پتہ چل گیا کہ شبانہ کا پاسپورٹ جعلی ہے تو بڑی مشکل ہو جائے گی لیکن وقار ہر حالت میں پاکستانی لڑکی شبانہ کو اس کی منزل تک پہنچانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنا سفر شروع کر دیا۔ مدراس سنٹرل کی بجائے وہ مدراس کے دوسرے بڑے اسٹیشن ایگمور سے شام کو ٹرین میں سوار ہوئے اور ٹرین ٹھیک سات بجے شام ایگمور اسٹیشن سے نکل کر دھنش کوڈی کی طرف روانہ ہو گئی۔ جن لوگوں نے یہ سفر کیا ہے وہ جانتے ہوں گے کہ یہ پوری ایک رات اور ایک دن کا سفر ہے۔ انڈیا کے نقشے پر نگاہ ڈالیں تو نیچے اس کی تکون کے مشرق کی طرف جانا ہوتا ہے۔ یہاں سے بحری جہاز میں سوار ہو کر مسافر سمندر میں پون گھنٹے کا سفر کرنے کے بعد سیلون یا سری لنکا کے ساحل پر پہنچتے ہیں۔ سری لنکا کی اس رخ کی بندرگاہ کا نام ٹالی منار ہے۔ یہ وہی بندرگاہ ہے جس کا آج کل اخباروں میں بڑا نام آتا ہے۔ یہ تامل گوریلوں کی سرگرمیوں کا دوسرا بڑا مرکز ہے۔ پہلا مرکز جافنا اس ساحلی بندرگاہ سے اوپر شمال کی جانب ہے۔ مگر اس زمانے میں یہاں بالکل امن و امان تھا۔ ساری رات اور سارا دن شبانہ ٹرین میں سفر کرتی رہی۔ دوپہر تک ہرے بھرے کیلے کے باغ اور ناریل کے جھنڈ ٹرین کے ساتھ ساتھ رہے لیکن جوں جوں انڈیا کی جنوبی تکون قریب آتی گئی علاقہ ریتیلا ہوتا گیا۔ دونوں جانب سے سمندر ایک دوسرے سے ملنے کے لیے قریب آ رہے تھے۔ اب کہیں کہیں ناریل اور تاڑ کے جھنڈ نظر آتے تھے چھوٹے چھوٹے اسٹیشن بالکل ویران ہوتے۔ گرمی بھی یہاں زیادہ تھی۔ ہوا میں ریت ملی ہوئی تھی۔ ٹرین سہ پہر کے بعد منڈاپم کیمپ کے اسٹیشن پر آ کر رک گئی۔ وقار نے شبانہ کو بتایا کہ یہاں ٹیکے لگیں گے۔ وہ اسے لے کر ایک شیڈ کے نیچے آ کر لنکا جانے والے دوسرے مسافروں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دھوپ میں شیڈ کے ٹین کی چھت گرم ہو رہی تھی۔ شبانہ کا حلق سوکھنے لگا۔ وقار نے بڑی مشکل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے پانی کا بندوبست کیا۔ ناٹے قد کا کالا ڈاکٹر مسافروں کو بڑی بے دردی سے ٹیکے لگائے جا رہا تھا۔ اس کام میں ایک گھنٹہ صرف ہوگیا۔ پانچ بج چکے تھے۔ جب ٹرین منڈاپم کیمپ نامی ریلوے اسٹیشن سے ریتلا کوڈی کی طرف روانہ ہوئی۔ منڈاپم کیمپ وہی اسٹیشن ہے جہاں آج کل لنکا سے آنے والے تامل مہاجروں کا کیمپ لگایا گیا ہے۔ بھارت کی فوجوں کے لنکا میں داخل ہونے کے بعد یہ مہاجر اب اس کیمپ سے واپس لنکا جانے شروع ہو گئے ہیں۔ علاقہ سارے کا سارا... ریتلا ہو گیا تھا۔ کہیں کہیں دور سمندری پانی کے گہرے سبز رنگ کے ٹاپو نظر آنے لگے تھے۔ سورج پوری طرح غروب نہیں ہوا تھا کہ ٹرین آدم برج پر سے گزرنے لگی۔ یہ پل سمندری چٹانوں کے اوپر بنایا گیا ہے اور اس کا نام آدم برج ہے۔ اب اس کا نام بھارتی حکومت نے تبدیل کر دیا ہے۔ شبانہ نے دیکھا کہ ٹرین کی دونوں جانب گہرا نیلا سمندر ہی سمندر تھا۔ ٹرین بڑی بڑی چٹانوں کے اوپر بنے ہوئے پل پر سے گزر رہی تھی۔ دور دور سے سمندر کی نیلی موجیں آ کر چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ان لہروں کے چھینٹوں کی پھوار ٹرین کی کھڑکی تک آتی تھی۔ شبانہ کے لیے یہ ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔

شام کے چراغ روشن ہو گئے تھے جب ٹرین دھنش کوڈی پہنچ گئی۔ یہ ایک لمبا پلیٹ فارم تھا جس کی دوسری جانب گودی میں ایک بحری جہاز کھڑا تھا۔ بحری جہاز زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کی بتیوں کا روشن عکس سمندر میں پڑ رہا تھا۔ لنکا جانے والے مسافروں کی قطار بن گئی۔ گودی میں کسٹم والے میز کرسیاں لگائے کاغذات چیک کر کے مہریں لگا لگا کر مسافروں کو جہاز کی طرف بھیج دیتے۔ وقار کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ کوئی مصیبت نہ بن جائے۔ شبانہ بہت خوش تھی کہ ہندوستان سے اس کو نجات مل رہی ہے اور اب وہ بڑی آسانی سے پاکستان واپس جا سکے گی۔ اسے بالکل خبر نہیں تھی کہ اس کے ہاتھ میں جو پاسپورٹ ہے وہ جعلی ہے اور اگر وہ پکڑی گئی تو اسے گرفتار کر لیا جائے گا۔ وقار کی باری آئی اس کے کاغذات اصلی تھے۔ اسے اپنی بالکل فکر نہیں تھی... پریشانی اسے شبانہ کی تھی جو اس کے پیچھے پیچھے قطار میں چلی آ رہی تھی۔ ناٹے قد کا مدراسی جیٹی آفیسر ہر مسافر کے کاغذات دیکھنے کے بعد مہر لگاتا اور اسے جہاز کی طرف جانے کی اجازت دے دیتا۔ آخر وقار کی باری بھی آ گئی۔ اس کے کاغذات اصلی اور درست تھے۔ مدراسی آفیسر نے اس کے

کاغذات پر مہر لگائی اور اسے گزر جانے دیا۔ اب شبانہ کی باری تھی۔

وقار دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہیں ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ مدراسی جیٹی آفیسر نے شبانہ کی طرف دیکھے بغیر اس کے پاسپورٹ کو دیکھا۔ اس کے ورق الٹے۔ ایک جگہ رک کر غور سے پاسپورٹ پر لگی ہوئی انڈین گورنمنٹ کی مہر کو دیکھنے لگا۔ وقار کا دل زور سے دھڑکا۔ کم بخت کو کہیں شک تو نہیں ہو گیا؟ اس نے سوچا۔ مدراسی جیٹی آفیسر نے اب شبانہ کی طرف چہرہ اٹھا کر دیکھا اور انگریزی میں پوچھا۔

"یہ پاسپورٹ تم نے کہاں سے بنوایا تھا؟"

اس سے پہلے کہ شبانہ کوئی جواب دیتی وقار نے آگے بڑھ کر تامل میں کہا "سر یہ میری چھوٹی بہن ہے اس کا پاسپورٹ میں نے بنوایا تھا حیدر آباد سے۔"

مدراسی آفیسر نے کہا "یہ پاسپورٹ جعلی ہے۔ ہمیں بتاؤ یہ کس نے تیار کیا ہے۔ ہم اس گروہ کی تلاش میں ہیں۔"

شبانہ کا رنگ زرد ہو گیا۔ وقار نے مزید وضاحت کرنے کی کوشش کی جو جیٹی آفیسر نے غصے میں کہا "تم دھوکے بازوں کے ساتھی۔ ہم تم دونوں کو گرفتار کرتے ہیں۔" اس نے پولیس کو اشارہ کیا۔ جیٹی پر پولیس موجود تھی۔ اسی وقت وقار اور شبانہ کو ہتھکڑی لگا دی گئی۔ شبانہ پریشانی کے عالم میں اپنے محسن وقار کی طرف دیکھنے لگی۔ وقار نے پہلے تو بڑے اعتماد سے احتجاج کیا پھر منت سماجت کرنے لگا کہ ان کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ انھیں جعلی پاسپورٹ بنا کر دے دیا گیا ہے۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ جیٹی آفیسر نے ترش روئی سے کہا "یہ فیصلہ مدراس کی عدالت کرے گی۔ ہمارا وقت ضائع نہ کرو۔"

پولیس نے وقار اور شبانہ کو گرفتار کر کے دھنش کوڈی کی جیٹی کی حوالات میں بند کر دیا گیا۔ شبانہ اور وقار کو الگ الگ حوالات میں بند کر دیا گیا۔ شبانہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

- - ۔:۔ -

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوسرے دن شبانہ اور وقار کو دھنش کوڈی سے پولیس ساتھ لے کر مدراس کی طرف روانہ ہو گئی۔ وقار نے صاف صاف پولیس کو کارگل کا نام بتا دیا تھا جس نے شبانہ کا پاسپورٹ بنایا تھا۔ مدراس پہنچ کر پولیس نے کارگل کے دفتر پر چھاپا مارا۔ کارگل ایک بار پھر گرفتار ہو گیا۔ شبانہ کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ عدالت نے شبانہ اور وقار کے بیانات سننے کے بعد انھیں رہا کر دیا کیونکہ اصل مجرم کارگل گرفتار ہو چکا تھا۔ وقار نے عافیت اسی میں سمجھی کہ شبانہ کو واپس اورنگ آباد لے جا کر اپنے گورکن ماموں کے حوالے کر دے چنانچہ ایک ہفتے بعد شبانہ ایک بار پھر نیک دل بوڑھے گورکن کے پاس بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ نیک دل گورکن نے اسے تسلی دی اور کہا۔

"بیٹی! خدا کو یہی منظور تھا۔ تم آنسو نہ بہاؤ میں تمھیں پاکستان بھجوانے کا کوئی دوسرا بندوبست کرنے کی کوشش کروں گا۔"

چونکہ دل رس بانو کے مقبرے والی کٹیا میں اب شبانہ کو رکھنا مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ بوڑھا گورکن اسے اورنگ آباد شہر میں اپنی چھوٹی بیوہ بہن کے گھر میں لے آیا۔ بہن کو گورکن نے ساری بات بتا دی تھی۔ وہ بڑی خدا ترس بیوہ خاتون تھی۔ اس کی اولاد بھی کوئی نہیں تھی۔ اس نے شبانہ کو بڑی خوشی سے اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دے دی۔ اورنگ آباد کسی زمانے میں حیدر آباد دکن کا ایک بڑا شہر تھا۔ آجکل اسے مہاراشٹر میں شامل کر لیا گیا۔ اورنگ آباد کی فوجی چھاؤنی میں ماڈرن بلڈنگیں اور بلند عمارتیں تھیں۔ اورنگ آباد کا پرانا شہر کافی گنجان آباد تھا اور اس کی آبادی پچاس ساٹھ لاکھ سے کم نہیں تھی۔ گنجان آباد شہر کی گلیاں اور مکانات تقریباً سو سال پرانے تھے۔ شہر کے کونے والی بستی کی ایک تنگ اونچی نیچی گلی میں بوڑھے گورکن کی بیوہ بہن

کا مکان تھا۔ دو کوٹھڑیوں والے اس پتھروں سے بنے ہوئے پرانے مکان کے اندر ایک چھوٹا سا صحن بھی تھا جس میں نیم کا گھنا درخت تھا۔ شبانہ نے گھر کے کام کاج میں بیوہ عورت کا جس کا نام حسن آرا بی بی تھا۔ ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ محلے میں بہت جلد عورتوں کو پتہ چل گیا کہ بیوہ حسن آرا بی بی کے گھر ایک گوری چٹی لڑکی آ کر رہنے لگی ہے۔ حسن آرا بی بی نے ہمسائیوں کو یہی بتایا کہ یہ لڑکی اس کی ایک دور پار کی رشتے دار خاتون کی بیٹی ہے جس کا اب دنیا میں سوائے ان کے اور کوئی نہیں ہے اس لیے وہ اس کے پاس آ گئی ہے مگر عورتوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ حسن آرا بی بی نے ایک روز اپنے گورکن بھائی کو اس کا ذکر کیا تو وہ بولا۔

"شبانہ بیٹی کو تم گھر سے باہر مت جانے دینا۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ اسے کسی کے ساتھ پنجاب روانہ کر دوں تا کہ وہ بارڈر کراس کر کے پاکستان پہنچ سکے۔"

حسن آرا بی بی نے کہا "یہ اکیلی لڑکی بارڈر کراس کیسے کرے گی؟ اور پھر تمھارا ایسا کون جاننے والا ہے یہاں؟"

گورکن بولا "قبرستان کے قریب ایک پنجابی ملک صاحب کا لکڑی کا ٹال ہے۔ ان کے پاس مالیر کوٹلہ سے ان کے ملنے والے اکثر آتے جاتے ہیں۔ یہ وہ پنجابی مسلمان ہیں جو پاکستان بننے کے بعد ہندوستان سے پاکستان نہیں گئے تھے بلکہ ریاست مالیر کوٹلہ میں ہی رہ رہے تھے۔ میں ان سے بات کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے ملک صاحب اس سلسلے میں میری کوئی مدد کریں۔"

دوسرے ہی دن بوڑھے گورکن نے ٹال کے مالک ملک صاحب سے شبانہ کی بات کر دی ملک صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ کہنے لگے

"یہ بڑی ذمہ داری کا کام ہے رمزی بابا لیکن بچی کو اس کے ماں باپ کے پاس پاکستان ضرور پہنچانا چاہیے۔ دو ایک دن میں میرا دوست پنجاب سے آ رہا ہے اس کی ایسے لوگوں سے دوستی ہے جو بارڈر پر لین دین کا کام کرتے ہیں۔ میں اس سے بات کروں گا۔"

دو دن بعد ملک صاحب کا دوست مالیر کوٹلہ سے اورنگ آباد ان کے پاس آیا تو ملک صاحب نے ایک پاکستانی لڑکی کو بارڈر کراس کروانے کے بارے میں اس سے کھل کر بات کر دی ملک صاحب کے دوست کا نام کمال دین تھا۔ کمال دین نے کہا "ملک! اگر تم اس لڑکی کو ضرور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پاکستان پہنچانا چاہتے ہو تو میں اسے اپنے آدمیوں کی مدد سے بارڈر کراس کرانے کی کوشش کروں گا۔ تم اسے میرے ساتھ روانہ کر دو۔" چنانچہ ایک روز شبانہ ملک صاحب کے دوست کمال دین کے ساتھ ٹرین میں بیٹھ کر اورنگ آباد سے مالیر کوٹلہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہ اپنی قسمت پر آنسو بہا رہی تھی۔ ابھی اس کی تقدیر میں نہ جانے کتنی دربدری لکھی تھی اور خدا جانے اسے کب اپنے پیارے وطن پاکستان کی سرزمین دیکھنے کا اتفاق ہو۔ پھر بھی وہ اللہ تعالےٰ کے اس کرم پر اس کی شکرگزار تھی کہ اس کی عزت محفوظ تھی۔ مالیر کوٹلے کا کمال دین بھی انتہائی شریف النفس آدمی تھا جس نے شبانہ کو عورتوں کے ڈبے میں الگ سوار کرایا تھا اور خود ساتھ والے ڈبے میں سفر کر رہا تھا۔ ٹرین اورنگ آباد سے چل کر منماد سے ہوتی ہوئی جل گاؤں پہنچی، یہاں سے دلی، بمبئی کی مین لائن شروع ہو جاتی تھی۔ جل گاؤں سے ٹرین بھوساول پہنچی تو شبانہ کے ڈبے میں ایک پختہ عمر کی عورت داخل ہوئی جس نے بڑا زیور پہن رکھا تھا۔ اس نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ شبانہ اس علاقے کی نہیں ہے وہ شبانہ کے قریب آکر بیٹھ گئی اور اس سے باتیں شروع کر دیں۔ شبانہ کو اس عورت پر ذرا سا شک بھی نہ ہوا کہ وہ دوسری قسم کی عورت ہے۔ اس عورت نے اپنا نام شکیلہ بتایا اور کہا کہ وہ بھوپال جا رہی ہے جہاں اس کا بہت بڑا زنانہ اسٹور ہے۔ شکیلہ نے شبانہ کو تھرماس میں سے چائے نکال کر پلائی اور پوچھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟ اور کیا اکیلی سفر کر رہی ہے؟ شبانہ نے کہا۔

"میرا بھائی میرے ساتھ سفر کر رہا ہے وہ دوسرے ڈبے میں ہے ہم مالیر کوٹلہ کے رہنے والے ہیں اور وہیں جا رہے ہیں۔"

شکیلہ نے اپنی باتوں سے شبانہ کو بہت جلد اپنی سہیلی بنا لیا اور کہا کہ مالیر کوٹلہ سے پھر کبھی اورنگ آباد آنا ہو تو بھوپال اس کے گھر ضرور آئے۔ درمیان میں کسی جگہ گاڑی رکتی تو کمال دین شبانہ کی خیر خیریت دریافت کرنے آجاتا۔ چائے پانی کا پوچھتا اور ٹرین کے چلنے سے پہلے اپنے ڈبے میں چلا جاتا۔

گاڑی تیز رفتاری سے اڑی جا رہی تھی۔ کھنڈوہ پہنچ کر ٹرین رک گئی۔ کافی بڑا اسٹیشن تھا۔ گاڑی یہاں دس پندرہ منٹ رکی رہی۔ یہاں سے چلی تو آگے دوسرا بڑا اسٹیشن اٹارسی تھا۔

کھنڈوہ سے اٹارسی تک کافی لمبا رن ہے۔ اب پکی عمر کی پُراسرار عورت نے اپنے منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ جب ٹرین اٹارسی شہر کے مضافات میں سے گزرنے لگی۔ پراسرار عورت شکیلہ نے اپنے پاندان میں سے خاص طور پر دو پان نکالے ایک پان خود کھایا اور ایک شبانہ کو پیش کیا۔ شبانہ پان نہیں کھاتی تھی لیکن اس عورت نے شبانہ پر اپنی محبت اور خلوص کا اس قدر اثر کر رکھا تھا کہ اس نے پان لے کر کھا لیا۔ ٹرین اٹارسی کے ریلوے یارڈ میں سے گزر رہی تھی کہ شبانہ کا سر چکرانے لگا۔ اس نے شکیلہ سے کہا کہ میرا سر چکرا رہا ہے شکیلہ نے جلدی سے تھرماس میں سے پانی نکال کر دیا اور کہا "سفر میں ایسا ہو جایا کرتا ہے۔ لو یہ پانی پی لو۔"

شبانہ نے پانی پیا تو اسے کچھ آفاقہ محسوس ہوا۔ لیکن چند سیکنڈ بعد ہی اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا، وہ بے ہوش ہو گئی۔ عیار شکیلہ نے شبانہ کا سر اپنے زانو پر رکھا اور اسے ہوا دیتے ہوئے دوسری مسافر عورتوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"گرمی سے سر چکرا گیا ہے۔ ابھی ہوش میں آجائے گی۔"

لیکن اس مکّار عورت نے پان میں جو خاص دوائی شبانہ کو کھلا دی تھی اس کا اثر شدید تھا اور شکیلہ کے اندازے کے مطابق اسے کم از کم چار گھنٹوں تک ہوش میں نہیں آنا تھا۔ ٹرین اٹارسی کے جنکشن پر رک گئی۔ کمال دین ڈبے میں سے اتر کر شبانہ کے ڈبے کی طرف آیا شکیلہ اسے شکل سے پہچانتی تھی۔ اس نے کمال دین کو دیکھتے ہی شور مچا دیا۔

"بھائی جان! بچی گرمی کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی ہے۔ مگر آپ فکر نہ کریں۔ یہاں اسٹیشن کے ہیلتھ سنٹر میں میرا ایک ڈاکٹر واقف ہے۔ ہم اسے اس کے پاس لیے چلتے ہیں ابھی ہوش میں آجائے گی گھبرائیں نہیں ٹرین یہاں کافی دیر رکتی ہے۔"

کمال دین نے شبانہ کو بے ہوش دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ مگر شکیلہ کی باتوں نے اسے حوصلہ دیا۔ بڑی مشکل سے بے ہوش شبانہ کو ڈبے سے باہر نکال کر ایک اسٹریچر پر ڈالا اور شکیلہ اسے لے کر اسٹیشن کے "ہیلتھ سنٹر" میں لے آئی، حقیقت میں یہ ہیلتھ سنٹر نہیں بلکہ فرسٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کلاس کا زنانہ ویٹنگ روم تھا جس کا پچھلا دروازہ ریلوے اسٹیشن کے عقبی یارڈ کی طرف کھلتا تھا۔ بھوپال اور اٹارسی قریب قریب واقع تھے اور شکیلہ یہاں آتی جاتی رہتی تھی۔ وہ بھوپال کی رہنے والی تھی اور اٹارسی شہر کی ایک ایک گلی سے واقف تھی۔ اس نے کمال دین کی باتوں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں ہے اور سیدھا سادھا بھی ہے اسی لیے زنانہ ویٹنگ روم کو اس نے ریلوے کا ہیلتھ سنٹر ظاہر کیا اور شبانہ کو ویٹنگ روم میں لٹا دیا۔ شبانہ بے ہوش تھی، کمال دین باہر بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ شکیلہ نے باہر آکر اسے بتایا کہ اندر لیڈی ڈاکٹر بچی کو دیکھ رہی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں اسے ہوش آ جائے گا۔ شکیلہ فوراً ویٹنگ روم میں آ گئی۔ فرسٹ کلاس زنانہ ویٹنگ روم اس زمانے میں اکثر خالی ہوا کرتے تھے۔ یہ ویٹنگ روم بھی خالی تھا۔ اندر آتے ہی شکیلہ نے بڑی احتیاط اور آہستگی سے دروازے کی چٹخنی لگا دی۔ تیزی سے عقبی دروازے کو کھولا اور باہر یارڈ میں آکر اس طرف گئی جہاں دو تین ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ اس نے ایک ٹیکسی والے سے کہا کہ میری بچی اچانک بیہوش ہو گئی ہے۔ میں اسے اٹارسی کے بڑے ہسپتال لے جانا چاہتی ہوں۔ ٹیکسی ڈرائیور شریف آدمی تھا فوراً ٹیکسی لے کر ویٹنگ روم کے عقبی دروازے کے سامنے آ گیا۔ شکیلہ نے اس کی مدد سے شبانہ کو ٹیکسی میں ڈالا اور ٹیکسی اٹارسی کے جنرل ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئی۔ شکیلہ اس شہر سے پوری طرح واقف تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اپنے منصوبے کے مطابق اسے کیا کرنا ہے۔

ٹیکسی جب اٹارسی کے جنرل ہسپتال والی سڑک پر آئی تو شکیلہ نے ڈرائیور سے کہا۔

"یہاں سے بائیں طرف پہلی سڑک پر مڑ جانا، وہاں میری بہن کا گھر ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ بچی کو پہلے وہاں لے چلوں، وہ ڈاکٹر ہے۔ شاید گھر پر ہی بچی کو ہوش آ جائے۔"

ٹیکسی ڈرائیور کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا اس نے پہلے موڑ پر جا کر گاڑی بائیں جانب موڑ لی۔ یہاں ایک طرف چھوٹی چھوٹی کوٹھیوں کی قطار تھی اور سامنے کی جانب پریڈ گراؤنڈ تھا۔ شکیلہ نے ٹیکسی ایک کوٹھی کے اندر لے جا کر رکوائی اور بولی۔

"میں اپنی بہن کو لے آؤں۔ تم اسی جگہ ٹھہرو۔"

اس چھوٹی سی کوٹھی میں شکیلہ کا ایک مرد ساتھی جبرو دو ہفتے پہلے آکر رہنے لگا تھا۔ جبرو

منشیات کا کاروبار کرتا تھا اور تھوڑے دنوں کے لیے کسی شہر میں جا کر کوٹھی کرائے پر لیتا اور پھر اپنا مال ٹھکانے لگانے کے بعد وہاں سے چلا جاتا تھا۔ شکیلہ کا وہ خاص آدمی تھا اور شکیلہ کو معلوم تھا کہ جبرو نے دو ہفتے پہلے اس شہر کی یہ کوٹھی کرائے پر لے رکھی ہے۔ جبرو اس وقت کوٹھی میں موجود تھا اور اکیلا تھا۔

شکیلہ کو دیکھ کر حیرانی سے پوچھا: "تم اس وقت کیسے آئیں؟"

شکیلہ نے کہا

"یہ باتیں بعد میں ہوں گی۔ باہر ٹیکسی میں ایک لڑکی بے ہوش پڑی ہے اسے اندر لے آؤ۔"

جبرو سمجھ گیا کہ لڑکی کو کس لیے بیہوش کیا گیا ہے۔ فوراً شکیلہ کے ساتھ باہر آیا۔ ٹیکسی کا دروازہ کھول کر بولا: "بچی تو بے ہوش ہے اللہ اپنا فضل کرے۔ ابھی ڈاکٹر صاحب کو بلاتا ہوں اسے اندر لے چلیں۔"

ہٹے کٹے جبرو نے بیہوش شبانہ کو کاندھے پر ڈالا اور کوٹھی کے ڈرائینگ روم کی طرف بڑھا شکیلہ نے ٹیکسی والے کو پچاس روپے دے دیئے وہ خوش ہو گیا اور سلام کر کے چل دیا۔ ڈرائینگ روم آتے ہی شکیلہ نے جبرو سے کہا "پولیس ضرور تفتیش کرے گی اس کے ساتھ ٹرین میں اس کا ایک بھائی بند بھی سفر کر رہا تھا۔"

پھر شکیلہ نے جلدی جلدی جبرو کو سارا قصّہ سنا دیا۔ وہ کہنے لگا میرا یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ مال میں نے رات کو ہی پورے کا پورا سپلائی کر دیا تھا اب میں یہاں اکیلا ہی پڑا تھا۔ مجھے کل یہ کوٹھی خالی کر ہی دینی تھی۔ ہم ابھی خالی کیے دیتے ہیں کیونکہ پولیس ٹیکسی والے کی مدد سے یہاں پہنچ سکتی ہے۔

جبرو لپک کر باہر گیا۔ وہاں سے تھوڑی دور گراؤنڈ کے دروازے کی ایک جانب اس کی بند جیپ کھڑی تھی۔ جیپ لے کر کوٹھی میں آ گیا۔ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ انھوں نے بے ہوش شبانہ کو بند جیپ میں ڈال دیا۔ جبرو نے کوٹھی میں جا کر اپنے کپڑوں کا سوٹ کیس اور دوسری چند ایک چیزیں اٹھا کر جیپ میں رکھیں۔ چابی وہیں صحن میں ڈال دی اور شکیلہ کو ساتھ بٹھا کر اٹارسی شہر کی سڑکوں پر سے گزرتا ہوا بھوپال جانے والی سڑک پر آ گیا۔ یہ بڑی شاہراہ تھی۔ اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جیپ کی رفتار تیز کر دی اور دیکھتے دیکھتے جیپ بھوپال والی سڑک پر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

دوسری طرف سیدھا سادھا کمال لیڈیز ویٹنگ روم کے باہر کچھ دیر بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ ادھر ٹرین کا سگنل ڈاؤن ہو گیا۔ کمال دین نے ویٹنگ روم کا دروازہ کھٹکھٹایا دروازہ اندر سے بند تھا۔ انجن نے وسل دے دی۔ کمال دین نے ایک ٹی ٹی سے کہا کہ اندر میری بہن ہے دروازہ نہیں کھلتا۔ ٹی ٹی نے ایک قلی کو دوڑایا دوسری طرف سے دروازہ کھول دیا گیا۔ ویٹنگ روم خالی تھا۔ کمال دین پریشان ہو گیا۔ گارڈ نے سیٹی بجادی۔ ٹرین چلنے والی تھی۔ کمال دین کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ ٹرین آہستہ آہستہ کھسکنے لگی۔ کمال دین گھبرا کر ٹرین کی طرف دوڑا اور ڈبے میں سوار ہو گیا۔ اس نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کر دیا کہ لڑکی پاکستانی تھی اسے بارڈر کراس کرانا تھا۔ ہو سکتا ہے اس لڑکی کا تعلق اسمگلروں کے کسی خطرناک گروہ سے ہو اور وہ ان کے ساتھ چلی گئی ہو۔ ایک طرح سے کمال دین نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ کسی مصیبت میں پھنسنے سے بال بال بچ گیا ہے۔

رات کے دس بج رہے تھے جب شکیلہ کی جیپ شہر بھوپال میں داخل ہو گئی۔ شکیلہ اس شہر کی دوسری بکھی بائی تھی۔ اس کا باقاعدہ یہاں کوئی کوٹھا تو نہیں تھا لیکن بھوپال شہر کے بازارِ حسن میں کوئی ایسا کوٹھا نہیں تھا جہاں اس کی کوئی رقاصہ، رقص نہ کرتی ہو۔ شکیلہ نے ان میں سے زیادہ تر لڑکیوں کو یا تو اغوا کیا تھا یا پھر ریاست میں گھوم پھر کر غربت کے مارے ہوئے ماں باپ کو روپے کا لالچ دے کر ان کی بچیوں کی شادی اپنے کسی آدمی سے کروا دی تھی اور اس کے بعد اسے رقص و سرور کی باقاعدہ تربیت دے کر بازارِ حسن کی زینت بنا دیا تھا۔

شبانہ کو بھی وہ بازارِ حسن کی زینت بنانے کے لیے ہی اغوا کر کے لا رہی تھی۔ بھوپال ایک وسیع و عریض شہر تھا کبھی یہ ایک ذی شان اسلامی ریاست کا دارالحکومت رہ چکا تھا۔ قلعے کی چہار دیواری میں شاہی محلات ایستادہ تھے۔ اور اونچی نیچی گلیوں میں عالی شان قدیم حویلیاں آج بھی زبانِ حال سے عہدِ پارینہ کی داستانیں سناتی تھی۔ شکیلہ نے شہر سے دور مضافاتی بستی میں ریلوے لائن کے پار ایک پرانے ویران تالاب کے پاس ویران باغ میں کوٹھی خرید رکھی تھی

اور اسی جگہ رہتی تھی۔ پہلوان ٹائپ کے چار یا پانچ نوکر اس کی حفاظت کے لیے ہر وقت کوٹھی میں موجود رہتے تھے۔ لوگوں کو دکھانے کے لیے اس نے کوٹھی سے کچھ فاصلے پر بھوپال زنانہ اسٹور کے نام سے صرف عورتوں کے واسطے منیاری کا ایک باپردہ اسٹور کھول رکھا تھا۔ یہ مقام اس کے لیے ایک ٹکسال کی حیثیت بھی رکھتی تھی۔ یہاں وہ ایسی لڑکیوں کو اپنے جنگل میں پھانسنے کی کوشش بھی کرتی جو محبت میں بدنام ہو جانے کے خوف سے خودکشی کرنے والی ہوتیں۔ شکیلہ ان سے چکنی چپڑی باتیں کرتی اور انھیں بہلا پھسلا کر اپنے دام میں پھنسا لیتی اور پھر انھیں بھوپال کی بجائے انڈیا کے کسی دوسرے شہر میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعے بھجوا دیتی۔ اس انسانیت سوز کاروبار کو وہ عرصہ پندرہ بیس برس سے چلا رہی تھی۔ پولیس کو اس نے اپنے ساتھ ملا رکھا تھا اور انھیں باقاعدہ ماہانہ ادا کرتی تھی۔

جیپ اسی ویران باغ والی کوٹھی کی طرف جا رہی تھی۔

رات گہری ہو رہی تھی۔ بھوپال شہر کی عمارتیں اور محلے بجلی کی روشنیوں میں جگمگا رہے تھے۔ جس علاقے میں شکیلہ کی کوٹھی تھی ادھر زیادہ روشنی نہیں تھی۔ یہ نسبتاً غیر آباد علاقہ تھا جیپ کوٹھی کے باغ میں داخل ہو کر محرابی دروازے والے برآمدے کے سامنے جا کر رک گئی۔ شکیلہ کے محافظ نوکر اور نوکرانی فوراً باہر آ گئے۔ انھوں نے بے ہوش شبانہ کو کوٹھی کے تہہ خانے میں لے جا کر بستر پر لٹا دیا۔ جبرو بھی شکیلہ کے ساتھ ہی تھا۔ اب انھوں نے شبانہ کو ہوش میں لانے کی تدابیر شروع کر دیں۔ لیکن پان میں بے ہوشی کی خوراک کچھ زیادہ ہی کھلا دی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے شبانہ کو ہوش نہیں آ رہا تھا۔

جبرو نے کہا کہیں یہ مر ہی نہ جائے۔ بڑا نقصان ہو جائے گا۔ لڑکی خوبصورت ہے۔ گوری چٹی ہے۔ اس کے بڑے دام ملیں گے۔ شکیلہ کو بھی فکر پڑ گئی۔ شہر میں اس کی ایک ہندو لیڈی ڈاکٹر سہیلی تھی۔ اسے شکیلہ کے گھناؤنے کاروبار کا علم تھا اور وہ بھی شکیلہ سے ماہانہ وصول کرتی تھی اور ہر موقع پر شکیلہ کے کام آتی تھی۔ شکیلہ نے نوکرانی بھیج کر ہندو لیڈی ڈاکٹر کو کوٹھی پر بلوا لیا۔ اس لیڈی ڈاکٹر کا نام سوشیلا پنڈت تھا۔ ڈھلتی عمر کی عورت تھی۔ آنکھوں میں حلقے پڑے تھے۔ اس نے آتے ہی شبانہ کا معائنہ کیا اور آلہ کان سے الگ کرتے ہوئے بولی۔

"شکیلہ جی! یہ تم نے اسے کیا کھلا دیا تھا۔ ڈوز زیادہ اس کے اندر چلی گئی ہے۔ اس کا پیٹ فوراً صاف کرنا پڑے گا۔ نہیں تو اس کی جان جانے کا خطرہ ہے۔ اسے دوسرے کمرے میں لے چلو۔"

دوسرے کمرے میں لے جاتے ہی لیڈی ڈاکٹر نے شبانہ کو انجکشن دیا اور اس کے معدے کی صفائی شروع کر دی۔ شبانہ کا معدہ تو صاف ہو گیا مگر اسے ہوش ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ساری رات لیڈی ڈاکٹر سوشیلا بھی وہیں کوٹھی پر موجود رہی۔ رات ایک بجے کے بعد جا کر شبانہ کو ہوش آیا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ دائرے نمودار ہو گئے تھے۔ اس نے آنکھیں کھولے بغیر کمزور آواز میں پوچھا۔

"میں کہاں ہوں؟"

شکیلہ نے بڑی ملائمت سے کہا۔

"بیٹی تو میرے پاس ہے۔ اب تو بالکل ٹھیک ہے۔ تجھے ہیضہ ہو گیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اللہ نے تیری جان بچا لی۔"

شبانہ نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں بتی روشن تھی۔ اسے سامنے دیوار پر ہندوستانی ایکٹریسوں کی نیم عریاں تصویریں لگیں نظر آئیں۔ پھر اس نے اس عورت کو دیکھا جو ٹرین میں اس کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ یہ شکیلہ تھی۔ شکیلہ نے شبانہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بیٹی شبانہ! تو ٹرین میں ایک دم بے ہوش ہو گئی۔ تیرا آدمی تو تجھے ٹرین میں ہی چھوڑ کر بھاگ گیا، میں تجھے بڑی مشکل سے اٹھا کر یہاں اپنے مکان پہ لائی۔ یہاں لیڈی ڈاکٹر نے تیرا علاج کیا۔ اب تو فکر نہ کر سب ٹھیک ہو گیا ہے۔"

لیڈی ڈاکٹر سوشیلا پنڈت نے شکیلہ کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا "ہاں بیٹی! میں نے ہی تیرا علاج کیا ہے ابھی تجھ میں کمزوری بہت زیادہ ہے۔ چند روز یہاں آرام کرنے کے بعد تیری طاقت واپس آ جائے گی۔"

شکیلہ جلدی سے بولی۔

"پھر میں تمھیں خود تیرے گھر مالیر کوٹلہ چھوڑ آؤں گی۔ اب تو آرام کر۔ زیادہ بولنا تیرے لیے اچھا نہیں۔"

شکیلہ نے لیڈی ڈاکٹر سوشیلا کو ساتھ لیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد شبانہ نے سر اٹھانا چاہا لیکن اس کا سر پتھر بن گیا تھا۔ اسے ہلاتے ہوئے گردن میں درد ہونے لگا۔ شبانہ نے آنکھیں کھول کر کمرے کے ماحول کو دیکھا۔ یہ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ وہ پلنگ پر پڑی تھی۔ چھت پر لگا ہوا پنکھا ہلکی رفتار سے چل رہا تھا دیواروں پر فلمی ایکٹریسوں کی واہیات قسم کی تصویریں لگی تھیں۔ فرش پر قالین بچھا تھا۔ کونے میں اگلدان رکھا تھا۔ اسٹول پر ہاتھ دھلانے والی سلفچی پڑی تھی۔ شبانہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہونے کے بعد یہاں کیسے آ گئی۔ یہ عورت جو اپنا نام شکیلہ بتاتی تھی آخر اسے یہاں کیوں لے آئی؟ کمال دین اسے چھوڑ کر کیوں چلا گیا؟ نہیں نہیں۔ کمال بھائی اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ معاملہ خراب ہے۔ دال میں کچھ کالا ہے۔ شکیلہ اسے خود بے ہوش کر کے یہاں لے آئی ہے۔ اب شبانہ کو یاد آ گیا کہ شکیلہ نے اسے جو پان کھانے کو دیا تھا اسے کھانے کے بعد چکر آئے تھے۔ پھر وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ شکیلہ وہاں سے کسی طرح اسے اٹھا کر یہاں لے آئی ہے۔ یہ کونسی جگہ ہے؟ کونسا شہر ہے؟ شبانہ کا ذہن یہ سوچتے سوچتے دکھنے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور وہ سو گئی۔

جب آنکھ کھلی تو کمرے میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ شکیلہ اس کے سرہانے بیٹھی اسے یخنی پلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شبانہ کا سر اٹھا کر نوکرانی نے پیچھے تکیہ لگا دیا۔ شبانہ نے دو تین چمچ یخنی کے پیئے۔ ابھی تک اس کے جسم میں شدید کمزوری تھی اور وہ ہاتھ اوپر اٹھاتی تو وہ کانپنے لگتا تھا۔ اس نے کمزور اور نقاہت بھری آواز میں شکیلہ سے پوچھا کہ یہ کونسا شہر ہے؟

شکیلہ نے اس کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

"بیٹی خیر سے تم میرے اپنے گھر میں ہو یہ میرا بھوپال والا اپنا مکان ہے اسے اپنا گھر ہی سمجھو بیٹی۔ یہاں تمھارا ہر طرح سے خیال رکھا جائے گا۔ لیڈی ڈاکٹر صبح شام تمھیں آکر دیکھ جایا کرے گی۔ جب تم اس لائق ہو جاؤ گی کہ چل پھر سکو تو میں خود تمھیں تمھارے گھر چھوڑ آؤں گی۔"

شبانہ خاموش رہی۔ اسی شام شکیلہ نے لیڈی ڈاکٹر سوشیلا سے پوچھا کہ لڑکی کب تک صحتیاب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو جائے گی ۔کیونکہ میں ا بہت جلد اسے اپنی ڈگر پر لانے کے لیے رقص وسرور کی ٹریننگ دینا چاہتی ہوں ۔ لیڈی ڈاکٹر سوشیلا نے کہا ۔

"شکیلہ بہن! تم نے بغیر حساب کے اسے دوائی کھلا دی تھی۔تمھیں کچھ احساس نہیں رہا کر دوائی کی شدت کتنی ہے ۔میرے اندازے کے مطابق اس لڑکی کو پوری طرح صحت یاب ہونے میں کم ازکم بیس دن اور لگ جائیں گے ۔اس سے پہلے اگر تم نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی یا تشدد کیا تو اس کی موت واقع ہو جائے گی ۔میں تمھیں یہی مشورہ دوں گی کہ ابھی بیس روز تک اس لڑکی کو بالکل الگ تھلگ رہنے دو ۔کوئی اسے کچھ نہ کہے ہاں یخنی اور پھلوں کا جوس صبح و شام اسے ضرور دینا چاہیئے ۔دو دن کے بعد اسے ڈبل روٹی دینا شروع کر دوں گی ۔"

شکیلہ نے سوچا بیس دن سے کوئی فرق نہیں پڑے گا ۔لڑکی بے حد خوبصورت ہے جسم بھی بے حد خوبصورت ہے ۔اگر وہ اسے ٹریننگ دے کر بازارِ حسن کی زینت بنائے تو کم ازکم ایک لاکھ روپے اسے ضرور مل جائے گا ۔یہ سودا مہنگا نہیں تھا ۔شکیلہ نے اپنے آدمیوں اور نوکرانی کو حکم دے دیا کہ شبانہ کا ہر طرح سے خیال رکھا جائے ۔

جیرو نمیٹی جا چکا تھا ۔کوٹھی میں شکیلہ کے چاروں مشٹنڈے باڈی گارڈ غنڈے نوکر اور ایک نوکرانی موجود تھی ،شبانہ کو کوٹھی کے تہہ خانے میں منتقل کر دیا گیا ۔باہر پہرہ لگ گیا ۔اگرچہ شبانہ ابھی بستر سے اٹھ نہیں سکتی تھی اس کے باوجود شکیلہ کو اس پر بھروسہ نہیں تھا ۔

اب ہم واپس نجمی کی طرف چلتے ہیں ۔نجمی نے اپنا مشن پورا کر لیا تھا جن لوگوں نے اس کی زندگی کو برباد کیا تھا ،اس کی عزت لوٹی تھی اس کے ساتھ گھناؤنا انسانیت سوز سلوک کیا تھا ، انھیں نجمی اپنے ہاتھوں ہمیشہ کی نیند سلا چکی تھی ۔اب اسے ندیم کی تلاش تھی ۔وہ ندیم کو تلاش کر کے اس کے ساتھ واپس اپنے وطن پاکستان چلی جانا چاہتی تھی ۔یہ بات نجمی نے اپنے وفادار اور با اعتماد مسلمان ساتھی بادل کو بتا دی تھی ۔بادل نے نجمی سے کہا کہ ندیم کو ہم کہاں تلاش کریں آخری بار وہ کس شہر میں تھا ۔نجمی نے کہا "آخری بار میں نے اسے کلکتے میں ہی دیکھا تھا ۔ذکریا اسٹریٹ میں سیٹھ جبار کا امجدیہ ہوٹل ہے وہ اس کے پاس پولیس سے چھپ کر روپوش تھا ۔تم سیٹھ کے پاس جا کر ندیم کے بارے میں پوچھو کہ وہ کہاں مل سکتا ہے ۔"

بادل نے بھیس بدلا اور دوسرے ہی روز وہ کمین گاہ سے نکل کر بذریعہ ٹرین گوماہ سے کلکتے کی طرف روانہ ہو گیا ۔امجدیہ ہوٹل کوئی غیر معروف جگہ نہیں تھی ۔بادل امجدیہ ہوٹل پہنچ گیا ۔ اس نے سیٹھ جبار سے اس کی بیٹھک میں ملاقات کی اور اسے اپنا مقصد بیان کیا اور پوچھا کہ ندیم اسے کہاں مل سکے گا ؟ پہلے تو سیٹھ جبار اسے کوئی سی آئی ڈی والا سمجھا ۔لیکن جب بادل نے اسے نجمی کے بارے میں پوری تفصیل بیان کی تو سیٹھ جبار کو اس پر پورا یقین آ گیا ۔ اس نے کہا ۔

"کچھ روز پہلے میں نے اسے خاص جگہ بھجوا دیا تھا تاکہ وہ اتنی دیر تک وہاں رہے جب تک کہ بارڈر پر فوجیوں کا تناؤ ختم نہیں ہو جاتا ۔لیکن وہ وہاں سے بھی بھاگ گیا ۔اصل میں بات یہ ہے کہ وہ نجمی کو یعنی چندا کو ہر حالت میں اپنے ساتھ لے کر پاکستان جانا چاہتا ہے ۔"

بادل نے کہا "نجمی بھی یہی چاہتی ہے ۔پہلے وہ پاکستان جانے پر راضی نہیں تھی لیکن اب وہ تیار ہو چکی ہے اور چاہتی ہے کہ ندیم اسے اپنے ساتھ پاکستان لے جائے ۔کیا آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ ندیم کہاں گیا ہو گا ؟"

سیٹھ جبار نے کہا

"اس کا کچھ پتہ نہیں ہے وہ جب بھی میرے پاس سے گیا تو چندا یعنی نجمی کی تلاش میں ہی گیا ہے اب بھی میں یہی سمجھتا ہوں کہ وہ نجمی کو ہی تلاش کر رہا ہو گا ۔"

بادل بولا "یہی مشکل ہے کہ ندیم کو ہماری جگہ کا علم نہیں ہے ۔"

پھر اس نے فکر مندی سے پوچھا "کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ندیم گرفتار ہو گیا ہو کیونکہ انڈین پولیس اور فوج اس کی ٹوہ میں لگی ہوئی ہے ۔" سیٹھ جبار بولا ۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا ،اگر ندیم گرفتار کر لیا گیا ہوتا تو اخباروں میں ضرور خبر آ جاتی ۔مگر ایسا نہیں ہوا ۔اس کا مطلب ہے کہ وہ ابھی تک نجمی کی تلاش میں کسی نہ کسی علاقے میں سرگرداں ہو گا ۔"

بادل نے کہا "لیکن سیٹھ جی ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ پولیس نے ندیم کو گرفتار کر لیا ہو مگر اس گرفتاری کو ظاہر نہ کیا ہو ۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سیٹھ جبار بولا ”اس کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ ندیم پر پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام لگایا گیا ہے۔ جو وہ نہیں ہے۔ اور پولیس اور ملٹری انٹیلی جینس نہیں چاہتی ہو گی کہ اس کی گرفتاری کا اعلان کر کے اس کے نام نہاد ساتھی جاسوسوں کو خبردار ہونے یا کہیں روپوش ہونے کا موقع دیا جائے۔“

بادل گہرا سانس بھر کر بولا ”ایسی صورت میں ہمیں بھی اپنی خفیہ سرگرمیوں سے مدد لینی ہو گی۔ خیر اگر ندیم آپ کے پاس آئے تو اسے اپنے پاس ہی رکھیئے گا اسے کہہ دیجئے گا کہ نجمی اس کے ساتھ پاکستان جانے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ میں ایک ہفتے بعد دوبارہ آپ کے پاس آؤں گا۔“

بادل نے واپس کمین گاہ میں آ کر نجمی کو وہ ساری گفتگو بتا دی جو اس کے اور سیٹھ جبار کے درمیان ہوئی تھی۔ نجمی سوچ میں پڑ گئی۔ وہ کہاں چلا گیا ہے۔ وہ کہاں جا سکتا ہے۔ یہی سوال اس کے ذہن میں بار بار اٹھ رہے تھے جن کا نجمی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اب وہ خود پاکستان جانا چاہتی تھی اور ندیم اس سے دور تھا۔ اس نے بادل سے کہا۔

”بادل! اگر ندیم گرفتار نہیں ہوا تو وہ ضرور کلکتے میں کرشنا سے ملنے گیا ہو گا۔ تا کہ اس سے میرے ٹھکانے کے بارے میں معلومات حاصل کر سکے میرا خیال ہے کہ تم کرشنا سے جا کر ملو۔ مجھے یقین ہے کہ وہاں سے ندیم کا کچھ نہ کچھ پتہ ضرور مل جائے گا۔“

بادل کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ سندھی سوداگر کے بھیس میں ایک بار پھر کلکتے کی طرف چل پڑا۔ کرشنا بائی کے کوٹھے کا اسے علم تھا۔ وہ ایک رات سونا گاچی میں کرشنا بائی کے کوٹھے پر پہنچ گیا۔ کرشنا بائی نے بادل کو ایک بار نجمی کے ساتھ دیکھا ہوا تھا۔ مجرا کرتے کرتے جب اس نے بیٹھک میں بادل کو سندھی سوداگر کے بھیس میں داخل ہوتے دیکھا تو ٹھٹھک سی گئی۔ اسے شک ہوا کہ بادل آیا ہے تو نجمی یعنی چندا بھی ضرور اس کے ساتھ ہو گی۔ چندا جو ایک خونی ڈاکو بن چکی تھی بادل بھی چاندنی کے کونے میں دوسرے تماش بینوں کے پاس بیٹھ گیا۔ مجرا ختم ہو گیا۔ ایک ایک کر کے سب تماش بین چلے گئے۔ رات زیادہ ہو رہی تھی طبلے سارنگی والے اپنے ساز سمیٹنے لگے۔ ہارمونیم والے ہندو بنگالی ماسٹر نے بادل کی طرف دیکھ کر کہا۔

”سیٹھ اب تم بھی جاؤ۔ مجرا ختم ہو گیا ہے۔ بائی جی گھر جائیں گی۔“

کرشنا بائی نے ماسٹر جی سے کہا ”ماسٹر جی آپ جائیں یہ میرا اپنا آدمی ہے۔ میں اس سے کوئی بات کروں گی۔“

سارنگی، ہارمونیم اور طبلے والے وہاں سے چلے گئے۔ بادل نے کرشنا بائی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”تم نے مجھے پہچان لیا کرشنا بائی؟“

کرشنا بائی نے کہا ”ہر چہرہ ہمارے کوٹھے پر آ کر اپنی اصلیت بے نقاب کر دیتا ہے۔ اگر ہم چہرے نہ پہچانیں تو یہ دھندا کیسے چلائیں۔ تم بتاؤ کیسے آنا ہوا؟ چندا کہاں ہے؟ کیا وہ بھی تیرے ساتھ آئی ہے۔؟“

بادل نے کرشنا بائی کو ساری بات بیان کر دی۔ کرشنا بائی نے پان لگا کر بادل کو پیش کیا اور کہا۔

”ندیم پھر ادھر نہیں آیا وہ تو نجمی چندا کی تلاش میں کہیں مارا مارا پھر رہا ہو گا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ چندا اسے کیوں تڑپا رہی ہے۔ اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتی۔؟“

بادل نے مسکراتے ہوئے پان لے لیا اور بولا ”کرشنا بائی یہ دو دلوں کی باتیں ہیں۔ ہمیں کیا معلوم کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ بہر حال چندا نے مجھے تمھارے پاس ندیم کا پتہ کرنے بھیجا تھا۔“

کرشنا بائی نے کہا ”ندیم کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہو گا۔ ہاں اگر وہ میرے پاس آیا تو میں اسے ضرور کہہ دوں گی کہ چندا اس کو یاد کرتی ہے وہ اس کے پاس پہنچ جائے۔“

بادل نے سوچا کہ اس سے زیادہ کرشنا بائی سے بات نہیں کرنی چاہیئے۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور خدا حافظ کہہ کر کوٹھے سے نیچے اتر آیا۔ سونا گاچی کے علاقے سے ہی بادل نے ٹیکسی لی اور سیدھا اسٹیشن پہنچ گیا۔ پٹنہ ایکسپریس صبح نو بجے چھوٹتی تھی۔ بادل ایک سندھی سیٹھ کے لباس میں تھا۔ اس کے پاس کافی روپے بھی تھے۔ وہ فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں جا کر لیٹ گیا۔ ریلوے کے دربان کو اس نے پچاس روپے دے دیئے تھے اور تاکید کی تھی کہ اسے کوئی نہ جگائے۔ بادل سو گیا اور صبح اٹھا۔ اسی دربان کی مدد سے بادل نے فرسٹ کلاس کی ٹکٹ منگوائی اور پٹنہ ایکسپریس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں سوار ہو کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا۔

خفیہ کمین گاہ میں پہنچ کر بادل نے نجمی کو صورتحال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ کرشنا بائی بھی ندیم کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ نجمی نے سوچ کر کہا: ”ہمیں کچھ وقت انتظار کرنا ہوگا شاید ندیم اپنے آپ ادھر آ نکلے۔ اگر ایک ہفتے تک وہ نہ آیا تو میں خود اس کی تلاش میں نکلوں گی۔“

ندیم پرانے قلعے کے عقب والے کھنڈر کے تہہ خانے میں قید تھا۔ اس پر تشدد ہو رہا تھا۔ تشدد اور جسمانی اذیتیں ندیم کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ یہ ساری اذیتیں برداشت کر رہا تھا مگر زبان پر نجمی یا سیٹھ جبار کا نام نہیں لا رہا تھا۔ وہ یہ نام اپنی زبان پر لا بھی نہیں سکتا تھا۔

دوسری طرف بھوپال کے مضافات والی کوٹھی میں شبانہ ابھی تک نقاہت کے عالم میں شکیلہ بائی کے کمرے میں پڑی تھی۔ شکیلہ بائی کی سہیلی ڈاکٹر سوشیلا پنڈت ہر روز شبانہ کو دیکھنے آجاتی تھی۔ شکیلہ بائی بہت جلدی شبانہ کو اپنی لائن پر چلانا چاہتی تھی لیکن ڈاکٹر سوشیلا کی ہدایت تھی کہ اگر شبانہ کو زندہ دیکھنا چاہتی ہو تو کم از کم دس پندرہ دن تک اسے کوئی ہاتھ بھی نہ لگائے۔ شکیلہ صبر کیے بیٹھی تھی۔ وہ اتنا قیمتی مال اپنے ہاتھ سے جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ شبانہ اب اٹھ کر کمرے اور برآمدے میں تھوڑی دیر چہل قدمی کر لیتی تھی۔ مگر اسے زیادہ چلنے پھرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران نجمی کو ندیم کے ٹھکانے کا کچھ علم نہ ہو سکا ان ہی دنوں نجمی کے ایک ساتھی نے آ کر خبر دی کہ مان سنگھ ڈاکو کا بھائی ہر دیال سنگھ ڈاکو بھوپال کے جنگل میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے اور ندیم کی شکل کا ایک نوجوان اس کی قید میں ہے۔

نجمی کے لیے اتنی ہی خبر بہت تھی۔ اس نے بادل کو ساتھ لیا اور بھوپال کی طرف روانہ ہوگئی۔ بادل نے پٹھان مرد اور نجمی نے پٹھان عورت کا حلیہ بنا لیا تھا۔ نجمی نے بالوں کی لمبی لمبی مینڈھیاں بنا کر شانوں پر بکھیر لی تھیں اور پٹھانی لباس پہنا ہوا تھا۔ بادل نے کاندھے پر گٹھڑی اٹھا رکھی تھی۔ جس میں خشک میوے وغیرہ تھے۔ اس قسم کے پٹھان اپنی عورتوں کے ساتھ ہندوستان کے شہروں میں خشک میوے بیچتے اکثر نظر آتے ہیں۔ اپنے لمبے لمبے کرتوں کے اندر نجمی اور بادل

نے بھرے ہوئے ریوالور اور گولیاں چھپا رکھی تھیں۔ بادل کے پاس ایک لمبا چاقو بھی تھا۔ انہیں گوہاہ سے وایا پٹنہ سب سے پہلے بنارس پہنچنا تھا۔ وہاں سے الہ آباد کٹنی اور ساگر اور بینا نامی مین لائن کے ریلوے اسٹیشنوں سے ہوتے ہوئے بھوپال پہنچنا تھا۔ سفر لمبا تھا۔ نجمی اور بادل پٹھانی لباس میں تھرڈ کلاس میں بیٹھ گئے اور اپنا طویل سفر شروع کر دیا۔ پورا دن اور ایک رات سفر میں گزارنے کے بعد وہ دوسرے دن شام ہونے سے کچھ پہلے بھوپال پہنچ گئے۔ ان کے ہر دیال ڈاکو کی جنگل والی کمین گاہ کے بارے میں مخبر نے نجمی کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ بھوپال پہنچتے ہی بادل اور نجمی شہر سے نکل کر جنگل کی طرف چل پڑے وہ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے جنگل والی کمین گاہ میں پہنچ جانا چاہتے تھے۔ یہ جنگل شہر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بادل ان سارے جنگلوں اور ان کے آسان ترین راستوں سے واقف تھا۔ سورج ڈوبنے سے تھوڑی دیر پہلے وہ ہر دیال ڈاکو کی خفیہ کمین گاہ کے پاس پہنچ کر رک گئے۔

درختوں کے نیچے چٹانوں کی ڈھلان کے پہلو میں ڈاکوؤں کے خیمے اکھڑے جا چکے تھے کہیں کہیں بجھی ہوئی آگ میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ کچرا بکھرا پڑا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ ڈاکو اپنا بوریا بستر اٹھا کر کسی نامعلوم مقام کو چل دیئے ہیں۔ ڈاکو جب ایک جنگل سے ڈیرہ اٹھا کر چلے جاتے تھے تو کسی کو علم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس طرف گئے ہیں اور ان کا اگلا پڑاؤ کہاں ہوگا۔ ان کی تلاش میں نکلی ہوئی پولیس بھی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتی ہے یا گھات لگا کر بیٹھے ہوئے ڈاکوؤں کی گولیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہ دو تین ڈاکو، گروہ کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں تاکہ اگر سی آئی ڈی یا پولیس کے آدمی پیچھے لگے ہوں تو ان کا صفایا کیا جا سکے۔ نجمی اور بادل درختوں کے نیچے بیٹھ گئے۔ بادل نے کہا: ”یہ لوگ تو ڈیرا اٹھا کر جا چکے ہیں اب کیا کیا جائے۔؟“

نجمی کچھ دیر سوچتی رہی پھر رومال سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے بولی۔

”ہمیں رات بھوپال کے کسی معمولی سے ہوٹل میں گزارنی ہوگی۔ وہاں سے کل واپس چلے جائیں گے۔ کیونکہ ڈاکوؤں کا تعاقب کرنا بیکار ہے۔ ہم اپنے مخبران کے پیچھے بھیجیں گے۔“

نجمی اور بادل جنگل سے نکل کر بھوپال جانے والی سڑک پر آ گئے۔ یہاں کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد انہیں ایک بس مل گئی جو بھوپال جا رہی تھی۔

٭ ٭ ٭

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بس بھوپال شہر کی جگمگاتی سڑکوں پر گزر رہی تھی۔

بادل اس عظیم اسلامی روایات کے حامل شہر میں کئی بار آ چکا تھا۔ نجمی اس کے ساتھ پٹھانی لباس میں بیٹھی تھی۔ بادل نے بھی اپنا حلیہ خشک میوے اور ہینگ بیچنے والے پٹھانوں ایسا بنا رکھا تھا۔ بس کے اڈے پر اترنے کے بعد بادل نے نجمی کو ساتھ لیا اور شہر کے کونے والے علاقے میں واقع ایک معمولی سے ہوٹل آ گیا۔ یہاں انھوں نے ایک کمرہ کرائے پر لیا اور رات بسر کی۔ یہاں سے انھیں پٹنہ کی طرف بذریعہ ریل سفر کرنا تھا۔ ٹرین سوا گیارہ بجے دن بھوپال سے چلتی تھی۔ بادل اور نجمی نے یہ وقت ہوٹل کے کمرے میں ہی گزارا۔ انھیں خطرہ تھا کہ باہر نکلے تو پولیس انھیں پہچان کر گرفتار نہ کر لے۔ ساڑھے دس بجے کے قریب دونوں ہوٹل سے نکلے اور ریلوے اسٹیشن کی طرف پیدل ہی روانہ ہو گئے۔ اس علاقے میں کوئی ٹیکسی رکشا نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ سڑک کے کنارے کنارے چلے جا رہے تھے۔ نجمی نے پٹھانوں والا لمبا کرتا اور پھولی ہوئی شلوار پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں چھڑی سی تھی۔ سر پر رومال بندھا تھا جس میں سے بالوں کی مینڈھیاں نکل کر اس کے شانوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ بادل نے کاندھے سے وہ جھولا لٹکا رکھا تھا جس میں اخروٹ، کشمش اور بادام وغیرہ بھرے ہوئے تھے۔ وہ سڑک پر جا رہے تھے کہ بادل نے آہستہ سے نجمی سے کہا

"ہمارے پیچھے دو سپاہی آ رہے ہیں اس چھوٹی سڑک کی طرف مڑ جاؤ۔"

نجمی نے پیچھے گردن گھما کر بالکل نہ دیکھا اور بادل کی ہدایت کے مطابق بائیں جانب چھوٹی سڑک کی طرف گھوم گئی اس سڑک پر آتے ہی بادل نے زور سے آواز بلند کی۔

"ہو کشمش والا بادام والا اخروٹ والا لے لو کابل کا خشک میوہ۔"

ذرا آگے جا کر بادل نے گردن کھجانے کے بہانے سے ایک نظر پیچھے ڈالی اور نجمی سے کہا۔

"سپاہی ابھی تک ہمارے پیچھے ہیں۔ یہ سامنے والی کوٹھی میں چلے چلو۔"

سامنے ایک پرانے باغ میں چھوٹی سی کوٹھی تھی جس کا گیٹ کھلا تھا۔ اندر محرابی برآمدے کی ایک جانب جیپ گاڑی کھڑی تھی۔ برآمدے میں ایک آرام کرسی پر ایک عورت سر پیچھے ٹکائے نیم دراز تھی۔ بادل کا خیال تھا کہ وہ یہاں کسی بیگم صاحبہ کو کشمش بادام فروخت کرنے کے بہانے بیٹھ جائیں گے اور اگر سپاہی واقعی ان کا تعاقب کر رہے ہیں تو انھیں یقین ہو جائے گا کہ وہ خشک میوے بیچنے والے کابلی پٹھان ہیں۔ بادل نے کوٹھی میں جاتے ہی آواز لگائی۔

"بیگم صاحب کشمش لے لو۔ بادام لے لو۔ میوہ لایا ہوں کابل سے بیگم صاحب۔"

نجمی بادل کے پیچھے تھی۔ دونوں برآمدے میں آرام کرسی پر نیم دراز عورت کے قریب نیچے زمین پر بیٹھ گئے۔ بادل نے جلدی سے اپنی گٹھڑی کھول کر باداموں اور کشمش وغیرہ کی پوٹلیاں کھولنی شروع کر دیں۔ نجمی آرام کرسی پر دراز عورت کو دیکھ کر جیسے سناٹے میں آ گئی تھی۔ بادل اپنے خشک میووں کی بلند آواز میں تعریف کر رہا تھا۔ اس نے ایک نظر پیچھے ڈالی اور خوش ہو کر نجمی سے کہا۔

"سپاہی آگے نکل گئے ہیں۔ اب کوئی خطرہ نہیں۔"

لیکن نجمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ابھی تک اس عورت کو تک رہی تھی جو آرام کرسی پر سر پیچھے لگائے بیٹھی چھت کو گھور رہی تھی۔ زرد رنگ، آنکھوں میں حلقے، جسم دبلا ہو گیا تھا مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ نجمی اپنی بچپن کی سہیلی اور کالج کے زمانے کی دوست شبانہ کو نہ پہچانتی یہ شبانہ ہی تھی اور نجمی بادل اتفاق سے شکیلہ بائی کی کوٹھی میں آ گئے تھے۔ نجمی کے ہونٹوں سے اپنے آپ نکل گیا۔

"شبانہ!"

شبانہ نے چونک کر خشک میوہ بیچنے والی پٹھان عورت کی طرف دیکھا وہ حیران ہوئی کہ اس پٹھان عورت کو اس کا نام کیسے معلوم ہو گیا تھا۔ اس کی نظریں پٹھان عورت کے چہرے پر جمی تھیں۔ رنگ سانولا پڑ گیا ہے۔ چہرہ کرخت ہو گیا ہے۔ آنکھوں میں حلقے ہیں مگر آنکھوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں وہی لاہور کالج والی چمک ہے۔ یہ نجمی ہے۔ میری پیاری سہیلی میرے کالج کی ساتھی....
شبانہ کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔

"نجمی!"

دونوں سہیلیاں بے اختیار ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ بادل کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ شبانہ سسکیاں بھرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"نجمی مجھے یہاں سے نکال کر لے چلو۔ یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔"

اتنے میں کوٹھی کے عقب سے دو آدمیوں کے قہقہے لگا کر ہنسنے کی آواز آئی شبانہ نے نجمی کو جلدی سے پرے کر دیا اور بولی۔

"وہ آ رہے ہیں۔"

نجمی برآمدے سے اتر کر نیچے بادل کے پاس زمین پر بیٹھ گئی۔ بادل نے اپنی گردان شروع کر دی۔

"بیگم جی کابل سے سیدھا کاغذی بادام لایا ہے جی...."

شکیلہ بائی اس کوٹھی میں نہیں تھی۔ اس کے دونوں ہٹے کٹے غنڈے بندوقیں کاندھے پر ڈالے شبانہ کی رکھوالی کر رہے تھے۔ وہ کوٹھی کے باغ کا چکر لگا کر جب سامنے آئے تو ایک پٹھان عورت اور پٹھان مرد کو شبانہ کے سامنے بیٹھے دیکھا۔

ایک غنڈے نے وہیں سے چلّا کر کہا۔

"تم لوگ اندر کیوں آیا۔ چلو باہر چلو۔ باہر چلو۔"

بادل اور نجمی اٹھ کھڑے ہوئے۔ نجمی نے دھیمی آواز میں بادل سے کہا...." اس وقت یہاں سے چلے چلو۔"

دونوں غنڈوں نے بندوقیں ہاتھوں میں لے لی تھیں اور وہ بادل اور نجمی کو کوٹھی سے باہر نکلنے کو کہہ رہے تھے۔ بادل نے گٹھڑی باندھ کر کاندھے پر ڈالی اور تلخ لہجے میں کہا۔

"او بھائی جھگڑا کس لیے کرتا ہے۔ ہم جاتی ہے۔ خشک میوہ نہیں لینا تو نہ لو۔ بیگم صاحب کو

سلام کرنے آیا تھا۔"

دوسرا غنڈہ آگے آیا..." خبردار ادھر پھر کبھی مت آنا۔" بادل نے ہاتھ جھٹک کر غصے سے کہا

"او بھائی ہم ادھر کیوں آتی؟ تم کو کچھ نہیں چاہیئے تو ہم ادھر کیوں آتی چلو زنانی جان چلو۔ ہم کسی دوسری کوٹھی میں جاتا ہے۔"

بادل نے نجمی کو ساتھ لیا اور کوٹھی سے باہر نکل گئے۔

باہر آتے ہی نجمی نے کہا: "اس کوٹھی کو یاد رکھنا بادل۔ ہمیں آج آدھی رات کے بعد یہاں آنا ہے۔"

بادل نے قدرے تعجب سے پوچھا: "یہ شبانہ کون تھی؟ کیا تم اسے جانتی ہو؟"

نجمی نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

"یہ میری بچپن کی سہیلی ہے۔ بادل ہم لاہور میں اکٹھے ایک ہی کالج میں پڑھا کرتے تھے۔ یہ میری ایک ہی سہیلی تھی۔ کتنی بدل گئی ہے۔ لگتا ہے بڑی مصیبتیں سہی ہیں۔ بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ اس پر بڑے ظلم ہوئے ہیں۔ یہ یہاں کیسے پہنچ گئی؟ میں اس پر کیے گئے ایک ایک ظلم کا بدلہ لوں گی۔"

بادل نے پوچھا: "کیا ہمیں اسے رات کو یہاں سے نکالنا ہوگا۔؟"

نجمی نے جواب میں پیچھے گردن گھما کر دیکھا۔ پولیس کے سپاہی کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ کہنے لگی

"ہاں بادل اسے یہاں سے نکال کر اپنے ساتھ اڈے پر لے جانا ہے۔ یہ لوگ جرائم پیشہ لگتے ہیں۔ شاید شبانہ کو ناجائز کاروبار میں ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس نے مجھ سے خود کہا ہے کہ مجھے یہاں سے نکال کر لے چلو۔"

بادل نے کوئی جواب نہ دیا۔ سڑک آگے جا کر دائیں جانب مڑتی تھی۔ موڑ مڑتے ہوئے بادل نے "خشک میوہ لے لو کابلی والے سے" کا آواز لگایا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ آہستہ سے بولا۔

"سپاہی کہیں نہیں ہیں۔ شاید وہ ہمارے پیچھے نہیں لگے تھے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نجمی نے اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا: "اگر وہ ہمارے پیچھے لگے ہوتے تو میں انھیں زندہ نہ چھوڑتی۔"

دونوں چھوٹی سڑک پر سے نکل کر ریلوے اسٹیشن والی سڑک پر آ گئے۔ بادل کہنے لگا۔

"یہ سڑک ریلوے اسٹیشن کو جاتی ہے اب تمہارا جو نیا پروگرام بن گیا ہے اس کے مطابق ہمیں ریلوے اسٹیشن کی بجائے کسی قریبی ہوٹل یا سرائے کی طرف جانا ہوگا۔"

نجمی نے کہا "ہاں جہاں ہم آدھی رات تک رہیں گے اور پھر آدھی رات کے بعد اس کوٹھی میں آ کر شبانہ کو ان جرائم پیشہ بدمعاشوں کے چنگل سے چھڑا کر لے جائیں گے۔"

بادل نے کہا "کوٹھی میں صرف دو ہی غنڈے ہیں جن کے پاس اسلحہ بھی ہے۔"

نجمی بولی "غنڈے اس سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں اور اسلحہ بھی اس سے زیادہ ہو سکتا ہے لیکن ہمیں ہر حالت میں شبانہ کو یہاں سے نکالنا ہے۔ یہ گناہ کی دلدل ہے۔ بادل میں اپنی پیاری سہیلی کو اس دلدل میں گرتے نہیں دیکھ سکتی۔ میں اپنی جان قربان کر دوں گی مگر شبانہ کو ان بدمعاشوں کی قید سے ضرور آزاد کراؤں گی۔"

بادل نے کہا "میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ہر حالت میں تمہارے ساتھ ہوں۔ چلو ہم ایک دوسرے ہوٹل میں چلتے ہیں۔ یہ ہوٹل سرائے بھی ہے۔ یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں ہے"

چلتے چلتے بادل نے کچھ سوچ کر نجمی سے پوچھا "ہمیں رات کو کوٹھی پر حملہ بولنے سے پہلے یہ ضرور سوچنا ہے کہ ہم شبانہ کو لے کر کہاں جائیں گے کیونکہ اس وقت ہم اسٹیشن پر بھی نہیں جا سکتے۔ آدھی رات کو یہاں سے کوئی ریل نہیں چلتی۔ اور پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غنڈے ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہوں۔"

نجمی نے بازار کی ایک جانب نگاہ ڈالی اور پھر بادل کی طرف چہرہ گھما کر کہا "تم نے کوٹھی میں کھڑی جیپ ضرور دیکھی ہوگی۔"

"ہاں" بادل نے کہا "کونے میں برآمدے کے پاس ایک بند جیپ کھڑی تھی۔"

نجمی نے کہا "ہم شبانہ کو اس جیپ میں بٹھا کر وہاں سے فرار ہوں گے۔ اسٹیشن کی طرف جانے کی بجائے ہم نیچے جنگل میں نکل جائیں گے۔ اگر جنگل میں سے کوئی راستہ آگے کٹنی یا

ساگر شہروں کی طرف جاتا ہے تو ہم یہ سفر جنگل میں ہی طے کریں گے۔"

بادل کہنے لگا "بھوپال کے اس جنگل سے اوپر کٹنی کی طرف ہم نہیں جا سکتے۔ آگے پہاڑیاں ہیں۔ البتہ ہم وہاں سے اٹارسی کی طرف چلے جائیں گے۔ مجھے اس سارے راستے کا پتہ ہے۔ اٹارسی بھوپال سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ اٹارسی سے ہم جبل پور کی طرف گھوم جائیں گے۔ جبل پور سے ہمیں بنارس جانے والی گاڑی مل جائے گی۔ بنارس سے آگے ہم ٹرین میں سفر کرتے ہوئے صوبہ بہار میں داخل ہو جائیں گے۔"

نجمی کو یہ روٹ پسند آیا۔ اس نے اسی راستے سے شبانہ کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ سرائے نما ہوٹل کافی گندا تھا مگر ان کے لیے یہی ہوٹل موزوں تھا۔ کسی اعلیٰ ہوٹل میں قیام پذیر ہونے کی وجہ سے ان پر شک پڑ سکتا تھا کابلی پٹھان اس قسم کے نچلے درجے کے سرائے نما ہوٹلوں میں قیام بھی کرتے تھے۔ دونوں کو ہوٹل نما سرائے کے کونے میں ایک کوٹھڑی مل گئی جس میں صرف دو چار پائیاں ہی بچھی تھیں۔ کھانا انھوں نے کوٹھڑی میں ہی کھایا۔ رات دس بجے تک بادل ہوٹل کے باہر گھوم پھر کر یہ جائزہ لیتا رہا کہ کہیں سچ مچ پولیس ان کے پیچھے تو نہیں لگی ہوئی۔ جب اسے تسلی ہو گئی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے تو وہ کوٹھڑی میں نجمی کے پاس آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ تلخ چائے سے بھری ہوئی کیتلی اور دو پیالیاں بھی لیتا آیا تھا۔ وہ چائے پیتے ہوئے اپنے رات کے اپریشن پر دھیمی آواز میں باتیں کرنے لگے۔ بادل نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ اگر اتفاق سے رات کو کوٹھی میں جیپ نہ ہوئی تو پھر کیا کریں گے۔ نجمی نے کہا "ہم کوئی ٹیکسی پکڑ لیں گے۔ ریوالور ہمارے پاس ہوں گے ٹیکسی والے نے انکار کیا تو اسے وہیں اتار دیں گے۔ یہ خشک میوے کی گٹھڑی ہم اسی ہوٹل میں چھوڑ جائیں گے۔"

بادل کے پاس گھڑی موجود تھی۔ رات بارہ بجے تک وہ جاگتے رہے اور باتیں کرتے رہے انھوں نے کوٹھڑی کی بتی بجھا دی تھی۔ ٹھیک سوا بارہ بجے بادل دبے پاؤں کوٹھڑی سے باہر نکلا۔ سڑک بالکل خالی تھی۔ چاروں طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔ ویسے بھی یہ علاقہ شہر سے باہر تھا۔ بادل نے کوٹھڑی میں جا کر نجمی سے کہا۔

"سب ٹھیک ہے۔ ہمیں اپنے مشن پر روانہ ہو جانا چاہیے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نجمی اور بادل نے ریوالور نکال کر ان میں بھری ہوئی گولیوں کو چیک کیا۔ مزید گولیاں اپنی جیبوں میں بھریں اور خاموشی سے کوٹھڑی میں سے نکل کر ہوٹل کے آگے سے گزرتے ہوئے چھوٹی سڑک پر آ گئے۔ سڑک پر اندھیرا چھایا تھا۔ وہ درختوں کے نیچے چلنے لگے۔ یہاں سے شکیلہ بائی کی کوٹھی زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ دونوں انتہائی احتیاط کے ساتھ چل رہے تھے۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ پیچھے مڑ کر دیکھ لیتے تھے۔ وہ اس سڑک پر آ گئے جس کے کونے والی کوٹھی میں شبانہ قید تھی۔ اس سڑک پر بھی تاریکی اور سناٹا چھایا تھا۔ بادل اور نجمی یہی چاہتے تھے۔ کوٹھی کے قریب آکر وہ رک گئے۔ بادل نے ہاتھ سے ایک جانب اشارہ کیا۔ وہ سڑک چھوڑ کر نیچے نشیب میں سے گزرتے ہوئے شکیلہ بائی کی ویران باغ والی کوٹھی کے عقبی دیوار کے نیچے آکر بیٹھ گئے۔ نجمی نے آہستہ سے کہا "باغ میں جاکر دیکھو کوئی چوکیدار تو ادھر نہیں پھر رہا۔"

بادل کے ہاتھ میں بھرا ہوا ریوالور تھا۔ دیوار چار فٹ اونچی تھی اور بڑے بڑے پتھروں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ بادل دیوار پھاند کر باغ میں اتر گیا۔ وہ جھک کر دبے پاؤں کوٹھی کے پچھلے حصے میں جھاڑیوں کی اوٹ لیتا آگے بڑھا۔ کوٹھی کے سامنے گیٹ پر بلب روشن تھا۔ گیٹ بند تھا۔ کونے میں جیپ بھی کھڑی تھی۔ اسی جانب برآمدے کے باہر ایک چوکیدار اسٹول پر بیٹھا نوکروں کے غسل خانے کی دیوار سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔ بادل وہیں سے واپس مڑا اور نجمی کو آکر صورت حال بیان کی۔ نجمی نے بھی بھرا ہوا ریوالور تھام رکھا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور دیوار پر چڑھ کر دوسری جانب باغ کے اندھیرے میں اتر گئی۔ بادل اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ دیوار کے پاس ہی اندھیرے میں بیٹھ گئے۔ اجڑا ہوا باغ نصف سے زیادہ اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ گیٹ پر جو بلب روشن تھا اس کی دھیمی روشنی بائیں جانب کے درختوں میں پڑ رہی تھی۔
بادل نے اس جانب اشارہ کیا جس طرف چوکیدار بندوق گھٹنوں پر رکھے اسٹول پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ نجمی دیوار کے ساتھ ساتھ جھکے جھکے آگے چلنے لگی۔ اب اسے تیس تینتیس قدم کے فاصلے پر غسل خانے کی ٹوٹی ہوئی دیوار کے ساتھ ایک آدمی اسٹول پر اس طرح بیٹھا نظر آ رہا تھا کہ اس کی گردن آگے کو جھکی ہوئی تھی۔ رائفل اس کے گھٹنوں پر پڑی تھی۔ نجمی نے بادل کے کان

کے پاس منہ لے جاکر سرگوشی کی "اسے گلا گھونٹ کر مار ڈالو۔"
بادل نے ریوالور جیب میں رکھا اور دوسری جیب سے نائیلون کی مضبوط مگر باریک رسی نکال کر اپنے ہاتھوں میں تھام لی اور اندھیرے میں سے ہو کر غسل خانے والی دیوار کے عقبی جانب بڑھا۔ نجمی نے ریوالور کا رخ چوکیدار کی طرف کر رکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس قسم کے جرائم پیشہ لوگوں کے اڈوں کے چوکیدار بھی جرائم پیشہ ہی ہوتے ہیں۔ اگر بادل چوک گیا تو وہ فائر کر کے چوکیدار کو ڈھیر کر دے گی۔ پھر جو سامنے آئے گا نجمی کی گولیوں سے بچ نہ سکے گا چاہے کوٹھی کے سارے آدمیوں کو ہلاک کرڈالنا پڑے۔ نجمی شبانہ کو یہاں سے نکال کر لے جائے گی۔

نیم تاریکی میں نجمی نے بادل کے سائے کو چوکیدار کے پیچھے دیوار کے پاس ابھرتے دیکھا وہ ہاتھوں میں نائیلون کی رسی پکڑے پھونک پھونک کر قدم رکھتا آگے بڑھ رہا تھا پھر وہ چوکیدار کے عین پیچھے اس کے سر پر آ گیا۔ یہاں آتے ہی بجلی ایسی تیزی سے بادل نے نائیلون کی رسی چوکیدار کی گردن میں ڈالی اور اسے پوری طاقت سے کس دیا۔ چوکیدار کے گھٹنوں سے بندوق نیچے گر پڑی اس کے ہاتھ بے اختیار گردن کی طرف گئے۔ اس کے حلق سے معمولی سی آواز نکلی اور پھر اس کے بازو نیچے لٹکنے لگے۔ بادل اس کی گردن کو رسی میں جکڑے ایک جگہ ساکت سا ہو گیا تھا۔ پھر اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ چوکیدار کو پرے گرا دیا۔ جھک کر اس کی گردن پہ دونوں ہاتھ رکھے اور غور سے دیکھا۔ بادل ایک مضبوط اور توانا ڈاکو تھا۔ نہ جانے وہ کتنے بدمعاشوں اور ڈاکوؤں کو ہلاک کر چکا تھا۔ وہ کئی قتلوں میں پولیس کو مطلوب تھا۔ اس کی گرفت سے اس چوکیدار کا بچ جانا ناممکن بات تھی۔ چوکیدار کمزور جسم والا نہیں تھا لیکن اچانک گردن جکڑی جانے سے وہ اپنا بچاؤ نہ کر سکا تھا۔ وہ مر چکا تھا۔
بادل نے اندھیرے میں نجمی کی طرف دیکھا اور زور سے ہاتھ ہلایا۔ نجمی دیوار سے ہٹ کر لپک کر اس کے پاس آ گئی۔ وہ کوٹھی کے عقبی برآمدے میں آ گئے۔ کوٹھی کے کسی کمرے میں روشنی نہیں ہو رہی تھی۔ برآمدے میں دو دروازے تھے۔ دونوں اندر سے بند تھے۔ نجمی بادل کو ہاتھ سے پکڑ کر برآمدے کے کونے میں لے گئی اور سرگوشی میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"سامنے والے برآمدے کی طرف چلو۔"

وہ کوٹھی کے کونے والے گول کمرے کی دیوار کے نیچے سے گزر کر سامنے والے برآمدے میں آ گئے۔ یہاں گیٹ کی روشنی آ رہی تھی۔ انھیں کونے والے گول کمرے کے روشندان میں بھی ہلکی روشنی دکھائی دی۔ لگتا تھا اندر ہلکی طاقت کا بلب جل رہا ہے۔ نجمی نے اس کمرے کی طرف اشارہ کیا اور بے آواز قدم اٹھاتی پنجوں کے بل گول کمرے کے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ دروازے کی دوسری جانب بادل اس طرح کھڑا ہو گیا کہ اس کا ریوالور والا ہاتھ ذرا سا اوپر اٹھا ہوا تھا۔ یہ دروازہ بھی اندر سے بند تھا۔ پرانا دروازہ تھا اس کی جھری میں سے نجمی نے اندر جھانک کر دیکھا کہ چھت کا پنکھا چل رہا ہے۔ کونے میں ہلکی روشنی والا بلب روشن ہے۔ فرش پر قالین پڑا ہے جس پر تین آدمی بندوقیں پاس ہی رکھے گہری نیند سو رہے ہیں۔ ایک آدمی سگریٹ کے تمباکو کو اپنی ہتھیلی پر رگڑ رہا ہے۔ اس کی بندوق بھی پاس ہی پڑی تھی۔ نجمی آہستگی سے سانس لے رہی تھی۔ اس نے بادل کو اندر جھانکنے کا اشارہ کیا۔ بادل نے بھی جھری کے ساتھ آنکھ لگا کر اندر کا منظر دیکھا۔ نجمی پنجوں کے بل چلتی ہوئی بادل کو دوسرے کمرے کی دیوار کے پاس اندھیرے میں لے گئی۔ یہاں اس نے بادل کو سرگوشی میں اس اپریشن سے آگاہ کیا جس پر وہ عمل کرنے والی تھی۔ دونوں دیوار کے ساتھ اندھیرے میں تھے۔ نجمی نے زمین پر سے دو روڑے اٹھا لیے۔ اس نے ایک روڑے کو اوپر اس طرح سے اچھالا کہ وہ برآمدے کے فرش پر جا کر گرا۔ رات کی خاموشی میں پتھر کے گرنے سے کھڑاک پیدا ہوا تو دوسرے لمحے سامنے والا دروازہ کھلا اور تشکیلہ بائی کے چار غنڈوں میں سے ایک غنڈے نے باہر جھانک کر دیکھا۔ یہ وہ غنڈہ تھا جو کمرے میں بیٹھا سگریٹ میں سے تمباکو نکال رہا تھا۔ نجمی نے بادل کا ہاتھ دبایا اور اندھیرے میں اپنی جانب دوسرا پتھر اچھال کر پیچھے ہٹ گئی۔

دوسری آواز پر غنڈے نے بندوق سیدھی کر لی اور جدھر پتھر گرا تھا ادھر کو لپکا۔ جونہی وہ اندھیرے میں املی کے گھنے درخت کے نیچے آیا بادل نے پوری طاقت سے ریوالور کا آہنی دستہ پیچھے سے اس کی کھوپڑی پر دے مارا۔ ضرب اتنی شدید اور بھرپور تھی کہ غنڈہ وہیں لڑکھڑایا اور گر گیا۔ اس کے گرتے ہی بادل نے نائیلون کی رسی اس کی گردن میں ڈال کر دو سیکنڈ میں اس کا

کام بھی تمام کر دیا۔ دروازہ کھل چکا تھا۔ نجمی اور بادل اندر داخل ہو گئے۔ کمزور بلب کی دھیمی روشنی میں باقی تینوں غنڈے قالین پر بے سدھ پڑے سو رہے تھے۔ نجمی اور بادل نے فوری طور پر تینوں غنڈوں کی بندوقیں اٹھا لیں۔ ایک بندوق میں سے کارتوس نکال کر بادل نے اپنی جیب میں ڈال لیے اور باقی دونوں بندوقوں کے کارتوس کھول کر دیکھے۔ دونوں بندوقیں لوڈ تھیں۔ بادل نے آہستہ سے جھک کر ایک غنڈے کی گردن میں رسی ڈالی اور زور سے جھٹکا دیا۔ غنڈے کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ جھٹکے کی آواز سے باقی دونوں غنڈے جاگ پڑے۔ نجمی نے بندوق سیدھی کر لی اور آہستہ سے کہا "جان عزیز ہے تو اسی طرح لیٹے رہو۔"

غنڈوں نے آنکھیں جھپک جھپک کر ایک پٹھان عورت اور مرد کو دیکھا تو اٹھنے کی کوشش کی۔ بادل نے بندوق کی نالی ایک غنڈے کی گردن سے لگا دی۔ نجمی نے دوسرے غنڈے کے سینے پر نالی رکھ دی۔

نجمی نے پوچھا "شبانہ یہاں کون سی جگہ بند ہے۔ جلدی بتاؤ نہیں تو میں گولی سے اڑا دوں گی۔"

غنڈہ ہکلاتے ہوئے بولا "... ہمیں کچھ معلوم نہیں۔"

اچانک دوسرا غنڈہ زور سے چلّایا "چاند خان ہوشیار۔"

بادل نے اس کی چیخ سے گھبرا کر ٹریگر دبا دیا۔ ایک دھماکہ ہوا۔ بندوق کی نالی غنڈے کی گردن سے لگی تھی۔ فائر کے ساتھ ہی غنڈے کی گردن آدھی سے زیادہ اڑ گئی۔ نجمی نے نالی اٹھا کر بادل کی طرف دیکھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہاں فائر کا دھماکہ ہو۔ نیچے پڑے غنڈے کو موقع مل گیا۔ وہ تڑپ کر اٹھا اور نجمی کی بندوق کو پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا ہی تھا کہ بادل نے دوسرا فائر کر دیا۔ بندوق کے دوسرے کارتوس نے آخری غنڈے کے سینے میں گہرا شگاف بنا دیا اور پھیپھڑے چیتھڑوں کی طرح اڑ گئے۔ دوسرے کمرے میں جیسے کوئی دھڑ دھڑاتا ہوا ایک طرف کو دوڑا۔ بیچ والا دروازہ بند تھا۔ بادل نے زور سے لات مار کر دروازہ دھڑاک سے کھول دیا۔ سامنے کسی نے بتی جلا دی تھی اور اس کی روشنی میں تشکیلہ بائی پلنگ سے نیچے اترنے کی کوشش میں ایسی حالت میں کھڑی کانپ رہی تھی کہ ایک پاؤں اس کا ابھی تک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پلنگ کے اوپر ہی تھا۔ ایک مرد عجیب حالت میں سامنے والے دروازے کے پاس کھڑا اسے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پٹھان مرد اور عورت کو بندوقوں کے سامنے دیکھ کر وہ وہیں ساکت ہو گیا۔

نجمی اور بادل نے جیبوں سے ریوالور نکال لیے بندوقیں پرے پھینک دیں۔ نجمی نے شکیلہ بائی کو قریب جاکر غور سے دیکھا۔ بادل سے کہا۔ "اس بدمعاش مرد کو قابو میں کرو۔"

بادل نے آگے بڑھ کر، موت کے خوف سے کانپتے ہوئے آدمی کو وہیں پلنگ کے پاس فرش پر بٹھا دیا۔ ریوالور کا رخ اس کی کھوپڑی کی طرف تھا۔ نجمی نے شکیلہ بائی سے پوچھا۔

"تم نے ایک لڑکی کو اپنے ہاں قید کر رکھا ہے۔ اس کا نام شبانہ ہے۔ وہ یہاں کس جگہ قید ہے باہر تمہارے چوکیدار اور چاروں غنڈوں کی لاشیں خون میں لت پت پڑی ہیں۔ بتاؤ شبانہ کہاں ہے؟"

شکیلہ بائی کی گھگھی بندھ گئی تھی مگر وہ ایک عیار اور کائیاں عورت تھی اس عالم میں بھی اس نے مکاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"وہ.... وہ تو شام کو ہی اپنے ایک رشتے دار کے پاس چلی گئی تھی۔ میرے پاس وہ رات کبھی نہیں ٹھہری۔"

نجمی کی آنکھوں میں خون اتر ہوا تھا۔ اس قسم کی بدکردار عورتوں اور بدمعاش غنڈوں نے اس کا جو حشر اس کا کیا تھا وہ اس کے سامنے تھا لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہی حشر اب شبانہ کے ساتھ ہو اور یہ گھناؤنی کہانی ایک بار پھر دہرائی جائے۔ اس نے بادل کو اشارہ کیا۔ بادل نے اس مرد سے جو پلنگ کے پاس ریوالور کی زد میں سہما ہوا بیٹھا تھا پوچھا۔ "لڑکی کہاں ہے؟ تم بتاؤ۔"

مرد نے ہاتھ جوڑ کر کہا "میں یہاں پہلی بار آیا ہوں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں بھگوان کی سوگند ہے مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

اب نجمی نے شکیلہ کو بالوں سے پکڑ کر زمین پر گرا دیا اور ایک پاؤں اس کی گردن پر رکھتے ہوئے کہا "میں تین تک گنوں گی۔ اگر تم نے شبانہ کے بارے میں مجھے نہ بتایا تو فائر کر

دوں گی۔"

ریوالور کی نالی شکیلہ بائی کی آنکھوں کے بالکل سیدھ میں تھی۔ نجمی نے دو تک گنا تھا کہ شکیلہ بائی نے بتا دیا کہ شبانہ پیچھے والے تہہ خانے میں ہے سہمے ہوئے مرد کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اسے رسی سے وہیں باندھ کر پھینک دیا گیا۔ شکیلہ کو بادل اور نجمی نے آگے لگا لیا وہ انھیں لے کر اندر والے کاریڈار کے ایک زینے میں سے اتر کر تہہ خانے کے دروازے پر آ گئی۔ بادل زینے کے اوپر ہی ریوالور لیے کھڑا تھا۔ شکیلہ بائی نے دروازہ کھول دیا۔ اندر شبانہ چارپائی پر لیٹی جاگ رہی تھی۔ فائر کی آوازیں اس نے بھی سنی تھیں۔ نجمی نے جاتے ہی شبانہ کو گلے لگا لیا اور اس کا ماتھا چوم کر بولی "چلو میری سہیلی! میں تمھیں یہاں سے نکالنے آئی ہوں۔" شبانہ کے جسم میں نئی زندگی دوڑ گئی تھی۔ وہ چارپائی سے اٹھی۔ چادر ساڑھی کے اوپر لی اور بولی۔

"یہ عورت مجھے پان میں بے ہوشی کی دوا کھلا کر بے ہوش کر کے یہاں لے آئی تھی نجمی۔ یہ عورت معصوم لڑکیوں کو فروخت کر کے بازار حسن پہنچاتی ہے مجھے اس کی نوکرانی نے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

نجمی کے تن بدن میں آگ لگ گئی معصوم لڑکیوں کی زندگیاں برباد کرنے والے مرد اور عورتیں نجمی کے دشمن نمبر ایک تھیں۔ اس نے ریوالور شکیلہ بائی کی کھوپڑی کے ساتھ لگایا اور لبلبی دبا دی۔ تڑاخ کی آواز کے ساتھ ہی شکیلہ بائی کی آدھی کھوپڑی اڑ گئی۔

نجمی نے شبانہ کو ساتھ لیا اور زینے پر سے ہو کر اوپر کاریڈار میں آ گئی۔ بادل نے پوچھا۔

"یہ گولی نیچے کس نے چلائی تھی۔"

نجمی نے نفرت سے کہا "ایک موذی ناگن کو مار دیا ہے میں نے۔" وہ کوٹھی کے کمروں سے لاشوں کے قریب سے گزرتے ہوئے باہر والے برآمدے میں آ گئے۔ کوٹھی آبادی سے دور تھی۔ فائرنگ بند کمروں میں ہوئی تھی۔ اس کی آواز دور آبادی تک شاید نہیں پہنچی تھی۔ باہر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نجمی نے جیپ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"پٹرول چیک کرو بادل۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نجمی نے شبانہ کو اپنے ساتھ اگلی سیٹ پر بٹھا لیا۔ بادل نے پیٹرول چیک کیا۔ ٹنکی بھری ہوئی تھی۔ جیپ میں چابی ویسے ہی لٹک رہی تھی۔ یہ اس لیے کہ ایمرجنسی میں اگر کسی کو بھی وہاں سے بھاگنا پڑے تو جیپ فوراً اسٹارٹ کر دی جائے۔ بادل نے جیپ اسٹارٹ کر کے تیزی سے اسے کوٹھی کے گیٹ سے نکالا اور سڑک پر ڈال دیا۔

بادل بھوپال کی ان سڑکوں سے خوب واقف تھا۔ وہ رات کے اندھیرے میں بھی ان سڑکوں کو پہچان سکتا تھا۔ آدھی رات کے بعد کا وقت تھا۔ شہر کے باہر والا علاقہ بالکل سنسان تھا۔ سڑکیں خالی تھیں۔ جیپ پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ بادل شہر کی مختلف ویران سڑکوں پر سے ہوتا ہوا بھوپال اٹارسی سڑک پر آ گیا۔ یہ کشادہ سڑک تھی۔ جیپ جنوب کی طرف اٹارسی کی جانب چل پڑی۔ نجمی نے شبانہ کے گرد بازو ڈال کر اسے اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ اسے بے حد خوشی تھی کہ اس نے اپنی پیاری سہیلی کو بھیانک انجام سے بچا لیا تھا۔ وہ اسے تباہی کے تاریک گڑھے میں گرنے سے بچا کر لے آئی تھی۔ جب جیپ بھوپال شہر سے کافی دور نکل آئی تو شبانہ نے نجمی سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟ نجمی نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"تم میرے گھر جا رہی ہو شبو۔"

شبانہ نے پوچھا۔

"کیا تم نے شادی کر لی ہے نجمی؟"

"ہاں"۔ نجمی نے کہا۔ "میں نے موت سے شادی کر لی ہے۔"

شبانہ نے نجمی کے کرخت چہرے کو دیکھ کر ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ نارمل زندگی بسر نہیں کر رہی۔ اور اب تو نجمی نے اس کے سامنے ایک عورت کا انتہائی سفاکانہ انداز سے خون کر دیا تھا اور اسے ذرا بھی ملال نہیں ہوا تھا۔ شبانہ کو شکیلہ بائی کی موت کا کوئی افسوس نہیں تھا اس کے باوجود وہ نجمی کے ہاتھوں اسے قتل ہوتے دیکھ کر کچھ سہم گئی تھی۔ نجمی اتنی بیدردی سے کسی کا خون کرے گی یہ بات شبانہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ نجمی نے شبانہ سے پوچھا کہ وہ لاہور سے انڈیا کیسے پہنچ گئی؟

شبانہ نے کہا۔

"یہ بڑی لمبی کہانی ہے نجمی! تمھیں تمھارے گھر چل کر سناؤں گی۔ صرف اتنا بتائے دیتی ہوں کہ میری شادی ظفر سے ہو گئی تھی۔ میں اس کے ساتھ امریکہ میں تھی۔ اس نے میرے ساتھ بڑا وحشیانہ سلوک کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں تنگ آ کر لاہور آ گئی۔ بھائی جان نے تبدیلی آب و ہوا کے لیے مجھے مشرقی پاکستان اپنے ایک دوست کی فیملی میں بھجوا دیا۔ میں وہیں تھی کہ انڈیا نے حملہ کر دیا۔ میں اس افراتفری میں جدھر منہ اٹھا اپنی عزت بچا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ ایک آدمی مجھے پکڑ کر کلکتے لے آیا۔ یہاں اس نے مجھے فروخت کر دیا۔ اس کے بعد جانے کہاں کہاں میں ماری ماری پھرتی رہی۔ ایک نیک دل گورکن نے مجھے سری لنکا اسمگل کروانے کی کوشش کی لیکن میرا جعلی پاسپورٹ تھا۔ پکڑی گئی۔ وہاں سے جان چھوٹی تو اورنگ آباد واپس آ رہی تھی کہ اس عورت شکیلہ بائی نے مجھے بے ہوشی کا پان کھلا کر اغوا کر لیا۔"

نجمی نے پوچھا "ندیم سے تمھاری ملاقات نہیں ہوئی؟"

شبانہ نے کہا "میں نے سنا تھا کہ وہ تمھاری تلاش میں انڈیا گیا ہوا ہے۔ اس کے بعد میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کیا وہ تم سے نہیں ملا؟"

نجمی نے گہرا سانس بھر کر کہا

"کئی بار ملا اور بچھڑ گیا۔ وہ مجھے واپس پاکستان لے جانا چاہتا تھا۔ میں اس وقت تک واپس نہیں جا سکتی تھی جب تک کہ میں یہاں اپنے دشمنوں سے انتقام نہ لے لیتی۔ اب میں واپس پاکستان جانا چاہتی ہوں اور ندیم کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے؟"

اس طرح باتیں کرتے کرتے یہ لوگ اٹارسی شہر کے قرب و جوار میں پہنچ گئے۔ اٹارسی شہر کی روشنیاں بائیں جانب چھوڑ کر بادل نے جیپ کو جبل پور والی سڑک پر ڈال دیا۔ اٹارسی سے جبل پور کافی دور تھا۔ دن کا اجالا ہوا تو وہ ایک چھوٹے سے قصبے میں پہنچے۔ وہاں انھوں نے جیپ کو جنگل میں ایک طرف کھڑا کر دیا۔ یہاں ایک ندی بہہ رہی تھی۔ ندی کے کنارے بیٹھ کر انھوں نے منہ ہاتھ دھویا۔ بادل قصبے میں گیا اور کچھ کھانے پینے کا سامان لے آیا۔ ایک گھنٹہ یہاں ناشتے کے بعد انھوں نے آرام کیا اور پھر جبل پور کی طرف چل پڑے۔ سارا دن اسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرح راستے میں رکتے تھوڑا آرام کرتے دن بھر سفر جاری رہا۔ پھر رات آ گئی۔ رات کے بارہ بجے یہ لوگ جبل پور پہنچے۔

شہر سے باہر جیپ ایک طرف کھڑی کر کے انھوں نے وہیں آرام کیا۔ منہ اندھیرے جبل پور سے کٹنی کی جانب روانہ ہو گئے۔ کٹنی سے مانک پور ریلوے اسٹیشن کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ الہ آباد پہنچ گئے۔ یہاں سے انھوں نے ریل پکڑی اور بنارس پہنچے۔ بنارس سے گاڑی میں سوار ہو کر وہ رانچی کی جانب چل پڑے۔ یہ سفر بھی کافی طویل تھا۔ یونہی ریل گاڑیوں میں سفر کرتے یہ لوگ گوماہ ریلوے اسٹیشن پہنچ کر وہاں سے پیدل ہی اپنی خفیہ کمین گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔

سفر کے دوران نجمی نے شبانہ کو لاہور سے ندیم کے ساتھ فرار ہونے کے بعد سے لے کر آج کے دن تک کی پوری داستان سنا دی۔ شبانہ اپنی پیاری سہیلی نجمی کی زندگی کے ہوش ربا واقعات سُن کر دنگ رہ گئی۔ شبانہ کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ نجمی جرائم پیشہ لوگوں اور معصوم لڑکیوں کی عزتوں سے کھیلنے والے اور ان کی زندگیوں کو برباد کرنے والوں کے لیے سفاک قاتلہ بن چکی ہے اور ایسے کئی بدکرداروں کو موت کے گھاٹ اتار چکی ہے۔ نجمی کے مقابلے میں اسے اپنی تکلیفیں معمولی لگنے لگیں۔

دن ڈوب رہا تھا کہ بادل نجمی اور شبانہ جنگل میں چٹانوں کی اوٹ میں واقع اپنی کمین گاہ میں پہنچ گئے۔

نجمی کے ساتھ ڈاکوؤں نے شبانہ کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔ شبانہ اتنے طویل سفر کی وجہ سے تھک گئی تھی۔ رات کو کھانا کھاتے ہی وہ گہری نیند سو گئی۔ دوسرے دن وہ ابھی تک سوئی ہوئی تھی کہ نجمی نے بادل کو بلا کر اس سے مشورہ کیا کہ ندیم کو کیسے تلاش کیا جائے۔ وہ ندی کے کنارے آمنے سامنے بچھی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ نجمی اپنے ریوالور کو کپڑے سے صاف کر رہی تھی بادل نے کہا۔

"یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے مخبر کلکتے کے آس پاس چھوڑ دیں۔ دو ایک روز مجھے بھی سیٹھ جبار کے پاس جانا ہے۔ ممکن ہے اس نے ندیم کا کوئی سراغ لگا لیا ہو۔"

نجمی نے کہا "ہمارے صرف ایک مخبر نے ندیم کو دیکھا ہوا ہے ہم صرف اسی کو سراغرسانی کے لیے بھیج سکتے ہیں۔"

بادل بولا "کلکتے میں ایک ہی مخبر کافی ہے۔ وہ پولیس تھانوں سے اپنے ذرائع سے معلومات حاصل کر سکتا ہے۔"

نجمی نے اسی وقت ایک مخبر کو مزدوری ہدایت دینے کے بعد کلکتے کی طرف روانہ کر دیا۔ شبانہ سو کر اٹھ بیٹھی تھی۔ نجمی اس کے پاس چلی گئی۔ دونوں نے بھنے ہوئے جنگلی مرغ اور کافی کا ناشتہ کیا۔ پھر دونوں سہیلیاں آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ وہ ماضی کی یادوں میں کھو گئیں۔ اور دیر تک لاہور والے کالج یونیورسٹی کیمپس کی سہیلیوں اور لاہور شہر کی باتیں کرتی رہیں شبانہ نے نجمی کو بتایا کہ اس کی سوتیلی ماں اس کے باپ کی وفات کے بعد رنگ محل والا گھر چھوڑ کر اپنے گاؤں جا چکی ہے۔ اپنے باپ کی وفات کا سن کر نجمی کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے فوراً آنکھیں پونچھیں اور اپنے ریوالور کے دستے کو پتلون سے رگڑتے ہوئے بولی۔

"جو ہوا میں اب اسے بھلا دینا چاہتی ہوں۔ میں پاکستان کبھی تو لاہور میں نہیں رہوں گی۔ میں گلگت یا کاغان کے سرسبز پرسکون علاقے میں جا کر ایک نئی زندگی شروع کر دوں گی۔"

دو روز بعد بادل نے ایک جوگی کا بھیس بدلا اور ندیم کا کھوج لگانے کے لیے کلکتے کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں اس نے سیٹھ جبار سے خفیہ ملاقات کی تو سیٹھ جبار نے اسے بتایا کہ ندیم کو بنگال پولیس نے گرفتار کر لیا تھا اور اب وہ دلی میں قید ہے۔

"میرے آدمی نے مجھے اطلاع دی ہے کہ دلی کے پرانے قلعے کے پیچھے ایک پرانا کھنڈر ہے جس پر دلی پولیس انٹیلی جنس والوں کا قبضہ ہے۔ پولیس نے اس کھنڈر کے نیچے تہہ خانے میں ندیم کو قید میں ڈال رکھا ہے اور اس پر تشدد کیا جا رہا ہے۔ دلی پولیس ندیم کو پاکستانی جاسوس سمجھتی ہے چنانچہ وہ اس سے اس کے ساتھیوں کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہی ہے۔"

بادل کے لیے یہ اطلاع کافی تھی۔ سیٹھ جبار نے یہ بھی بتایا کہ جہاں ندیم قید ہے وہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ بادل نے یہ ساری باتیں واپس آ کر نجمی کو بیان کر دیں۔ شبانہ بھی نجمی کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ نجمی نے اس مسئلے کے ہر پہلو پر غور کیا۔ بادل سے مشورہ بھی کیا۔ آخر وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسی نتیجے پر پہنچی کہ ندیم کی مدد اور بھارتی انٹلی جنس کے گھناؤنے تشدد سے نجات دلانے کے لیے اسے خود دلی جانا ہوگا۔ شبانہ کو اس نے وہیں رہنے کی ہدایت کی اور بادل کو ساتھ لے کر ایک دن وہ دلی کی طرف روانہ ہو گئی۔

دونوں نے بیراگی اور جوگن کا بھیس بدل رکھا تھا۔

* * *

نجمی اور بادل دلی کے ریلوے اسٹیشن سے باہر نکل آئے۔

اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا اور شام کے سائے پھیلنے لگے تھے۔ اسٹیشن کے اندر کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ نجمی اور بادل دونوں ہی جوگی جوگن کے بھیس میں تھے۔ نجمی نے کھدر کی گیروی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ ماتھے پر تلک لگا تھا۔ گلے میں ریٹھوں کے منکوں کی مالا تھی۔ بالوں کو اس نے کھدر کے گیروے رومال سے ڈھانپ رکھا تھا۔ ہاتھ میں چھوٹا سا کمنڈل تھا۔ بائیں گال پر اس نے سیاہ رنگ کا ایک مصنوعی مسّہ بنا لیا تھا تاکہ آسانی سے پہچانی نہ جا سکے۔ اگرچہ دلّی کی پولیس سے اسے زیادہ واسطہ نہیں پڑا تھا۔ کلکتے کی پولیس اسے زیادہ جانتی تھی۔ پھر بھی نجمی کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی۔ بادل بھی جوگی کے بھیس میں گیروے رنگ کی چادر سے اپنا بدن لپیٹے ہوئے تھا۔ اس کے ماتھے پر وشنو بھگوان کے تلک کی تین لکیریں سفید رنگ کی پڑی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ترشول تھا اور دھوتی کے اندر بھرا ہوا ریوالور چھپا ہوا تھا۔ ایک چھوٹا ریوالور نجمی نے بھی اپنے کپڑوں میں چھپا رکھا تھا۔ بادل اس قسم کے بھیس بدلنے میں بڑا ماہر تھا اور اسے ہندی اور سنسکرت کے کچھ اشلوک بھی زبانی یاد تھے۔ یہ بات انھوں نے دلی آتے ہوئے ٹرین میں ہی طے کر لی تھی کہ وہ ریلوے اسٹیشن سے اتر کر سب سے پہلے سیدھے بھیروں جی کے مندر میں جائیں گے۔ بھیروں جی کا مندر دلی کے تیس ہزاری علاقے میں واقع ہے اس مندر کا اس لیے انتخاب کیا گیا تھا کہ یہاں سے قریب ہی مٹی کے ٹیلے کے عقب کے کوارٹروں میں بادل کا پرانا دوست امجد خان رہتا تھا۔ امجد خان کسی زمانے میں بادل کے ساتھ نجیب آباد کے جنگلوں میں ڈاکے ڈالا کرتا تھا۔ پھر اس نے شادی کر لی اور تائب ہونے کے بعد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دلی میں آگیا۔ دلی میں امجد خاں نے داڑھی رکھ لی اور عبدل بیگ کے نام سے ایک دفتر میں چپڑاسی ہو گیا تھا۔

نجمی اور بادل نے رکشا پکڑا اور سیدھے تیس ہزاری کی طرف روانہ ہو گئے۔ بھارت میں جوگی اور جوگن کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ اتر پردیش کے پہاڑی علاقوں سے جوگی لوگ اکثر دلی کے مندروں کی یاترا کو آتے رہتے ہیں اور میدانوں سے جوگی لوگ اتر پردیش اور ہماچل پردیش کے پہاڑی مندروں کی یاترا کو جاتے ہی رہتے ہیں۔ دلی کی گلیوں میں جوگی جوگنیں عام طور پر بھیک مانگتے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہندوؤں کے علاقے میں تو ان کا بڑا زور ہوتا ہے۔ مندروں میں اکثر وہ ڈیرے ڈالے ہوتے ہیں۔ نئی دلی کے کناٹ پلیس میں وہ بڑے رعب سے گاڑی والوں سے دکھشنا طلب کرتے ہیں اور ضعیف الاعتقاد ہندو انھیں فوراً بھکشا دے دیتے ہیں یہ ہندو ان جوگی جوگنوں کی بد دعا سے ڈرتا ہے۔ ان کا اعتقاد ہے کہ اگر جوگی یا جوگن سراپ یعنی بد دعا دے تو وہ کبھی خالی نہیں جاتی۔ ہندوؤں کی اس کمزوری کا نجمی اور بادل کو بخوبی علم تھا۔ اگر انھیں کچھ خطرہ تھا تو صرف یہ کہ کہیں کوئی خفیہ پولیس کا آدمی ان کو پہچان کر پیچھے نہ لگ جائے۔ مگر رات کا اندھیرا چھایا تھا اس لیے نجمی اور بادل کو زیادہ فکر نہیں تھی۔ بادل نے یہی سوچا تھا کہ ایک رات تو وہ بھیروں جی کے مندر میں گزاریں گے اور دوسرے روز صبح ہونے سے پہلے امجد خان کے کوارٹر میں اٹھ جائیں گے۔

بھیروں جی کے مندر میں عقیدت مندوں کی بڑی بھیڑ تھی۔ مندر کی ڈیوڑھی میں لٹکتے گھنٹے اور گھنٹیاں بار بار بج رہی تھیں۔ اندر جاتے اور باہر آتے ہوئے ہر ہندو اس کو ہاتھ سے بجا دیتا تھا۔ سارا مندر جگ مگ کر رہا تھا۔ مخروطی مینار کے اوپر بتی روشن تھی۔ اندر بھیروں ماتا کی مورتی کے سامنے پجاری بیٹھا دکھشنا وصول کرنے کے بعد پجاریوں کے ماتھے پر تلک لگاتا جا رہا تھا۔ مندر کے صحن میں کئی جگہوں پر سادھو اور جوگی لوگ رنگ بھبھوت لگائے الاؤ روشن کیے آسن جمائے بیٹھے تھے۔ بادل اور نجمی بھی ایک طرف درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ یہاں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ بادل نے اپنا ترشول اور جھولا قریب ہی گھاس پر رکھ دیا۔ آنکھوں کو سکیڑ کر چاروں طرف دیکھا اور بولا۔

"جس جگہ ہم بیٹھے ہیں اس کے پیچھے کچھ کوٹھریاں ہیں۔ یہاں باہر کے یاتری آ کر قیام کرتے ہیں۔"

نجمی نے جذبات سے عاری سپاٹ آواز میں پوچھا۔

"کیا یہاں کا مہنت ہمیں کوٹھڑی دے دے گا۔؟"

بادل نے کہا: "اسے رشوت چاہیئے جو ہم اسے دے دیں گے۔ میں منہ اندھیرے امجد خان کے گھر جانا چاہتا ہوں۔ تم کوٹھڑی میں رات بسر کرنا۔ میں یہاں باہر ہی کسی الاؤ کے پاس پڑا رہوں گا۔"

روٹیاں پکا کر وہ اپنے ساتھ ہی لائے تھے۔ ساتھ اچار بھی تھا۔ دونوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے روٹی کھائی۔ لوگ پوجا کرنے جاتے اور واپس چل دیتے۔ کوئی ان کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ وہاں جوگی جوگنیں اور سادھو لوگ آتے ہی رہتے تھے۔ جب رات کے سوا دس بج گئے اور پجاریوں کی آمد و رفت ختم ہو گئی تو بادل نے مندر کے مہنت سے جا کر بات کی کہ میری بہنی بیمار ہے۔ باہر کھلے آسمان تلے نہیں سو سکتی۔ اس کو خالی کوٹھڑی مل جائے تو بڑی مہربانی ہو گی۔

مہنت نے بے نیازی سے کہا: "کوٹھڑی تو کوئی بھی خالی نہیں۔"

بادل نے جب دس روپے کا نوٹ مہنت کے قریب رکھ دیا تو وہ فوراً مورتی کے قریب بیٹھے بیٹھے بولا: "کونے والی کوٹھڑی میں چلے جاؤ۔"

بادل نجمی کو کوٹھڑی میں لے آیا۔ یہاں صرف ایک چارپائی بچھی تھی جس پر کوئی بستر وغیرہ نہیں تھا۔ بادل نے جھولے میں سے کھدر کی چادر نکال کر نجمی کو دی اور کہا۔

"اسے اوڑھ کر سو جاؤ۔ اندر سے کنڈی لگا لینا۔ میں باہر سوؤں گا اور منہ اندھیرے امجد خان کے پاس جاؤں گا۔"

نجمی نے اندر سے کنڈی لگا لی۔ بھرا ہوا ریوالور اپنے پاس ہی رکھا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

بادل کوٹھڑی کے قریب ہی ایک آدھ بجھے خالی الاؤ کے پاس بیٹھ گیا۔ سردی گلابی تھی مگر رات کو کچھ ٹھنڈی ہو گئی تھی بادل نیم کے درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں منکوں کی مالا تھی۔ اسے یونہی پھیر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ابھی اسے نہیں سونا چاہیئے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد بند کوٹھڑی کو دیکھ لیتا تھا جہاں نجمی سو رہی تھی۔ کبھی اس کی ذرا سی دیر کو آنکھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگ جاتی اور پھر جاگ پڑتی۔ اسی طرح سوتے جاگتے آدھی رات بیت گئی۔

مندر کی صرف چند ایک بتیاں روشن تھیں۔ کچھ فاصلے پر الاؤ کے پاس جو سادھو آسن جمائے بیٹھے تھے اب عقیدتمندوں کے رخصت ہونے پر وہ بھی وہیں زمین پر لیٹ کر سو گئے تھے۔ تیس ہزاری سڑک پر کبھی کبھی کسی موٹر گاڑی کے گزرنے کی آواز آجاتی تھی۔ جب رات آدھی سے بھی زیادہ گزر گئی تو بادل ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا۔ شہر پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ تیس ہزاری کی آبادی بھی خاموش تھی۔ بادل نے ہتھیلیوں سے آنکھوں کو ملا اور اللہ کا نام لے کر وہاں سے اپنے پرانے دوست امجد خان کے کوارٹر کی طرف چل پڑا۔

تیس ہزاری والے بھیروں جی کے مندر کے سامنے بھی کوارٹروں کی ایک قطار تھی۔ ان کوارٹروں کے برآمدوں کی بتیاں جل رہی تھیں۔ ان پر بھی سناٹا طاری تھا۔ بادل سادھو جوگی کے بھیس میں تھا۔ اگر کوئی گشت لگاتا سپاہی یا چوکیدار مل بھی جاتا تو اسے اس پر چور ہونے کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ بادل بھی سینہ تان کر بڑے اعتماد سے چل رہا تھا۔ وہ سامنے والے کوارٹروں کے آگے سے گزرتا مغربی ٹیلے کی طرف آگیا۔ ٹیلا مٹی کا تھا اور اس پر کہیں کہیں جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ وہ ٹیلے کے اوپر آیا تو دوسری طرف کوارٹروں اور ان کے پیچھے پرانے بنگلوں میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ وہ ٹیلے سے اتر کر امجد خاں کے کوارٹر کی طرف چلنے لگا۔ ابھی تک نہ تو اسے کوئی چوکیدار ملا تھا اور نہ رات کو گشت کرنے والا کوئی سپاہی۔ بادل امجد خاں کے کوارٹر کے قریب پہنچا تو کسی طرف سے ایک کتا بھونکنے لگا۔ بادل نے ترشول اپنے سیدھے ہاتھ میں لے لیا کہ اگر کتے نے اس پر حملہ کیا تو وہ اپنا دفاع کر سکے۔

امجد خاں کا کوارٹر اب اس کے سامنے تھا۔ کتا کچھ دیر بھونک کر خاموش ہو گیا تھا۔ امجد خاں کے کوارٹر کے باہر کھمبے کا کمزور بلب جل رہا تھا۔ یہ ایک چھوٹی سے گلی میں کونے والا کوارٹر تھا۔ بند دروازے کے آگے گلی میں ایک بڑا سا پتھر رکھا ہوا تھا جس پر پاؤں رکھ کر اندر جاتے تھے۔ بادل پہلے بھی دو ایک بار یہاں اپنے دوست کے پاس آچکا تھا۔ دروازے کے پاس آکر بادل نے دائیں بائیں دیکھا۔ وہاں اس کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ بادل نے دروازے پر ترشول سے آہستہ سے دستک دی۔

کچھ دیر بعد کسی مرد کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی "کون ہے باہر؟"

بادل نے آواز پہچان لی۔ یہ اس کے دوست کی آواز تھی۔ وہ خاموش رہا۔

دوبارہ دستک دی تو امجد خان کی آواز آئی "آتا ہوں۔"

چند سیکنڈ خاموشی طاری رہی۔

امجد خان نے دروازہ کھولنے سے پہلے پوچھا "کون ہو بھئی تم؟ آدھی رات کو یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

بادل نے آہستہ سے کہا "میں بادل ہوں امجد خان۔"

دروازہ جلدی سے کھول کر لمبی داڑھی اور گھنی گھنی مونچھوں والے امجد خان نے کہا "اندر آجاؤ۔"

وہ بادل کو اپنی کوٹھڑی میں لے گیا۔ اندر جاتے ہی امجد خان نے دیوار والی بتی کا بٹن دبا دیا کوٹھڑی میں روشنی ہو گئی۔ امجد آنکھیں ملتا ہوا بولا "خریت بالکل نہیں ہو گی جو تم اتنی رات گئے یہاں آئے ہو۔ کیا پولیس تمہارے پیچھے لگی ہے؟"

بادل نے کہا "پولیس میرے پیچھے نہیں ہے۔ گھر میں تمہارے پاس ایک بڑے ضروری کام سے آیا ہوں۔"

امجد خان نے دروازے کی کنڈی اندر سے لگا دی تھی۔ چارپائی پر سے کھیس پیچھے ہٹا دیا۔ بادل کو لوہے کی کرسی پیش کی اور خود چارپائی پر بیٹھتے ہوئے سگریٹ سلگا کر بولا "یہ تم نے سادھو والا بھیس پولیس سے بچنے کے لیے نہیں تو کس لیے اختیار کر رکھا ہے؟"

تب بادل نے امجد خان کو ساری بات کھول کر بیان کر دی۔ امجد خان بڑے غور سے بادل کی باتیں سنتا رہا پھر سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولا "میرے دوست! تمھیں معلوم ہی ہے کہ میں نے پرانی زندگی سے توبہ کر لی ہے اور یہاں اپنے بچوں کے ساتھ شریفانہ اور گمنامی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ ابھی تک پولیس کو مجھ پر شک نہیں ہوا۔ شاید میری فائل بھی داخل دفتر کر دی گئی ہو۔ میں سوئی ہوئی زندگی کو پھر سے نہیں جگانا چاہتا۔ ہاں اگر تمھاری زندگی خطرے میں ہوتی تو میں دریغ نہ کرتا لیکن میں تم سے یہی کہوں گا کہ دوسروں کی خاطر اپنے آپ کو خطرے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہ ڈالو۔"

بادل نے کہا "امجد خان! نجمی اور ندیم میرے لیے غیر نہیں ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ دونوں مسلمان ہیں اور پاکستان سے ان کا تعلق ہے اور پاکستان کے لیے تو تم بھی ہمیشہ سے جذباتی رہے ہو۔"

امجد خان بولا "وہ تو میں اب بھی ہوں مگر ندیم جہاں قید ہے وہاں کوئی چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔ وہ جگہ سول پولیس کی انٹیلی جنس کے پاس ہے اور وہاں ملٹری انٹیلی جنس کی بھی نگرانی ہے اور دن رات پہرہ لگا ہوتا ہے۔"

بادل نے کہا "امجد خان! نجمی اور ندیم اب واپس پاکستان جانا چاہتے ہیں۔ ایک مسلمان ہونے کے ناطے ہمارا فرض بنتا ہے کہ انھیں اس جہنم سے نکال کر پاکستان پہنچانے میں ان کی مدد کریں۔"

امجد خان خاموش تھا۔ بادل نے کہا "نجمی کی ایک سہیلی شبانہ بھی ہمارے پاس ہے۔ اس پر یہاں بھارت میں نجمی اور ندیم کی طرح بڑا ظلم ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان لوگوں کی بڑی ہمت ہے کہ وہ اب تک زندہ ہیں۔ نجمی نے تو خیر میرے ساتھ بندوق اٹھالی تھی اور اپنے دشمنوں سے انتقام لے لیا ہے۔ لیکن ندیم پر اب بھی تشدد کیا جا رہا ہے۔ اگر ہم نے اسے انڈین پولیس کی قید سے نہ نکالا تو وہ وہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گا۔ یہ لوگ پاکستان کے شریف مسلمان گھرانوں کے فرد ہیں۔ ایک غلطی ان سے ہو گئی جس کی سزا یہ کافی بھگت چکے ہیں۔"

امجد خان نے سگریٹ کا کش لگایا۔ اوپر منہ کر کے دھواں چھوڑا اور بادل کی طرف دیکھے بغیر بولا "میں تمھارے لیے چائے لاتا ہوں۔ باقی باتیں بعد میں کریں گے۔ اتفاق سے میرے بچے کانپور گئے ہوئے ہیں۔ اس وقت میں گھر میں اکیلا ہی ہوں۔ مگر تمھارے لیے چائے ابھی بنا کر لے آؤں گا۔"

بادل نے کہا "چائے بعد میں پی لیں گے۔ سب سے پہلے تو میں نجمی کو بھیروں جی کے مندر سے یہاں لانا چاہتا ہوں۔ میں تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ تم گھر پر ہی ہو۔"

امجد خان ماچس کھڑکا کر جیب میں ڈالتے ہوئے بولا "میں چائے بناتا ہوں تم نجمی کو جا کر لے آؤ۔"

بادل اسی وقت بھیروں جی کے مندر کی طرف چل دیا۔ رات ڈھلنے لگی تھی مشرق کی طرف

ستاروں کا نیلا رنگ سفید پڑ رہا تھا۔ بھیروں جی کے مندر میں ابھی تک خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بادل نے نجمی کو جگا کر اپنے ساتھ لیا اور سیدھا امجد خان کے کوارٹر میں آ گیا۔ امجد خان چائے بنا کر لے آیا۔ اس نے نجمی کو سلام کیا اور کہا "جوگن کے بھیس میں دیکھ کر مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ کا نام سن کر بنگال اور بہار کی پولیس لرز جاتی ہے۔"

نجمی امجد خان کو اس سے پہلے مل چکی تھی اور دو ایک بار بادل کو ملنے ان کے ٹھکانے پر بھی آیا تھا وہ امجد خان کا بڑا احترام کرتی تھی۔ کیونکہ وہ ایک وفادار با اعتبار اور بہادر انسان تھا۔ اس نے کہا "امجد بھائی یہ بھیس میں نے اس شخص کے لیے رچایا ہے جس کے ساتھ میں یہاں سے واپس پاکستان جانا چاہتی ہوں۔"

امجد خان چائے کے ساتھ رات کے بنائے ہوئے پراٹھے گرم کر کے لے آیا تھا۔ وہ چائے پیتے ہوئے آپس میں باتیں کرنے لگے۔ امجد خان ندیم کو پرانے قلعے والے کھنڈر سے نکالنے میں ان کی مدد کرنے پر تیار ہو گیا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ اس نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا "چندا بہن!"

نجمی نے امجد خان کی بات کاٹتے ہوئے کہا "امجد بھائی! تم مجھے نجمی کہو۔ کیونکہ تم جانتے ہو چندا میرا اصلی نام نہیں ہے۔"

امجد خان نے بادل کی طرف دیکھا۔ دونوں ذرا سا مسکرائے۔ امجد نے پیالی تپائی پر رکھ دی اور جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکالتے ہوئے بولا "نجمی بہن! میں یہ کہہ رہا تھا کہ میری اطلاع کے مطابق ندیم کو اس بار جس کھنڈر کے تہہ خانے میں بند کیا گیا ہے وہاں باہر کا کوئی آدمی نہیں جا سکتا۔ انٹیلی جنس کے افسر بھی شناختی کارڈ کے بغیر نیچے نہیں جا سکتے۔"

بادل بولا "اس کے باوجود مجھے معلوم ہے کہ تمھارا دلی شہر کے جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ بڑا اثر و رسوخ ہے۔ یہ لوگ ہماری بڑی مدد کر سکتے ہیں۔ کوئی ایسا راستہ تلاش کرو کہ ہم میں سے کوئی ایک تہہ خانے تک جا سکے۔ اس کے آگے جو ہوگا ہم اسے سنبھال لیں گے۔"

امجد خان سگریٹ سلگا کر بولا "وہاں تک کسی باہر کے آدمی کا پہنچنا ہی تو مشکل ہے۔"

نجمی نے کہا "امجد بھائی! ندیم میرا منگیتر ہے میں اس کے ساتھ شادی کر کے پاکستان میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آباد ہونا چاہتی ہوں۔ کیا تم اس لڑکی کی مدد نہیں کرو گے جسے تم نے بہن کہہ کر پکارا ہے؟"

امجد خان نے اپنی گردن اچانک اوپر اٹھائی۔ نجمی کے سر پہ ہاتھ رکھا اور جذبات سے کپکپاتی آواز میں بولا۔

"تمھیں بہن کہا ہے تو بھائی بن کر اپنا فرض نبھاؤں گا۔ تمھاری عزت اور تمھاری خوشی کی خاطر میں اپنی جان بھی قربان کر دوں گا۔"

نجمی اور بادل پر بھی رقت سی طاری ہو گئی۔ امجد خان نے سگریٹ پاؤں تلے مسل ڈالا اور صافے سے اپنی مونچھیں صاف کرتے ہوئے بولا۔

"تم لوگ میرے کوارٹر میں ہی رہو۔ میں دن نکلتا ہے تو اپنے ایک خاص آدمی کے پاس جا کر بات کرتا ہوں۔ خدا نے چاہا تو کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور نکل آئے گا۔ ویسے تم لوگ یہ جوگیوں والے کپڑے تبدیل کر لو۔ اس کی ضرورت نہیں ہے میں تمھیں دوسرے کپڑے لا کر دیتا ہوں۔"

جب دن نکل آیا تو امجد خان نجمی اور بادل کو اپنے کوارٹر میں ہی چھوڑ کر اپنے خاص دوست کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا جو شہر میں واقع تھا جاتے ہوئے وہ کوارٹر کو باہر سے تالا لگا گیا تھا اور اس نے نجمی اور بادل کو تاکید کر دی تھی کہ وہ اندر خاموش بیٹھے رہیں۔ بادل اور نجمی نے گیروے کپڑے اتار کر دوسرا لباس پہن لیا تھا۔ وہ دونوں بند کوٹھڑی میں بیٹھے امجد خان کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ دو گھنٹے کے بعد امجد خان واپس آیا۔ کوٹھڑی میں آتے ہی بولا۔

"ندیم کو پولیس آج دوپہر ایک بجے واپس کلکتے لے جا رہی ہے۔"

نجمی اور بادل امجد خان کا منہ تکنے لگے۔ امجد خان نے کہا۔

"یہ بڑی پکی اطلاع ہے جو میرے دوست نے مجھے دی ہے وہ وہیں پرانے قلعے میں ہوتا ہے اس نے بتایا ہے کہ ندیم کو خاص پولیس گارڈ کی حفاظت میں آج ایک بجے والی کلکتہ.... ایکسپریس میں لے جایا جا رہا ہے۔"

نجمی کچھ سوچ رہی تھی۔ بادل بھی دانتوں سے ناخن کاٹنے لگا۔ امجد خان بولا "اب بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ تم جیسے کہتے ہو میں ویسے ہی کر دوں گا۔"

بادل کہنے لگا "ندیم کے ساتھ پولیس کی کتنی نفری ہو گی؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔" امجد خان بولا۔ "لیکن ندیم خطرناک جاسوس ہے جیسا کہ یہاں کی پولیس سمجھتی ہے۔ دس بارہ آدمیوں سے کم ساتھ نہیں ہوں گے۔ اسلحہ بھی ان کے پاس کافی ہو گا۔"

نجمی نے پوچھا "ندیم کو ہتھکڑی بھی لگی ہو گی کیا؟"

"وہ تو ضرور لگی ہو گی۔" امجد خان نے جواب دیا۔

بادل کچھ بے چین سا ہو کر کہنے لگا

"یہی موقع ہے اگر ہم نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ندیم کو آزاد نہ کرایا تو پھر شاید وہ ہمیشہ کے لیے ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

یہاں امجد خان نے لقمہ دیتے ہوئے کہا "تمھارا اندازہ بالکل درست ہے بادل۔ مجھے میرے آدمی نے یہ بھی بتایا ہے کہ پولیس ندیم سے اپنے مطلب کی باتیں اگلوانے میں کامیاب نہیں ہو سکی اور کلکتہ اسے صرف اس لیے لے جایا جا رہا ہے کہ وہاں جیل میں اسے خفیہ طور پر پھانسی دے دی جائے گی۔ پہلے ندیم کو پرانے قلعے میں ہی ہلاک کر دینے کا پروگرام تھا مگر دلی پولیس نے ندیم کے مسلمان ہونے کی وجہ سے کچھ ہچکچاہٹ کا اظہار کیا ہے۔ شاید اسے خطرہ تھا کہ بات یہاں کے مسلمان اخباروں تک پہنچ جائے گی۔ چنانچہ اب اسے بنگال میں لے جا کر پھانسی دے دی جائے اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہو گی۔"

نجمی تڑپ اٹھی۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے لباس میں چھپائے ہوئے ریوالور پر چلا گیا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگی تھیں۔ دانت پیستے ہوئے بولی "میں ندیم کو پھانسی نہیں لگنے دوں گی۔ چاہے اس کے لیے مجھے ساری بنگال پولیس کو قتل کر دینا پڑے۔ چاہے اس کو قتل کرتے ہوئے میں خود ہی ختم ہو جاؤں۔"

بادل نے جلدی سے کہا "ایسا وقت نہیں آئے گا۔ ہم ندیم کو پولیس کے نرغے سے نکال لے جانے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔"

امجد خان بولا "یہی میں قیمتی مشورہ دینا چاہتا تھا۔ یوں سمجھ لو کہ یہ تم لوگوں کے لیے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آخری چانس ہے۔ اگر میری خدمت کی ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ میں اپنی بہن کی خوشی کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار رہوں۔"

نجمی نے امجد خان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں امجد بھائی میں تمھارے گھر کے سکون کو برباد نہیں کرنا چاہتی۔ یہ کام ہم خود کر سکتے ہیں۔ تمھارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے ہمیں ایک بڑی اہم خبر لا کر دی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی نجمی نے بادل کی طرف دیکھ کر کہا "ہم گارڈ پر حملہ کریں گے۔"

بادل کی آنکھیں ایسے چمک اٹھیں جیسے شیر نے جنگل میں اپنا شکار دیکھ لیا ہو۔ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ندیم کو پھانسی پر لٹکانے والا ابھی پیدا نہیں ہوا۔"

پھر وہ تینوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور تیزی سے مشورہ کرنے لگے کہ انھیں اپنے پروگرام پر کس طریقے سے عمل کرنا ہوگا۔ وقت بہت کم تھا۔ اس وقت دن کے نو بج رہے تھے۔ پورے ایک بجے کی کلکتہ ایکسپریس سے پولیس گارڈ نے ندیم کو لے کر کلکتے روانہ ہو جانا تھا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ بادل خفیہ ٹھکانے پر جا کر اپنے آدمیوں کو اپنی مدد کے لیے لا سکتا۔ ان دونوں کو ہی سب کچھ کرنا تھا۔ وہ امجد خان کی زندگی کو ایک بار پھر پولیس کے حوالے نہیں کرنا چاہتے تھے۔

نجمی نے کہا "اس سے پہلے کونسی ٹرین کلکتہ جاتی ہے؟"

امجد خان کہنے لگا "سیدھی کوئی ٹرین ایک بجے سے پہلے کلکتہ نہیں جاتی۔ دس بجے پٹنہ ایکسپریس چلتی ہے۔"

نجمی نے فوراً کہا "ٹھیک ہے۔ ہم دس بجے والی ٹرین میں پٹنہ کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ دھنباد کے اسٹیشن پر اتر کر ہم کلکتہ ایکسپریس کا انتظار کریں گے۔ وہاں سے کلکتہ ایکسپریس میں سوار ہو جائیں گے اور گوماہ اسٹیشن سے دو میل پہلے جنگل شروع ہوگا تب ہم ندیم کے ڈبے میں پہنچ کر اندھا دھند فائرنگ کر کے اسے چھڑا کر اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ گوماہ کے جنگل میں ہی ہمارا خفیہ ٹھکانا موجود ہے۔"

امجد خان بولا "مگر نجمی بہن! یہ بات بھول گئی ہو کہ کلکتہ ایکسپریس میل ٹرین ہے اور گیا کے اسٹیشن پر پٹنہ ایکسپریس روک دی جاتی ہے تاکہ کلکتہ ایکسپریس کو آگے نکل جانے کا

موقع دیا جا سکے۔"

نجمی اور بادل ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ بادل نے سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا "نہیں نہیں۔ ہمیں یہ رسک نہیں لینا چاہیئے۔ ہم کلکتہ ایکسپریس میں ہی سوار ہو کر سفر کریں گے۔ ہم ندیم کے ساتھ والے ڈبے میں بیٹھنے کی کوشش کریں گے اور پھر گوماہ کے جنگل میں گاڑی کے پہنچنے پر حملہ کر دیں گے۔ اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

امجد خان کہنے لگا "بادل خان! تمھیں بڑا سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سانپ بھی نہ مرے اور لاٹھی بھی ٹوٹ جائے۔"

اس پر نجمی نے جذباتی انداز میں کہا

"امجد بھائی! اب سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ حملہ کرنے کا وقت ہے۔ ہم حملہ کریں گے۔"

بادل کے ذہن میں اچانک ایک خیال چمک اٹھا۔ اس نے امجد خان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"امجد خان کیا دلی میں مجھے فوجی وردی مل جائے گی؟"

نجمی اور امجد خان بڑی تعجب تیز نظروں سے بادل کی طرف دیکھنے لگے کہ یہ فوجی وردی کا معاملہ بیچ میں اچانک کہاں سے آ گیا؟ اس نے لٹکے ہوئے منہ سے پوچھا "فوجی وردی تمھیں کس لیے چاہیئے؟"

بادل ابھی تک اپنے خیال میں تھا کہنے لگا "تم مجھے یہ بتاؤ میرے دوست کہ یہاں سے کس جگہ سے انڈین کیپٹن کی فل وردی مل سکتی ہے؟"

نجمی نے پوچھا "تم انڈین کیپٹن کی وردی پہن کر کیا کروگے؟"

بادل بولا "ایک اسکیم میرے ذہن میں آ چکی ہے۔" پھر وہ امجد خان کی طرف متوجہ ہوا۔ "دوست! اگر تم مجھے کسی سے انڈین فوجی کیپٹن کی وردی لا دو تو میں ندیم کو پھانسی کے تختے سے اتار لاؤں گا۔"

پھر اس نے نجمی اور امجد خان کو اپنی پوری اسکیم سمجھائی۔ اسکیم اگرچہ خطرناک تھی لیکن اس میں امید کی کرن روشن تھی۔ امجد خان کہنے لگا "یہاں کے ایک بازار میں فوجی نشان، ٹوپیاں اور جوتے اور بیلٹ وغیرہ مل جاتی ہیں مجھے یقین ہے کہ وردی بھی مل جائے گی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بادل بولا " تو پھر ابھی جاؤ ۔ ہمارے پاس وقت بالکل نہیں ہے ۔"

امجد خان اسی وقت نکل گیا ۔ کوئی پون گھنٹے بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا ۔ کوٹھڑی میں آکر اس نے تھیلا کھولا تو اس میں کیپٹن کی پوری وردی تھی ۔ بٹالین کے نشان اور کیپٹن کے تین پھول بھی تھے ۔ ایک خاکی ٹوپی بھی تھی ۔ امجد خان نے بتایا کہ اسے تین چار دکانوں پر تلاش کرنے کے بعد وردی پوری کرنی پڑی ہے ۔ بادل نے اسی وقت وردی پہن لی ۔ وردی اسے تقریباً فٹ ہی تھی ۔ نجمی اسے غور سے دیکھ رہی تھی ۔ کہنے لگی " تم تو بالکل انڈین کیپٹن لگتے ہو "

بادل بولا " اب تم بھی جلدی سے تیار ہو جاؤ ۔ ہمارے پاس وقت زیادہ نہیں ہے ۔"

نجمی کے لیے امجد خان نے کالا برقعہ پہلے ہی وہاں لا کر رکھ دیا تھا ۔ یہ برقعہ امجد خان کی بیوی کا تھا ۔ نجمی نے کالا برقعہ پہن لیا ۔ امجد خان رکشا لے آیا ۔ دن کے پورے بارہ بجے وہ امجد خان کے کوارٹر سے نکل کر رکشے میں سوار ہوئے اور دلی ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے ۔ اسٹیشن پر بادل پورا فوجی کیپٹن بنا نجمی کو ساتھ لیے فرسٹ کلاس ریفریشمنٹ روم میں آگیا ۔ وہیں ایک بیرے کو بلا کر کہا " میں جلدی میں فوجی چالان بنوانا بھول گیا ہوں ۔ تم یہ روپے لے جاؤ اور ہمیں پٹنہ تک کے دو فسٹ کلاس کے ٹکٹ لا دو ۔ یہ بیس روپے تمھارا انعام ہے ۔"

بیرا تھوڑی دیر میں ہی دو ٹکٹ لے آیا ۔ کلکتہ ایکسپریس کے آنے میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی تھا ۔ نجمی کالے برقعے میں بادل کی نقلی بیوی کے روپ میں اس کے پاس ہی بیٹھی تھی بادل کا بھرا ہوا ریوالور اس کی بیلٹ کے ساتھ لگا تھا جبکہ نجمی نے اپنا ریوالور اپنی قمیض کے اندر چھپا رکھا تھا ۔

بادل عین وقت پر پلیٹ فارم پر جانا چاہتا تھا ۔ کیونکہ ملٹری پولیس اسٹیشن پر موجود تھی اور اس کو چیک کیا جا سکتا تھا اور بادل کے پاس پے بک ، شناختی کارڈ اور ٹریول آرڈر قسم کے کوئی کاغذات نہیں تھے ۔ جب کلکتہ ایکسپریس پلیٹ فارم پر آکر رک گئی تو بادل فوجی کیپٹن بنا نجمی کو ساتھ لیے ریفریشمنٹ روم سے نکل کر ٹرین کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھا ۔ نجمی کو اس نے کمپارٹمنٹ میں بٹھا دیا اور خود یہ دیکھنے کے لیے کہ ندیم کو کونسے ڈبے میں سوار کرایا جا رہا ہے پیچھے ہٹ کر ٹی اسٹال کے پاس کھڑا ہو گیا ۔

اچانک ایک طرف سے دو ملٹری پولیس کے فوجی نمودار ہوئے ۔ بادل محتاط ہو گیا ۔ دونوں نوجوانوں نے

بادل کو زور سے ایڑیاں جوڑ کر سیلوٹ مارا اور آگے نکل گئے ۔ بادل نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بلا ٹل گئی تھی ۔ اس کی آنکھیں ٹرین کے ایک ایک ڈبے کا جائزہ لے رہی تھیں ۔ پولیس کی گارڈ ابھی تک ندیم کو لے کر وہاں نہیں آئی تھی ۔

بادل بے چین سا ہونے لگا ۔ کہیں دلی پولیس نے ندیم کو لے جانے کا پروگرام منسوخ تو نہیں کر دیا ۔ ایسی صورت میں ساری اسکیم کے فیل ہو جانے کا خطرہ تھا ۔ بادل ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے گیٹ میں سے پولیس کے کچھ سپاہی اندر آتے نظر آئے ۔ انھوں نے رائفلیں کاندھوں سے لٹکا رکھی تھیں ۔ ایک سکھ سب انسپکٹر ان کے ساتھ تھا ۔ ان کے درمیان ندیم اس حالت میں سر جھکائے چل رہا تھا کہ اس کے ہتھکڑی لگی ہوئی تھی ۔ ندیم اور بادل کی ملاقات پہاڑی والی کمین گاہ میں ایک بار ہو چکی تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے کی شکل سے آشنا تھے مگر بادل ابھی ندیم کو اپنا چہرہ نہیں دکھانا چاہتا تھا ۔ اسے دیکھ کر بادل کی جان میں جان آگئی ۔ اب وہ اپنے منصوبے پر ہر قسم کا خطرہ مول لے کر عمل کر سکتا تھا ۔

ندیم کو پولیس کی گارڈ اپنے ساتھ لے کر ایک ڈبے میں داخل ہو گئی ۔ اس ڈبے کے باہر "پولیس" لکھا تھا ۔ اس کی ہر کھڑکی پر لوہے کی سلاخیں لگی تھیں ۔ بادل نے دیکھا کہ یہ ڈبہ [illegible] فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ سے تین ڈبے چھوڑ کر پیچھے تھا ۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا اپنے ڈبے میں آگیا ڈبے میں ایک لالہ اور اس کی بیوی بھی سوار تھی ۔ ایک فوجی کو اندر آتا دیکھ کر ہندو لالے نے ہاتھ جوڑ کر مسکراتے ہوئے نمسکار کہا ۔ بادل نے سر ہلا کر اس کے نمسکار کا جواب دیا اور نجمی کے قریب ہو کر بیٹھ گیا ۔ نجمی نے نقاب ڈال رکھا تھا اور کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی ۔

بادل نے بھی باہر دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا " پولیس اسے لے آئی ہے ۔ ہم سے تین ڈبے چھوڑ کر پیچھے ہے ۔"

سارے منصوبے کی ایک ایک تفصیل طے تھی ۔ کہاں کس نے کیا کرنا ہے ۔ پہلے سے طے کر لیا گیا تھا ۔ تمام اسٹیشنوں کے نام بادل اور نجمی نے ازبر کر لیے تھے ۔ آخر انجن نے وسل دی گارڈ نے سیٹی بجائی اور پھر کلکتہ ایکسپریس چھک چھک کرتی پلیٹ فارم پیچھے چھوڑتی چلی گئی ۔ اس ٹرین کو ہاپڑ ، مراد آباد ، بریلی اور شاہجہان پور سے ہوتے ہوئے لکھنؤ اور پھر وہاں سے کانپور ،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

الٰہ آباد، بنارس، پٹنہ سے ہوتے ہوئے گیا اور آگے دھنباد، درگاپور، بردوان اور کلکتے پہنچ
تھا۔ بادل اور نجمی کو اپنا آپریشن دھنباد ریلوے اسٹیشن پر شروع کرنا تھا۔ کیونکہ اس اسٹیشن سے
تھوڑی دور آگے گوماہ کا چھوٹا دیہاتی اسٹیشن تھا جہاں کلکتہ ایکسپریس نہیں ٹھہرتی تھی اور نجمی
اور بادل کی خفیہ کمین گاہ کو گوماہ اسٹیشن سے راستہ ایک جنگل سے ہو کر جاتا تھا۔ یہ ایک دن
اور ایک رات کا سفر تھا۔ دن کے ایک بجے ٹرین دلّی سے چلی۔

وہ دن گزر گیا۔ پھر رات آئی۔ رات بھی گزر گئی۔

دوسرے دن دوپہر کے بعد ٹرین بہار کے مشہور مذہبی شہر گیا پہنچی۔ اسی شہر میں وہ مقدس
درخت تھا جس کے نیچے مہاتما گوتم بدھ کو گیان حاصل ہوا تھا۔ اب اگلا بڑا اسٹیشن دھنباد
تھا۔ بادل نے نجمی کو ہوشیار کر دیا۔ دونوں نے باری باری ٹائلٹ میں جا کر اپنے اپنے ریوالور
میگزین چیک کیا۔ اس دوران بادل نے بے حد احتیاط سے کام لیا تھا۔ وہ تین چار مرتبہ راستے
میں پلیٹ فارم پر اترا ضرور تھا مگر جان بوجھ کر پولیس کے ڈبے کے آگے سے نہیں گزرا تھا۔
اس نے ہر بار دور ہی سے یہ دیکھ کر تسلی کر لی تھی کہ ندیم پولیس کے ڈبے میں موجود ہے۔

دھنباد کا اسٹیشن ابھی نہیں آیا تھا کہ شام کا اندھیرا چھانے لگا۔ کمپارٹمنٹ کی بتیاں جل اٹھیں۔
تھوڑی دیر بعد ٹرین کی رفتار ہلکی ہونے لگی۔ بادل اٹھ کر کمپارٹمنٹ کی راہداری میں گیا۔ اس نے
دیکھا کہ اسٹیشن دھنباد کی روشنیاں قریب آ رہی تھیں۔ ٹرین ریلوے یارڈ میں سے گزر رہی تھی۔
بادل خاموشی سے واپس آ کر نجمی کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کی طرف جھک کر آہستہ سے بولا "دھنباد
آ رہا ہے۔"

ٹرین دھنباد کے اسٹیشن پر رک گئی۔ بادل نے نجمی کو سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ ٹرین کے رکنے کے بعد
بادل کمپارٹمنٹ میں ہی بیٹھا رہا۔ یہاں ٹرین پندرہ منٹ رکتی تھی۔ پانچ منٹ بعد بادل ڈبے
سے نکل کر پلیٹ فارم پر آ گیا اور سامنے ایک گارڈ کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہ تین ڈبے
چھوڑ کر پیچھے پولیس کے ڈبے پر لگی تھی۔ پھر انجن نے وسل دی۔ گارڈ نے تیسری بار سیٹی بجائی تو
ٹرین چل پڑی۔ بادل اپنی جگہ پر ہی کھڑا رہا۔ ٹرین کی رفتار ذرا تیز ہوئی تو وہ ٹرین کی طرف
دوڑا۔ ٹرین کی رفتار تیز ہو چکی تھی۔ بادل پولیس کے ڈبے کے سامنے آ گیا۔ وہ ڈبے کی طرف

بڑھا۔ وہاں ایک سپاہی کھڑا تھا۔ ایک فوجی افسر کو سپاہی دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ بادل جلدی سے
پولیس کے ڈبے میں گھس گیا اور بولا "مائی گارڈ! میں اسٹال پر چائے پی رہا تھا کہ ٹرین چل
پڑی۔ آپ کا دھنواد دوستو!"

سکھ پولیس انسپکٹر نے مسکرا کر کہا "سر! یہاں بیٹھ جائیے۔ یہ بھی آپ کا ہی ڈبہ ہے۔"
بادل کی فوجی وردی نے سب کو مرعوب کر دیا تھا۔ اس نے ندیم کی طرف دیکھا۔ دونوں نے
ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ ندیم کے دل میں امید کی کرن جاگ اٹھی تھی۔

سکھ سب انسپکٹر نے بادل کو پھل پیش کرتے ہوئے کہا "سر! کلکتے جا رہے ہیں؟"
بادل نے سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اپنی ٹانگیں پھیلا دیں اور کہا "جی ہاں۔ وہاں سے مجھے آسام
جانا ہو گا۔ آج کل ہماری بٹالین وہاں ایکسرسائز کر رہی ہیں۔"

ٹرین نے رفتار پکڑ لی تھی۔ دھنباد کا اسٹیشن پیچھے رہ گیا تھا۔ اب گوماہ کا اسٹیشن زیادہ دور
نہیں تھا۔ یہاں ٹرین نہیں رکتی تھی۔ بادل نے سارا حساب لگا رکھا تھا۔ پورے پانچ منٹ کے بعد اس
نے ٹرین کی زنجیر کھینچ دینی تھی۔ اس نے پولیس گارڈ اور موقع کا پورا جائزہ لے لیا تھا۔ تین منٹ
بعد وہ سیٹ پر سے اٹھ کر ڈبے کے دروازے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک منٹ بعد اس نے ٹوپی
اتاری اور اسے جان بوجھ کر ٹرین سے باہر گرا دی۔ پھر خود ہی چلّا کر بولا "میری ٹوپی گر
گئی ہے۔"

اور ساتھ ہی اس نے زنجیر کھینچ دی۔ سب انسپکٹر سکھ اور پولیس کے دوسرے سپاہی ابھی سنبھلنے
بھی نہ پائے تھے کہ بادل نے ریوالور تان لیا اور چلّا کر کہا "اگر کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلا تو میں گولی
چلا دوں گا۔"

سکھ سب انسپکٹر کی موت آ چکی تھی۔ اس نے اپنے پستول والی بیلٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی
تھا کہ بادل نے فائر کر دیا۔ دوسرے لمحے سکھ سب انسپکٹر کی لاش خون میں لت پت اپنی سیٹ
پر اوندھی پڑی تھی۔

-- -- ۔۔۔ -- --

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سکھ سب انسپکٹر کی موت کی دہشت ابھی کم نہیں ہوئی تھی کہ بادل نے اوپر سے فائر کر کے تین مزید بھارتی سپاہیوں کو موت کی نیند سُلا دیا۔ پستول تان کر ندیم کی ہتھکڑی کھلوائی۔ ایک رائفل اپنے کاندھے سے لٹکائی۔ ایک رائفل ندیم کی طرف اچھالی اور چلّا کر کہا۔

”میرے ساتھ نیچے چھلانگ لگا دو۔“

پولیس گارڈ کے باقی سپاہی دہشت زدہ ہو کر ڈبے کے کونے میں دبکے ہوئے تھے۔ بادل نے ان کی طرف ریوالور کی نالی کا رخ کیا اور گرجدار آواز میں کہا ”اگر کوئی اپنی جگہ سے ہلا تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

پھر اس نے باقی کی ساری رائفلیں اٹھا کر ٹرین سے باہر پھینک دیں۔ ٹرین کی رفتار آہستہ ہو گئی تھی۔ وہ رکنے ہی والی تھی کہ بادل اور ندیم ڈبے سے باہر دوسری طرف کود گئے۔

جھاڑیوں میں گرتے ہی بادل اٹھا اور آگے کی طرف دوڑا۔ ندیم رائفل اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ بادل نے خوف طاری کرنے کے لیے رائفل کے دو فائر اوپر تلے داغ دیئے۔ وہ نجمی کے کمپارٹمنٹ کے پاس آ کر رک گیا۔ نجمی نے بھی ڈبے میں سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ اس نے برقعہ وہیں اتار کر پھینک دیا تھا۔

ندیم نے رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں بھی نجمی کو پہچان لیا۔ نجمی کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے ندیم کی طرف آتے ہوئے کہا۔

”یہاں سے نکل چلو۔“

اور وہ تینوں جھاڑیوں والی ڈھلان پر سے دوڑتے ہوئے کھیتوں میں آ گئے اور پھر

کھیتوں میں بھاگتے گئے۔ انھیں معلوم تھا کہ انھیں کہاں جانا ہے۔ یہ کھیت کچھ دور تک جاتے تھے۔ پھر آگے گوماہ کا خطرناک جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ جہاں آدمی دن کے وقت بھی جاتے ہوئے گھبراتا تھا۔ وہ کھیتوں کے اندھیرے میں گم ہو چکے تھے۔ ٹرین پیچھے رک گئی تھی۔

جنگل میں داخل ہونے سے پہلے بادل، ندیم اور نجمی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دور کھیتوں کے پار رات کے اندھیرے میں کلکتہ ایکسپریس کی بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ پھر وہ جنگل میں داخل ہو گئے۔

بادل اور نجمی اس خطرناک جنگل کے چپے چپے سے واقف تھے۔ وہ رات کے اندھیرے میں بھی اپنی کمین گاہ تک پہنچ سکتے تھے۔ ندیم ان کے درمیان میں چل رہا تھا، وہ کچھ دور تک جنگل کی فائر لائن پر چلتے رہے پھر ایک باولی کے قریب سے ہوتے ہوئے ڈھلان سے اُتر کر گھاٹی میں آ گئے۔ گھاٹی کو پار کر کے سامنے والی پہاڑی پر چڑھے۔ وہاں سے دوسری طرف اترے تو سال اور دیودار کا گھنا تاریک جنگل منہ پھاڑے سنسنا رہا تھا۔ نجمی نے ندیم کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے خوشی ہے کہ تم پھر ہمارے پاس آ گئے ہو۔ اس جنگل میں درندوں کا خطرہ ضرور ہے مگر ہمارے پاس اسلحہ موجود ہے۔ تم گھبراؤ گے تو نہیں۔“

ندیم بھی کافی سختیوں سے گزر چکا تھا۔ اس نے نجمی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ نجمی کا وہ ہاتھ نہیں تھا جو کبھی لاہور میں ہوا کرتا تھا اب یہ ہاتھ کھردرا اور سخت ہو گیا تھا۔ اس نے نجمی کی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”سب سے زیادہ خوشی تو مجھے ہو رہی ہے کہ تم میرے پاس ہو نجمی۔ اگر تمھارا ہاتھ ہاتھ میں ہو تو میں موت کی وادی میں سے بھی بے خوف و خطر گزر سکتا ہوں۔“

بادل دیودار کے اونچے درختوں کی طرف بڑھتے ہوئے بولا ”ہمیں سال بنی کی طرف نہیں جانا ہو گا۔ وہاں اس وقت شیر کے نکلنے کا خطرہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہمیں رائفل کا فائر کرنا پڑے“ نجمی اس کے قریب آ گئی تھی۔ کہنے لگی۔

”بائیں جانب گھاس پٹی کی طرف چلو۔ ادھر سے ہم کالی چٹانوں کی طرف نکل جائیں گے۔“

اور وہ سال بنی کے راستے سے ہٹ کر گھاس پٹی کی طرف چل پڑے۔ جنگل میں چاروں طرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مگر اس اندھیرے میں بھی نجمی اور بادل کو راستہ نظر آرہا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹہ وہ سال کے دیوقامت درختوں کے نیچے جنگلی جھاڑیوں کے درمیان چلتے رہے۔ پھر گھاس پٹی کا علاقہ شروع ہوگیا۔ یہ گھاس کا ایک غیر ہموار میدان تھا گھاس اتنی اونچی تھی کہ اس میں سے گزرتے وقت ان کی صرف گردنیں ہی باہر تھیں۔ بادل رائفل ہاتھ میں لیے آگے آگے چل رہا تھا۔ گھاس کے اس میدان کے بیچ میں جنگلی جانوروں کے چلنے پھرنے کی وجہ سے ایک قدرتی چھوٹی سی پگڈنڈی بن گئی تھی۔ یہ لوگ اس پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ گھاس کا یہ سمندر ختم ہوا تو چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ خطرناک سال بنی ان کی دائیں جانب کافی پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ سانس لینے کے لیے ایک جگہ بیٹھ گئے۔ دائیں جانب سال بنی کی طرف سے کسی شیر کی ہلکی سی دھاڑ سنائی دی۔ نجمی نے کہا۔

،، جنگل کا بادشاہ اپنے شکار کی تلاش میں نکل آیا ہے۔،،

بادل بولا ’’ اس کا ایک فائدہ ہوگا کہ آگے ہمیں کوئی ریچھ یا دوسرا چھوٹا درندہ نہیں ملے گا۔ ہمیں اب آگے چلنا چاہیئے۔،،

وہ اٹھے اور ٹیلوں کے درمیان سے گزرنے لگے۔ اسی طرح چلتے چلتے آخر وہ کالی چٹانوں کے پاس آگئے۔ یہ کالی چٹانیں رات کے اندھیرے میں اور زیادہ سیاہ لگ رہی تھیں۔ ان کو پیچھے چھوڑتے ہوئے بادل، ندیم اور نجمی آخر اس اونچی چٹان کی طرف بڑھے جس کے غار میں ان کی کمین گاہ تھی۔ وہ چٹان کے قریب پہنچے ہی تھے کہ دو آدمی درختوں پر سے کود کر ان کے سامنے آگئے۔ نجمی نے کہا۔

،، پیچھے ہٹ جاؤ۔،،

یہ ان کے اپنے گروہ کے آدمی تھے جو کمین گاہ سے چند قدم دور جنگل میں پہرہ دے رہے تھے۔ اپنے سردار کی آواز سن کر دونوں ڈاکو پیچھے ہٹ گئے۔ انھوں نے بادل اور نجمی کو نمسکار کیا۔ کیونکہ اب نجمی کے گروہ میں بادل کے سوا دوسرا کوئی مسلمان نہیں تھا۔ سب ہندو جرائم پیشہ آدمی تھے۔ کمین گاہ میں شبانہ ان کا انتظار کررہی تھی۔ لالٹین روشن تھی اور باہر ڈاکو.. آگ پر کھانا وغیرہ تیار کررہے تھے۔ شبانہ آگے بڑھ کر نجمی سے گلے ملی۔ ندیم کو دیکھا تو اس کی

خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ ندیم نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ شبانہ سے ہاتھ ملایا۔

،، شبانہ! تمھیں یہاں محفوظ دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم بھی یہاں ہو۔ نجمی نے مجھے بتایا تھا۔،،

نجمی بادل کو لے کر دوسرے ڈاکوؤں کی طرف چلی گئی۔ شبانہ اور ندیم غار میں آکر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ ندیم سخت تھک گیا تھا۔ شبانہ نے مٹی کے پیالے میں اسے پانی لاکر دیا۔ پانی پی کر ندیم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا ’’ نجمی اب میرے ساتھ جانے پر تیار ہے‘‘

شبانہ ندیم کے پاس ہی بیٹھ گئی اور بولی ’’ اگر تیار نہ ہوتی تو تمھیں موت کے منہ سے نکال کر کس لیے لاتی ہے۔ اب وہ یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ اس نے مجھے بتادیا ہے کہ وہ اپنے تمام دشمنوں کو ٹھکانے لگا چکی ہے اور اب وہ ہمارے ساتھ واپس پاکستان جانا چاہتی ہے۔،،

ندیم نے کہا ’’ خدا کا شکر ہے کہ میں جس مشن کو لے کر آج سے کافی عرصہ پہلے لاہور سے چلا تھا۔ اور اس ملک میں آکر انتہائی سنگین تشدد برداشت کرتا رہا ہوں، آج اس میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ میں نجمی کو واپس لے جانے کے لیے ہی یہاں آیا تھا۔ میرا مقصد بھارت کی جاسوسی کرنا نہیں تھا۔ نجمی کی زندگی کی تباہی کا میں ہی ذمہ دار ہوں۔ میری وجہ سے نجمی اس ملک میں مصیبت اور بدنامی کی زندگی بسر کررہی تھی۔ میں اس کو لیے بغیر کیسے واپس اپنے وطن جاسکتا تھا۔ میں جب بھی نجمی سے ملا اس کو واپس چلنے کا کہا مگر وہ ہمیشہ یہی کہتی رہی کہ جب تک وہ اپنی عزت کے قاتلوں کو جہنم میں نہیں پہنچا دے گی میرے ساتھ واپس نہیں جائے گی۔،،

شبانہ نے بیچ میں کہا ’’ اور میں تمھاری وفاشعاری کی بھی داد دیتی ہوں کہ تم واپس جاسکتے تھے مگر نہیں گئے۔ اور قدم قدم پر گرفتار ہوکر دشمن کی ہولناک اذیتیں برداشت کرتے رہے۔،،

ندیم بولا ’’ شبانہ! تم سے ہماری کوئی بات نہیں چھپی ہوئی۔ تم جانتی ہو کہ میں نجمی سے کس قدر پیار کرتا ہوں۔ ہم لاہور یونیورسٹی کیمپس کے وہ دن کیسے بھلا سکتے ہیں جب ہم اکٹھے کیمپس کی کینٹین میں بیٹھ کر چائے پیا کرتے تھے۔ دنیا جہان کی باتیں کیا کرتے تھے۔ قہقہے لگایا کرتے تھے۔ پھر ہم سے ایک بھول ہوگئی۔ میں نے نجمی کو مجبور کردیا کہ وہ اپنے شریف ماں باپ کے گھر کی دہلیز سے باہر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قدم نکالے اور میرے ساتھ کراچی بھاگ چلے۔ میری نیت نیک تھی۔ میں کراچی جاتے ہی نجمی سے نکاح کرنے کے فوراً بعد اگلے روز واپس لاہور آجانے والا تھا۔ مگر میرے نام نہاد دوست نے مجھ سے فریب کیا اور نجمی کی زندگی کا المناک باب شروع ہو گیا۔"

شبانہ نے کہا۔ "اب ہمیں ان باتوں کو بھول جانا چاہیئے۔ میں نے بھی کم تکلیفیں نہیں اٹھائیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم تینوں ساتھی ایک بار پھر ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں۔ اگرچہ یہ دشمن کا ملک ہے اور ابھی ہماری منزل ہم سے کوسوں دور ہے لیکن مجھے اللہ کے فضل سے پوری امید ہے کہ جس نے ہمیں یہاں ملا دیا ہے وہ ہمیں پاکستان بھی پہنچا دے گا۔"

"انشاء اللہ،" ندیم کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

اتنے میں نجمی اور بادل اندر آ گئے۔ بادل کے ہاتھ میں ایک کٹورا اور ایک چنگیر تھی۔ کٹورے میں ہرن کا پکا ہوا گوشت تھا اور چنگیر میں روٹیاں تھیں۔ نجمی نے ندیم اور شبانہ سے کہا "تم لوگ کھانا کھا کر آرام کرو۔"

شبانہ نے نجمی سے کہا "کیا وہ ان کے ساتھ کھانا نہیں کھائے گی۔"

جس پر نجمی نے رائفل کا بولٹ چڑھاتے ہوئے کہا "مجھے کچھ دیر کے لیے پہرہ دینا ہو گا۔ پیچھے ہم ٹرین میں چار خون کر کے آ رہے ہیں۔ پولیس ہو سکتا ہے ہماری تلاش میں ادھر نکل آئے۔ تم اطمینان سے سونا جب تک ہم زندہ ہیں تمھیں کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"

یہ کہہ کر نجمی بادل کے ساتھ غار سے باہر نکل گئی۔ نجمی کا یہ روپ شبانہ اور ندیم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ انھیں لاہور کی دُبلی پتلی نازک سی کالج کی لڑکی نجمی یاد آ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کے دل میں ایک ہی خیال تھا۔ وہ کھانا کھانے لگے۔ نجمی اور بادل کمین گاہ سے باہر چٹانوں میں بنے ہوئے مورچے میں آ کر بیٹھ گئے۔ دونوں کی رائفلوں کا رخ نیچے جنگل کے اندھیرے درختوں کی طرف تھا۔ وہاں ان کے دوسرے ساتھی پہرے پر موجود تھے۔ نجمی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"بادل! اب ہمیں یہاں سے نکل کر انڈیا کا بارڈر کراس کرنا ہے۔ تم جانتے ہو میں نے اپنا مقصد پورا کر لیا ہے۔ مجھے اب یہاں نہیں رہنا۔ میں ندیم اور شبانہ کو لے کر واپس پاکستان

جانا چاہتی ہوں۔ تم مجھے مشورہ دو کہ ہمیں کس جگہ سے انڈیا کا بارڈر کراس کرنا چاہیئے۔"

بادل ایک لمحے کے لیے سوچتا رہا۔ پھر بولا "بمبئی کی طرف سمندری راستے سے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ راجستھان اور پنجاب کی سرحدوں پر انڈیا کی فوجیں ابھی تک بیٹھی ہیں میرا مشورہ تو یہی ہے کہ تم لوگ مدراس کی طرف سے بارڈر کراس کر کے سری لنکا چلے جاؤ۔ سری لنکا آزاد ملک ہے وہاں سے تم بڑی آسانی کے ساتھ پاکستان جا سکتے ہو۔"

نجمی کہنے لگی "مدراس تک کا سفر بڑا لمبا سفر ہے۔ راستے میں جگہ جگہ ہمارے پکڑے جانے کا خطرہ رہے گا۔ دوسرے یہ بات بھی ہے کہ مدراس والوں کی ہم زبان نہیں جانتے۔ وہاں سمندر پار کر کے لنکا جانا ہو گا۔ جب تک وہاں کے اسمگلروں سے واقفیت نہ ہو ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔ یہ دشوار کام ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ ہمیں راجستھان کے علاقے سے بارڈر کراس کر کے پاکستان میں داخل ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے۔"

بادل بولا "لیکن وہاں تو میری اطلاع کے مطابق جگہ جگہ بھارتی فوج کے مورچے ہیں۔ بارڈر سیکورٹی فورس ہوتی تو اسمگلروں سے بات چیت ہو سکتی تھی مگر ۷۱ء کی جنگ کو ختم ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے۔ دونوں طرف فوجیں سرحد پر موجود ہیں۔"

نجمی خاموش ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرف سے بارڈر کراس کر کے پاکستان جا سکتی ہے۔ نیپال کا بارڈر دور تھا۔ آخر اس نے کہا۔

"پنجاب سے ہم بارڈر کراس نہیں کر سکتے بادل خان۔"

بادل منہ نیچے کر کے اس طرح سگریٹ سلگا رہا تھا کہ ماچس کی روشنی دور سے نہ دیکھی جا سکے سگریٹ سلگانے کے بعد اس نے ہلکا سا کش لگایا اور بولا "پنجاب کی سرحد پر بھی دونوں طرف فوج موجود ہے لیکن وہاں ایک سہولت ہے۔"

"وہ کیا؟" نجمی نے پوچھا۔

بادل بولا "ضلع گورداس پور میں ایک سکھ ڈاکو میرا جگری یار ہے۔ وہ تمھیں بارڈر کراس کرانے میں بڑی مدد دے سکتا ہے۔ علاقے کے سارے سکھ اسمگلر اس کے فرمانبردار ہیں۔"

"یہ سکھ ڈاکو قابل اعتبار آدمی ہے۔" نجمی نے پوچھا۔ بادل نے مسکرا کر کہا "اس کا نام

زنگو ڈکیت ہے ۔ ہے تو وہ سکھ مگر مرد کا بچہ ہے اور شروع ہی سے مسلمانوں کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا رہا ہے ۔ وہ ہندوؤں سے اس لیے ہی نفرت کرتا ہے کہ وہ بتوں کی پوجا کرتے ہیں ۔ مسلمانوں کو وہ بہت پسند کرتا ہے کیونکہ مسلمان ایک خدا کو مانتے ہیں اور بتوں کی پوجا نہیں کرتے بلکہ بتوں کو توڑ دیتے ہیں ۔ کسی زمانے میں نجیب آباد اور بھوپال میں ہم اکٹھے ایک آرڈیننس فیکٹری میں مزدوری کیا کرتے تھے تب سے لے کر اب تک ہماری دوستی ویسی ہی گہری ہے ۔ وہ بھوپال سے گورداس پور میں اپنے گاؤں چلا گیا ۔ اس کا باپ بھرالہ گاؤں کی ٹھٹھی میں ہندو زمیندار کا نوکر تھا ۔ زنگو ابھی ڈکیت نہیں بنا تھا ۔ وہ اپنے باپ کے پاس ٹھٹھی میں ہی تھا کہ ایک روز اس کے سامنے گاؤں کے ہندو زمیندار نے زنگو کے باپ کی بے عزتی کر دی اور اسے پنچ اور کمینہ کہا اور پھر بہن کی گالی دے دی ۔ زنگو سے برداشت نہ ہو سکا اس نے وہیں ہندو زمیندار کو نیچے گرا لیا اور چاقو سے اس کو ذبح کر ڈالا ۔ زنگو فرار ہو گیا ۔ اس کے بعد ہندو پولیس نے اس کے گھر والوں پر بے پناہ تشدد کیا ۔ زنگو ڈاکو بن گیا اور اس نے تھانے کے سارے ہندو سپاہیوں کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا ۔ سارے ضلع میں اس کی دہشت بیٹھ گئی ۔ لوگ اس کا نام سن کر کانپ جاتے تھے ۔ ابھی تم ہمارے گروہ میں نہیں آئی تھیں کہ ایک روز اتفاق سے بھوپال کے بازار حسن میں ایک بائی جی کے کوٹھے پر زنگو سے میری ملاقات ہو گئی ۔ ہم ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے زنگو ڈاکو بھوپال میں ایک جگہ اپنے دوست کے پاس چھپا ہوا تھا ۔ اس نے مجھے اپنے گروہ میں آنے کے لیے کہا مگر میں یہ علاقہ چھوڑ کر پنجاب نہیں جانا چاہتا تھا ۔ کچھ میری اپنی مجبوریاں تھیں ۔ لیکن کبھی کبھی ہماری ملاقات ہو جایا کرتی تھی ۔ زنگو ڈکیت آج بھی ضلع گورداس پور اور ہوشیار پور کے درمیانی نیم پہاڑی علاقے میں رہتا ہے ۔ مجھے اس کی خفیہ کمین گاہ کا علم ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تم لوگوں کو بارڈر کراس کرانے میں کافی مدد دے سکتا ہے ۔ "

نجمی نے زنگو ڈاکو کے قصے کو بڑی دلچسپی سے سنا پھر کہنے لگی ۔

" بادل ! میرا خیال ہے ہمیں یہاں سے زنگو ڈکیت کے پاس ہی جانا چاہیئے ۔ ویسے بھی پنجاب میں دریا بہتے ہیں اور وہاں سے سرحد پار کرنے کے بہت سے راستے ہمیں مل سکتے ہیں ۔ "

بادل نے جواب میں سگریٹ کا ہلکا سا کش لگا کر کہا " اگر تم تیار ہو تو ہم کل ہی یہاں سے پنجاب کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں ۔ "

دوسرے دن نجمی نے شبانہ کو اور ندیم کو پاس بٹھا کر بتا دیا کہ وہ پنجاب کے راستے بارڈر کراس کر کے پاکستان میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے اور آج اندھیرا ہوتے ہی اس جنگل والی کمین گاہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں گے ۔ ندیم اور شبانہ بہت خوش ہوئے ۔ ندیم نے شبانہ کو بتا دیا تھا کہ وہ پاکستان جا کر نجمی سے شادی کرے گا ۔ نجمی بھی یہی چاہتی تھی ۔ ان کا ارادہ شادی کے بعد پاکستان کے خوبصورت علاقے ہنزہ یا بلتستان میں جا کر آباد ہونے کا تھا انہیں کوئی خاص تیاری تو کرنی نہیں تھی ۔ نجمی نے بادل کے مشورے سے اپنے ہندو ڈاکو ساتھیوں کو یہی بتایا کہ وہ اپنے مہمانوں شبانہ اور ندیم کو کلکتے چھوڑنے جا رہے ہیں ۔ نجمی نے بادل کو بھی اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی ۔

" بادل ! یہاں تمہارا کوئی مستقبل نہیں ۔ تم ساری زندگی یہاں پولیس سے چھپتے پھرو گے اور جب بھی پکڑے گئے تمہارا مقدر پھانسی کا تختہ ہی ہو گا ۔ میرے ساتھ پاکستان چلے چلو ۔ وہاں تم کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر کے شریفانہ زندگی شروع کر دینا ۔ "

اس پر بادل نے مسکراتے ہوئے کہا تھا " نجمی بہن ! میں شریف لوگوں سے بہت دور ہو گیا ہوں ۔ اب ان میں واپس چلا بھی گیا تو اپنے آپ کو پردیسی محسوس کروں گا ۔ تمہارے جانے کے بعد میں اپنے گروہ میں کچھ نئے آدمی بھرتی کروں گا ۔ میں جانتا ہوں میرا انجام پھانسی کا تختہ یا پولیس کی گولی ہے ۔ "

نجمی بادل کے کردار اور اس کی دلیر شخصیت سے بیحد متاثر تھی ۔ وہ جانتی تھی کہ پاکستان جانے کے بعد وہ اسے بہت یاد آئے گا ۔ اس کے بعد نجمی نے بادل کو مجبور نہ کیا تھا ۔ دوسرا دن بھی گزر گیا ۔ وہ جنگل اس قدر دشوار گزار تھا اور ان کی کمین گاہ ایسی جگہ پر تھی کہ وہاں پولیس کا پہنچنا ناممکن تھا ۔ شبانہ، ندیم اور نجمی نے ساری تیاری کر لی تھی ۔ نجمی کے حصے کا کچھ سونا اور روپیہ غار میں موجود تھا ۔ نجمی نے اس میں سے روپے اپنے پاس رکھ لیے اور سونا بادل کو دے دیا ۔ ایک ریوالور نجمی نے ندیم کو دے دیا ایک اپنے پاس رکھ لیا ۔ ایک اسٹین گن بھی نجمی نے کچھ فالتو میگزین کے ساتھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے پاس رکھ لی۔ انھوں نے عام کپڑے پہن لیے تھے۔ نجمی شلوار قمیض میں ملبوس تھی۔ اوپر اس نے نسواری رنگ کی چادر اوڑھ لی تھی۔ شبانہ کا لباس بھی ایسا ہی تھا۔ ندیم نے کرتا پاجامہ پہن لیا تھا۔ ساتھ لے جانے کو ان کے پاس کوئی سامان وغیرہ نہیں تھا۔ وہ اندھیرا ہونے سے پہلے ہی اپنی خفیہ کمین گاہ سے نکل پڑے۔ جنگل کے ایک خاص مقام پر پہنچنے کے بعد وہ ایک جگہ چھپائی ہوئی جیپ میں سوار ہو گئے۔ آدھی رات تک وہ جنگل میں ہی سے گزرتے رہے۔ پچھلے پہر جنگل کا خطرناک علاقہ ختم ہو گیا۔ بادل نے جیپ ایک خفیہ جگہ پر چھپا دی۔ واپسی پر اسے یہیں سے جیپ کو واپس لے جانا تھا۔

بادل نے بھی دیہاتیوں والے کپڑے پہن لیے تھے۔ سر پر پگڑی باندھ لی تھی جس سے وہ آسانی سے پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ ان کی پہلی منزل جالندھر تھی۔ جالندھر کی ایک بستی میں زنگو ڈاکو کا ایک خاص آدمی رہتا تھا جس سے بادل نے زنگو ڈاکو کے موجودہ ٹھکانے کا پتہ معلوم کرنا تھا۔ ان کی منزل کافی دور تھی۔ راستے میں جگہ جگہ خطرہ تھا کہ کہیں وہ پکڑے نہ جائیں۔ شبانہ کے سوا باقی تینوں پولیس کو مطلوب تھے اور بڑے سنگین جرائم میں مطلوب تھے۔ نجمی اور ندیم کی تو تصویریں بھی اخباروں میں چھپ چکی تھیں۔ اس وقت ادرا ریلوے اسٹیشن کی طرف ان کا رخ تھا جو بنگال کے صوبے میں تھا۔ ادرا سے انھیں ریل میں بیٹھ کر گیا اور دھنباد جانے کی بجائے دوسری ریلوے لائن پر آسنول کی طرف جانا تھا۔ وہاں سے بھاگلپور سے ہوتے ہوئے انھیں مین لائن پر آ جانا تھا جو کلکتہ سے سیدھی امرتسر تک جاتی تھی یہ بڑا طویل سفر تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ لاریوں کے ذریعے اتنا لمبا سفر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ویسے بھی سڑک پر جگہ جگہ چیکنگ کا امکان تھا۔

صبح ہو رہی تھی کہ انھیں ادرا کے ریلوے اسٹیشن کی روشنیاں دکھائی دیں۔ اسٹیشن کے پاس ہی ایک چھوٹا سا تالاب تھا۔ تالاب کے ساتھ ایک چائے کی دکان تھی جو ابھی کھلی نہیں تھی۔ بادل نے نجمی، ندیم اور شبانہ کو تالاب سے کچھ دور ناریل اور تاڑ کے درختوں کے نیچے بٹھا دیا اور خود ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ کلکتے سے پٹنہ جاتے ہوئے ادرا نام کا یہ ریلوے اسٹیشن ایک جنکشن ہے جہاں سے ایک طرف کو آسنول، اعظم گڑھ اور سلی گڑھی اور دارجلنگ کی طرف ریل جاتی ہے۔ اور دوسری طرف جنوب میں روڈ کیلا اور آگے ناگپور کی

طرف ٹرین جاتی ہے۔ اسٹیشن پر مسافروں کی ریل پیل تھی۔ تھوڑی دیر میں سورج نکلنے والا تھا۔ بادل نے قلی سے پوچھا کہ بھاگلپور جانے والی گاڑی کب آئے گی۔ قلی نے بتایا کہ ایک گاڑی تو ابھی آدھے گھنٹے میں آنے والی ہے اور دوسری گاڑی دوپہر کے دو بجے آئے گی۔ بادل نے اسی وقت وایا بھاگلپور پٹنا اور بنارس سے آگے جالندھر تک کے چار ٹکٹ لے لیے ٹکٹ اس نے فرسٹ کلاس کے لیے تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ فرسٹ کلاس میں پولیس یونہی نہیں آجایا کرتی۔ رات کے وقت تو ٹی ٹی کو بھی فرسٹ کلاس کا دروازہ کھٹکھٹانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ٹکٹ لیتے ہی بادل واپس ندیم، شبانہ اور نجمی کے پاس آ گیا۔ وہ ٹرین آنے کے بعد پلیٹ فارم پر جانا چاہتے تھے کیونکہ جنکشن ہونے کی وجہ سے ٹرین وہاں دس پندرہ منٹ تک رکتی تھی۔ آدھا گھنٹہ انھوں نے وہیں ناریل کے درختوں کے نیچے گزار دیا۔ جب ٹرین آ کر اسٹیشن میں داخل ہو گئی تو وہ اٹھے اور اسٹیشن کی طرف چلے۔ اسٹین گن کو چادر میں لپیٹ کر بادل نے اپنی بغل میں لٹکائے ہوئے تھیلے میں چھپا رکھا تھا۔ شبانہ اور نجمی چادریں لپیٹے شریف گھرانوں کی مسلمان خواتین کی مانند بڑے سکون سے بادل اور ندیم کے ساتھ ساتھ چلتی پلیٹ فارم پر آ گئیں۔ ٹرین کھڑی تھی اس میں ڈاک اور پارسل وغیرہ لادے جا رہے تھے۔ مسافروں کا کافی رش تھا۔

فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ خالی پڑا تھا۔ بادل اور نجمی یہی چاہتے تھے۔ یہ چھ سیٹوں کا ڈبہ تھا۔ نجمی نے بادل سے کہا "ان دو سیٹوں کے بھی ٹکٹ لے کر سیٹیں ریزرو کروا لو اس طرح سے ہم زیادہ محفوظ ہو جائیں گے۔"

بادل کو یہ تجویز پسند آئی۔ وہ فوراً پلیٹ فارم سے نکل کر ٹکٹ آفس میں گیا اور اس ڈبے کی مزید دو نشستیں بھی مخصوص کروا کر ٹکٹ لے لیے۔ روپوں کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ بنگال کے ہندو ساہوکاروں کو انھوں نے لوٹ کر بہت سا روپیہ جمع کر رکھا تھا۔ یہاں مال مفت دل بے رحم والا معاملہ تھا۔ اب فرسٹ کلاس کا وہ پورے کا پورا کوپے ان کے پاس ہی تھا۔ بادل نے اسٹین گن چادر میں لپیٹے اسی طرح سیٹ کے نیچے چھپا دی۔ پندرہ منٹ رکنے کے بعد ٹرین چل پڑی۔ پٹنہ پہنچ کر بادل نے ناشتہ منگوا لیا۔ انھوں نے بڑے مزے سے ناشتہ کیا اور اپنے آئندہ سفر کے امکانی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خطرات پر آپس میں باتیں کرتے رہے۔ سارا دن ٹرین سفر کرتی رہی شام ہو رہی تھی کہ گاڑی الہ آباد پہنچی۔ شبانہ، ندیم اور نجمی اس دوران اپنے ڈبے میں ہی بند رہے۔ صرف بادل کسی خاص ضرورت کے وقت نیچے اترتا تھا۔ لکھنؤ پہنچ کر انھوں نے کھانا کھایا اور شبانہ اور نجمی سو گئیں ندیم بھی کچھ دیر بادل کے ساتھ باتیں کرنے کے بعد سو گیا۔

آدھی رات کو ٹرین بریلی پہنچی۔ وہاں سے چلی تو مراد آباد سے ہوتی ہوئی دوسرے روز دن کے آٹھ بجے دلی کے عظیم الشّان جنکشن میں داخل ہو گئی۔ ابھی تک معاملہ پر سکون تھا۔ حالات معمول کے مطابق تھے۔ کسی ٹکٹ چیکر نے بھی ان کے ڈبے کا رخ نہیں کیا تھا۔ دلی پہنچ کر بادل ندیم اور نجمی محتاط ہو گئے۔ بادل اکیلا ڈبے سے باہر آکر ذرا سامنے ایک طرف اسٹال پر کھڑا ہو کر آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ یہ ڈبہ امرتسر تک جاتا تھا اس لیے اس کے کٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ریلوے پولیس کے سپاہی ادھر ادھر منڈلا رہے تھے۔ یہاں ملٹری پولیس کے آدمی بھی نظر آرہے تھے۔ ریلوے کے فراش فرسٹ کلاس ڈبے کی صفائی کے لیے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ بادل نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

"سر! ڈبے کی صفائی کرنی ہے۔"

بادل نے کہا "ٹھہرو۔"

بادل ڈبے میں داخل ہو کر بولا "چادریں اوڑھ کر لیٹے رہو۔ صفائی کرنے والے آرہے ہیں"

ندیم، شبانہ اور نجمی اپنی اپنی نشستوں پر چادریں اوڑھ کر پڑ گئے۔ ریلوے کے ملازم بادل کے اشارے پر اندر آگئے۔ انھوں نے تھوڑی بہت صفائی کی اور سلام کر کے باہر نکل گئے۔ دلی ٹرین کافی دیر رکتی تھی یہاں ناشتہ بھی آتا تھا۔ بادل چوکس تھا۔ وہ برابر ڈبے کے باہر چند قدم کے فاصلے پر کھڑا پہرہ دے رہا تھا۔ ناشتے والا بیرا آیا تو وہ ایک بار پھر ڈبے میں چلا گیا۔ سب نے ڈبے کے اندر ہی ناشتہ کیا۔ خدا خدا کر کے گاڑی یہاں سے چلی۔ سب نے سکون کا سانس لیا۔ اسٹین گن اور ریوالور ابھی تک ان کے پاس محفوظ پڑے تھے۔ سارا دن ٹرین سفر کرتی رہی۔ شام کے وقت جالندھر شہر کے مضافات شروع ہو گئے۔ بادل نے نجمی سے کہا۔

"اب تک تو ہم محفوظ رہے ہیں مگر آگے ہمارا خطرناک سفر شروع ہونے والا ہے۔ ٹرین سے باہر نکلنے پر ہمیں کسی جگہ پر بھی چیک کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے ہمیں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہو گی۔"

نجمی نے کہا "کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ ہم یہیں جالندھر میں کسی ہوٹل میں رات بسر کریں اور صبح تمہارے دوست کے گھر روانہ ہوں۔"

بادل نے مسکرا کر کہا "تم بھول گئی ہو کہ میرے دوست زنگوڈا کو کا ایک با اعتماد ساتھی جالندھر شہر کی ایک بستی میں رہتا ہے۔ ہم اس کے پاس جائیں گے۔ رات اسی کے پاس بسر ہو گی۔ وہی ہمیں بتائے گا کہ زنگوڈا کو اس وقت کہاں ہو گا اور ہم اس سے کہاں مل سکیں گے۔"

نجمی چپ ہو گئی۔ ندیم کہنے لگا "پنجاب پولیس سے ہمیں بے حد چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔ یہاں میں ایک بار پکڑا بھی گیا ہوں۔"

بادل کھڑکی کے شیشے میں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ غروب ہوتی شام کے اندھیرے میں جالندھر شہر کی اضافی آبادیوں کی روشنیاں شروع ہو گئی تھیں۔ بادل نے چہرہ پیچھے کر لیا اور بولا "آپ لوگ سب میرے پیچھے پیچھے اسٹیشن سے باہر نکلیں گے۔"

اس نے نجمی اور شبانہ کو ہدایت کی کہ وہ چادروں سے سر اور تھوڑا تھوڑا چہرہ ڈھانپے رکھیں۔ ندیم کے سر پر بھی بادل نے ایک صافہ بندھوا دیا تھا تاکہ وہ آسانی سے شناخت نہ کیا جا سکے۔ ٹرین پلیٹ فارم پر رک گئی۔ سامان تو ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ بادل سب سے پہلے باہر نکلا۔ اس کے پیچھے ندیم، پھر شبانہ اور نجمی باہر آگئے۔ اسٹین گن بادل نے اپنے جھولے میں ڈال رکھی تھی گیٹ پر ایک سکھ ٹکٹ چیکر کھڑا تھا۔ فرسٹ کلاس کے ٹکٹ نے سکھ ٹکٹ چیکر پر بھی اثر ڈال دیا تھا۔ اس نے جلدی سے ٹکٹ لے کر انھیں جانے کی اجازت دیدی۔ بادل ندیم، شبانہ اور نجمی چپکے سے چلتے ہوئے اسٹیشن سے باہر آگئے۔ اسٹیشن کی ایک جانب ٹاہلیوں کے نیچے تانگے کھڑے تھے۔ وہاں خالی ٹیکسیاں اور رکشے بھی تھے مگر بادل نے سب کو ایک خالی تانگے میں بٹھایا۔ خود آگے سکھ کوچوان کے ساتھ بیٹھ گیا اور اسے ایک خاص بستی کی طرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چلنے کو کہا۔

تانگہ جالندھر کے بارونق بازاروں میں چل پڑا۔ دکانوں میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ سکھ ہندو عورتیں اور مرد سائیکلوں، رکشوں پر اور پیدل چلے جا رہے تھے۔ بازاروں میں کافی ہجوم تھا۔ تانگہ جالندھر شہر کے پرانے علاقے سے نکل کر ایک بستی کی طرف چل پڑا۔ یہ ایک مزدور بستی تھی جو کھاد کے ایک بہت بڑے کارخانے کے عقب میں بنائی گئی تھی۔ اس بستی میں چھوٹی چھوٹی کوٹھیاں بھی تھیں اور مزدوروں کے کوارٹر بھی تھے۔ زنگو ڈاکو کا ساتھی انہی کوارٹروں میں رہتا تھا۔ بادل پہلے بھی زنگو ڈاکو کے اس پرانے ساتھی اور مخبر سے مل چکا تھا۔ اس کا نام وریام سنگھ تھا۔ وہ بظاہر کارخانے میں مزدوری کرتا تھا لیکن حقیقت میں وہ زنگو ڈاکو کا مخبر تھا اور اسے شہر کی پولیس کے بارے میں پل پل کی خبر پہنچاتا تھا۔ وریام سنگھ کے کوارٹر سے کچھ ہی دور بادل نے تانگہ چھوڑ دیا اور شام کے جھٹپٹے میں وریام کے کوارٹر کی طرف بڑھا۔ وریام گھر پر ہی تھا۔ بادل خان کو دیکھتے ہی وریام نے پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ایک مرد اور دو عورتوں کو دیکھا تو ایک طرف لے جا کر پوچھا "یہ کون ہیں؟"

بادل نے کہا "اپنے ہی آدمی ہیں۔ ہمیں آج رات تمہارے پاس رہنا ہے۔ تمہیں کوئی دقت تو نہیں ہو گی؟"

وریام سنگھ نے بادل کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "بادل جی! یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے اندر آ جاؤ۔"

وریام سنگھ کی بیوی اور بچے بھی وہیں موجود تھے۔ انھوں نے نجمی، ندیم اور شبانہ کی بڑی خدمت کی۔ فوراً کھانا لگا دیا۔ منہ ہاتھ دھلایا۔ بادل نے وریام کو ساری بات بتا دی اور کہا کہ وہ زنگو کی مدد سے انھیں بارڈر کراس کرانا چاہتا ہے۔ وریام نے بادل کو بتایا کہ زنگو ڈاکو اسے بیاس کنارے شمال کی طرف گاؤں رتنہ جھلانی کی رکھ میں ملے گا۔ آج کل وہ اسی رکھ میں ہے۔ رکھ درختوں کا وہ ذخیرہ ہوتا ہے جو کسی بھی دریا کے کنارے بنایا گیا ہو۔ رکھ ایک چھوٹا سا جنگل بھی ہوتا ہے لیکن اس میں درندے وغیرہ نہیں ہوتے۔ بادل نے کہا۔

"ہم منہ اندھیرے یہاں سے نکل جانا چاہتے ہیں۔"

وریام بولا "ٹھیک ہے میں خود تم لوگوں کو یہاں سے نکال دوں گا فکر نہ کرو۔ اب آرام سے سو جاؤ۔ صبح تمہیں جگا دوں گا۔"

رات انھوں نے وریام کے گھر میں آرام کیا۔ دوسرے دن منہ اندھیرے وریام نے انھیں جگا دیا۔ شبانہ، ندیم اور نجمی نے جلدی جلدی تیاری کی اور وریام کے ساتھ بستی سے نکل پڑیں۔ بادل وریام کے ساتھ ساتھ تھا۔ ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ منہ اندھیرے کا وقت تھا۔ وریام نے ایک خالی تانگہ لیا اور جالندھر سے امرتسر جانے والی سڑک کے پلو میں چھوٹی پکی سڑک پر روانہ ہو گیا۔ جالندھر اسٹیشن سے آگے جو اسٹیشن آتا تھا۔ وہاں تانگہ چھوڑ دیا گیا۔

وریام بولا۔ یہاں سے تم پسنجر ٹرین پکڑ کر کرتارپور اتر جانا۔ کرتارپور سے ایک نہر جنڈیالہ بھاگے کو جاتی ہے اس نہر کے چوتھے پل کی بائیں جانب ایک کچا راستہ رتنہ جھلانی کی رکھ کو جاتا ہے۔ زنگو تمہیں اس رکھ میں ملے گا۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ معاف کر دینا۔"

بادل نے کہا "نہیں نہیں وریام۔ میں جانتا ہوں تم یہاں بہت مصروف ہوتے ہو۔ تم نے راستہ بتا دیا ہے ہم پہنچ جائیں گے۔"

وریام نے ہاتھ باندھ کر شبانہ، ندیم اور نجمی کو پرنام کیا اور اسی تانگے میں واپس چلا گیا جو وہاں سے چند قدم پیچھے درختوں کے نیچے کھڑا تھا۔ نجمی نے بادل سے پوچھا "کیا تم نے راستہ اچھی طرح سمجھ لیا ہے بادل؟"

ندیم اور شبانہ کے چہروں پر بھی یہی سوال تھا۔ بادل بولا "یہ سارا علاقہ میرا جانا پہچانا ہے تم لوگ فکر کیوں کرتے ہو۔ ہم انشاءاللہ رتنہ جھلانی پہنچ جائیں گے۔ صرف یہ دعا مانگتے رہو کہ کوئی پولیس یا سی آئی ڈی کا آدمی ہمارے پیچھے نہ لگ جائے۔"

ندیم کو خفیہ پولیس کا بڑا تجربہ تھا۔ دن کی روشنی پھیل گئی تھی۔ ندیم نے آس پاس نگاہیں دوڑائیں۔ اسے کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ بادل نے ان سب کو اپنے ساتھ لیا اور چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کی طرف چلا جو وہاں سے تھوڑے فاصلے پر ہی تھا اور جس کی عمارت اور سگنل درختوں کے پیچھے دکھائی دے رہے تھے۔ اسٹیشن پر وہ ایک طرف خالی بینچ پر بیٹھ گئے۔ شبانہ اور نجمی نے دیہاتی عورتوں کی طرح چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسٹین گن بادل نے جالندھر میں وریام کے پاس ہی چھوڑ دی تھی۔ کیونکہ نجمی اور بادل کے خیال کے مطابق انھیں اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ انھوں نے ریوالور ضرور اپنے پاس ہی رکھے تھے۔ ایک قلی سے معلوم ہوا کہ پسنجر ٹرین دس بجے آئے گی۔ موسم گلابی تھا۔ دھوپ میں زیادہ گرمی نہیں تھی۔ بادل ایک دکان سے چھلکے اور دال بھاجی لے آیا۔ انھوں نے بینچ پر بیٹھ کر ہی کھانا کھایا اور ٹرین کا انتظار کرنے لگے۔ وہ صرف ایک دوسرے کو گاہے گاہے دیکھ لیتے تھے۔ ایک دوسرے سے بات نہیں کر رہے تھے۔ بادل اور ندیم پلیٹ فارم کے فرش پر بینچ کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ جس وقت ٹرین کے آنے کا وقت ہوا تو پولیس کا ایک سکھ کانسٹیبل ان کے قریب آگیا اس نے بادل سے پوچھا "کہاں جاؤ گے بھئی تم لوگ؟ کہاں سے آئے ہو؟" بادل جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اگرچہ کافی عرصہ بھوپال نجیب آباد کے علاقے میں رہا تھا مگر پنجابی بڑی روانی سے بول لیتا تھا۔ کہنے لگا "سردار جی! یہ میری پتنی، یہ میری بہن اور یہ بھائی ہے میرا نام سندر داس ہے۔ میں کھاد فیکٹری میں کام کرتا ہوں۔ اپنی ماتا جی سے ملنے کرتارپور جا رہا ہوں۔"

سکھ کانسٹیبل بادل کو گھور رہا تھا۔ کہنے لگا "تم مجھے ہندو نہیں لگتے۔ ذرا ادھر آکر تلاشی تو دو۔"

نجمی کا ہاتھ چادر کے اندر اپنے ریوالور پر چلا گیا۔ ایک ریوالور ندیم نے بھی کپڑوں میں چھپا رکھا تھا۔ ایک بھرا ہوا ریوالور بادل کی قمیص کے اندر تھا۔ صورت حال ایک دم مخدوش ہو گئی تھی۔ ایک سیکنڈ میں سارا بھانڈا پھوٹنے والا تھا۔ بادل نے نجمی کی طرف دیکھا اور کہا "کملا جی تم یہیں بیٹھو میں سردار جی کو تلاشی دے دوں۔"

اور بادل سکھ کانسٹیبل کے ساتھ پیچھے درختوں کی طرف چل دیا۔

بادل نے ذہن میں فوری طور پر ایک اسکیم سوچ لی تھی۔

* * *

سکھ کانسٹیبل نے بادل کو کاندھے سے پکڑ رکھا تھا۔

جب وہ درختوں کی اوٹ میں آئے تو بادل نے اپنی سوچی ہوئی اسکیم پر عمل کرتے ہوئے فوراً ہاتھ باندھ لیے اور بولا۔

"شما کریں سردار جی! بات یہ ہے کہ میں مالیر کوٹلے کا رہنے والا مسلمان ہوں۔ یہ ساتھ میرا دوست ہے۔ دونوں عورتیں بھی مالیر کوٹلے کی مسلمان عورتیں ہیں۔ وہ اپنی مرضی سے ہمارے ساتھ آئی ہیں۔ ہم قادیاں جا رہے ہیں جہاں جا کر ہم شادی کر رہے ہیں۔ ہمارے ماں باپ ہماری شادی کے خلاف تھے اس لیے ہم وہاں جا رہے ہیں۔"

پھر جلدی سے اپنی صدری کی اندرونی جیب سے سو سو کے دو نوٹ نکال کر بادل نے سکھ کانسٹیبل کی مٹھی میں تھماتے ہوئے کہا۔

"آپ اپنا چائے پانی لے لیں جی۔ باقی میرے پاس تھوڑے سے پیسے ہی بچتے ہیں۔ آپ کی بڑی کرپا ہوگی۔"

سو سو کے دو نوٹ دیکھ کر سکھ کانسٹیبل نے اپنا ہاتھ بادل کے کاندھے سے ہٹا لیا۔ نوٹ اپنی پتلون کی جیب میں ڈالے اور بولا۔

"جاؤ چپکے سے جا کر بیٹھ جاؤ۔ کسی سے بات کی تو تم سب کو اندر کر دوں گا۔"

بادل نے سکھ کانسٹیبل کی داڑھی کو ہاتھ سے چھو کر کہا "فکر نہ کریں سردار جی! مجھے کیا ضرورت ہے کسی سے بات کرنے کی۔ آپ نے بڑی کرپا کی ہے۔ آپ کا دھنواد۔"

سکھ کانسٹیبل وہیں سے دوسری طرف چلا گیا اور بادل واپس نجمی وغیرہ کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا بات ہوئی ہے" نجمی نے آہستہ سے پوچھا۔ شبانہ اور ندیم بھی پریشان تھے۔

بادل نے اپنے سر پر صافہ دوبارہ باندھتے ہوئے کہا "سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ دو سو روپے رشوت دے کر اس کا منہ بند کر دیا ہے۔ ٹرین آ رہی ہے پچھلے ڈبوں میں بیٹھنا ہو گا۔"

پسنجر ٹرین، چھک چھک کرتی اسٹیشن کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھی۔ یہ لوگ ایک بڑی مصیبت سے بچ گئے تھے۔ معاملہ یہیں گڑبڑ ہونے والا تھا۔ اگر سکھ کانسٹیبل رشوت نہ لیتا اور انھیں تھانے لے جاتا تو سب کچھ چوپٹ ہو گیا تھا۔ ٹرین پلیٹ فارم پر آ کر رک گئی۔ بادل، ندیم، شبانہ اور نجمی تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں گھس گئے۔ ٹرین میں کافی رش تھا۔ ٹرین چل پڑی۔ یہ ٹرین امرتسر جا رہی تھی۔ کرتارپور اسٹیشن پر یہ لوگ اتر گئے۔ یہاں سے وہ پیدل ہی بڑی نہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ بادل ان راستوں سے واقف تھا۔ وہ ان کی راہنمائی کر رہا تھا۔ دھوپ میں حدت آنے لگی تھی۔ کھیتوں اور میدانوں سے گزرتے ہوئے وہ علی وال نام کی بڑی نہر پر آ گئے۔

نہر کی دونوں جانب چوڑی کچی پٹڑی بنی ہوئی تھی۔ دونوں جانب ٹاہلیوں کے گھنے درخت تھے۔ یہ نہر وہاں سے چکر کھاتی ہوئی جنڈیالہ اور بٹالے کو نکل جاتی تھی۔ انھیں اس نہر کے چوتھے پل پر سے بائیں جانب رتہ جھلانی کی طرف نکل جانا تھا۔ ایک پل آ کر گزر گیا۔ پھر دوسرا اور تیسرا پل بھی گزر گیا اب چوتھا پل ڈیڑھ ایک میل کے فاصلے پر نظر آ رہا تھا۔ بادل نے کہا "یہاں کچھ دیر آرام کر لیتے ہیں۔"

وہ کھانا وغیرہ ساتھ نہیں لائے تھے انھوں نے نہر کا پانی پیا اور تھوڑی دیر وہاں آرام کرنے وہاں بیٹھ گئے۔ ندیم کہنے لگا "اگر سکھ کانسٹیبل کو ذرا سا بھی شک پڑ جاتا کہ ہم کون ہیں تو معاملہ خراب ہو گیا تھا۔"

نجمی بولی "بادل نے بڑی حاضر دماغی سے کام لیا ہے۔ ورنہ میں ریوالور نکالنے ہی والی تھی۔"

بادل نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ ریوالور نکالنے کا موقع نہیں تھا۔ ریوالور تو میرے پاس بھی تھا۔ لیکن اگر میں گولی چلا دیتا تو پھر ہم سب کا گرفتار ہو جانا یقینی تھا۔ خدا نے ہمیں بہت بڑی مشکل سے نکال دیا۔"

کچھ دیر وہاں آرام کرنے کے بعد وہ لوگ اٹھے اور نہر کے کنارے کنارے درختوں کے نیچے

چوتھے پل کی طرف چل پڑے۔ چوتھا پل ریل کا پل تھا۔ اس کے اوپر سے ٹرین گزرتی تھی۔ یہ برانچ لائن تھی جو گورداسپور سے کپور تھلے کی طرف جاتی تھی۔ بادل نے پل پر پہنچنے کے بعد بائیں جانب ایک کچی پگڈنڈی کو دیکھا اور بولا "یہی راستہ رتہ جھلانی کی رکھ کو جاتا ہے۔ وریام نے اس راستے کے بارے میں بتایا تھا۔"

نجمی، شبانہ اور ندیم اس کے پاس ہی کھڑے تھے۔ وہ نہر کی پٹڑی سے نیچے کچی پگڈنڈی پر آ گئے۔ کوئی دو میل چلنے کے بعد دائیں جانب انھیں ایک ویران میدان ملا۔ اس میدان کو پار کیا تو شور زدہ زمین آ گئی۔ اس کے آگے ایک جھلار تھی۔ جھلار کی دوسری طرف ٹاہلیوں کے ذخیرے کا ایک جنگل سا شروع ہو گیا تھا۔ نجمی نے اس کی طرف دیکھا اور بولی "یہی وہ رکھ ہے بادل جہاں تمھارا دوست زنگو ڈاکو رہتا ہے۔"

"ہاں" بادل نے کہا "ہمیں اب احتیاط کی ضرورت ہو گی کیونکہ زنگو کے آدمی رکھ میں ادھر ادھر ضرور پہرہ دے رہے ہوں گے۔ تم میں سے اب کوئی نہ بولے۔"

جھلار کا پل پار کرنے کے بعد یہ لوگ رکھ میں داخل ہو گئے۔ جہاں چھوٹی بڑی ٹاہلیوں کے درخت ایک دوسرے کے اتنے قریب اُگے ہوئے تھے کہ کئی جگہ تو آگے چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ زمین پر اونچی اونچی سوکھی گھاس بھی کثرت سے تھی۔ وہ رکھ میں تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ کسی نے رعب دار آواز میں پیچھے سے پکار کر کہا "کون ہو بھئی تم؟ کدھر جا رہے ہو؟"

بادل نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر درخت کے پیچھے سے ایک اونچا لمبا آدمی نکل کر سامنے آ گیا۔ اس نے منڈاسا باندھ رکھا تھا جس سے اس کا آدھا چہرہ چھپ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دونالی بندوق تھی۔ بادل نے ہاتھ سے نجمی شبانہ اور ندیم کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود ایک قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ اجنبی نے بندوق تان لی "وہیں کھڑے رہو اوئے۔ کون ہو تم؟"

بادل وہیں رک گیا اور بولا "میں بادل خان ہوں۔ زنگو کا دوست بادل خان۔ اس سے ملنے آیا ہوں۔ یہ میرے اپنے آدمی ہیں۔"

منڈاسے والے اجنبی کی سرخ آنکھیں بدستور بادل کو گھور رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ اپنی جگہ پر بندوق تانے ساکت کھڑا رہا۔ پھر بندوق کا اشارہ کیا اور بولا "نیچے بیٹھ جاؤ۔ اپنی جگہ سے کوئی ہلا تو میں گولی چلا دوں گا۔"

بادل نے نجمی، شبانہ اور ندیم سے کہا "بیٹھ جاؤ۔"

سب وہیں گھاس پر بیٹھ گئے۔ بادل نے سرگوشی میں کہا "یہ نیا آدمی ہے۔ مجھے نہیں پہچانتا۔"

منڈاسے والے آدمی نے بندوق کی نالی اوپر درخت کی طرف کی اور دھڑ سے فائر کر دیا فائر سے جنگل گونج اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی تین آدمی ایک طرف سے جھاڑیوں اور گھاس کو لتاڑتے ہوئے وہاں آن موجود ہوئے۔

ایک آدمی ان کے آگے آگے تھا۔ آتے ہی بولا "کیا ہوا ہے اوئے؟ فائر کیوں کیا؟" پہلے والا آدمی جس نے فائر کیا تھا بولا "مجھے یہ پولیس کے بھیجے ہوئے آدمی لگتے ہیں پھوجے۔"

پھوجے نے بادل کو دیکھتے ہی پہچان لیا اور خوش ہو کر بولا "سلاماں لیکم خان جی! آپ کیسے آ گئے۔"

پھوجے نے اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا "اوے یہ بادل خان جی ہیں۔ ہمارے سردار جی کے جگری یار ہیں۔ آئیے خان جی سردار جی رکھ میں ہی ہیں۔ یہ بی بیاں کون ہیں؟"

بادل نے پھوجے سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "اپنی بہنیں ہی ہیں۔"

دوسرے ڈاکو واپس چلے گئے۔ پھوجا جو زنگو ڈاکو کا دست راست تھا بادل، ندیم، شبانہ اور نجمی کو لے کر درختوں میں آگے آگے چل پڑا۔ وہ بولتے ہی جا رہا تھا "بڑے دنوں کے بعد آپ کا آنا ہوا خان جی! ادھر پولیس کا کیا حال ہے؟ یہاں تو کسی مائی کے لال کی ہمت نہیں کہ اس طرف رخ کرے۔ ابھی پرسوں ہم نے ایک جھڑپ میں چار پولیسیوں کو بھون ڈالا تھا۔" "اس ٹھکانے کا آپ کو کیسے پتہ چلا؟"

بادل نے کہا "جالندھر میں وریام سے مل کر معلوم ہوا۔"

"وریام کیسا ہے؟" پھوجے نے پوچھا "بالکل ٹھیک ہے" بادل نے جواب دیا۔

درختوں کے ذخیرے میں ایک تھوڑی سی کھلی جگہ آ گئی۔ یہاں درختوں میں ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی جس کو بڑی آسانی سے پھلانگ کر پار کیا جا سکتا تھا۔ ندی کی دوسری طرف درختوں میں ایک کٹیا سی بنی ہوئی تھی۔ باہر ایک بڑی سی چارپائی بچھی تھی۔ چارپائی پر کچھ ڈاکو بیٹھے تھے۔ بادل خان کو دیکھ کر وہ چارپائی سے نیچے اتر آئے۔

"رام رام خان جی،" ان میں سے دو ایک نے بادل خان کو سلام کیا۔

"یہاں بیٹھیے۔ سردار جی ابھی آتے ہی ہوں گے۔"

بادل، شبانہ، ندیم اور نجمی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ شبانہ تو چلتے چلتے بے حد تھک گئی تھی۔ ڈاکو اس وقت ان کے لیے لسی کا گڑوا بھر کر لے آئے۔ سب نے لسی پی۔ اتنے میں ایک جانب درختوں میں ایک اونچا لمبا، بھاری بھرکم، بھری بھری داڑھی مونچھوں اور سرخ آنکھوں والا سکھ نمودار ہوا جس نے نیلے رنگ کی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ کرپان ایک جانب لٹک رہی تھی۔ کمر میں گولیوں سے بھری ہوئی پیٹی کے ساتھ پستول لگا تھا۔ وہ نسواری رنگ کے لمبے کرتے اور دھوتی میں ملبوس تھا۔ پاؤں میں چانتی جوتی تھی۔ یہ پنجاب کا مشہور ڈکیت زنگو تھا جس کا نام سن کر ہی لوگ سہم جاتے تھے۔ زنگو ڈاکو نے بادل خان کو دیکھا تو وہیں ٹھٹک گیا۔ چہرہ خوشی سے کھل گیا۔

وہیں بازو پھیلائے اور آگے بڑھتے ہوئے بولا "میرا خان یار آیا اے۔"

دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ بادل نے زنگو سے ندیم، شبانہ اور نجمی کا تعارف کرایا اور بولا "باقی سب باتیں تمھیں آرام سے بتاؤں گا۔ یہ بتاؤ کہ تم ٹھیک ٹھاک ہو۔"

زنگو مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "خان جی! اسیں تے انڈیا کی پولیس کے جوائی ہیں۔"

اور پھر دونوں قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ اسی وقت کہیں سے چارپائیاں لا کر وہاں بچھا دی گئیں۔ زنگو ڈاکو نے پھوجے کی طرف دیکھ کر کہا "پھوجے! ہمارے مسلمان بھائی اور بہنیں آئی ہیں۔ ان کے لیے ساری مرغیاں تم حلال کرو گے۔"

پھوجے نے وہیں سے پوچھا "سردار جی! بوتل بھی نکال لاؤں؟"

زنگو بولا "نہیں پتر پھوجے۔ دیکھتا نہیں بہن جی آئی ہیں۔"

اسی وقت پھوجے نے چھ سات مرغیاں ذبح کر کے چڑھا دیں۔ بادل نے زنگو ڈاکو کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساتھ لیا اور کٹیا کی طرف آ کر چار پائی پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ پھر اس نے نجمی اور شبانہ اور ندیم کے بارے میں ساری بات کھول کر اسے بتا دی اور کہا "میں نے سارا معاملہ تمھارے سامنے رکھ دیا ہے رنگو! اب تم مجھے بتاؤ کہ اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتے ہو۔ میں ان تینوں کو جتنی جلدی ہو سکے باڈر کراس کرا کر پاکستان پہنچا دینا چاہتا ہوں۔"

رنگو ڈاکو نے اپنی لال لال آنکھیں گھماتے ہوئے کہا "بادل خان! میرے بڑے۔ سوبھاگ ہیں کہ میرے ڈیرے پر تم ایک بہادر عورت چندا کو لائے ہو جس کے نام سے بنگال پولیس آج بھی کانپ اٹھتی ہے۔ واہ گورو کی قسم ہے میرا تو یہ دل چاہتا ہے کہ چندا اور تم میرے ساتھ مل جاؤ۔ سارے ملک میں بس ہمارا ہی راج ہو گا۔"

بادل نے رنگو کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "رنگو! میرے یار! چندا کا کھیل اب ختم ہو چکا ہے اس نے جس کام کے لیے ڈاکو کا روپ دھارا تھا وہ پورا ہو گیا ہے۔ اب وہ پاکستان جا کر ندیم سے شادی کر کے شریفانہ زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔"

رنگو خاموش ہو گیا۔ اپنے بڑے سر کو ہلاتے ہوئے بولا "تم ٹھیک کہتے ہو خان جی! شریف عورت کے لیے تو ہم اپنی جان بھی قربان کر دیں اب بات یہ ہے میرے یار کہ جنگ کے بعد سرحدوں پر فوج آ کر بیٹھ گئی ہے بلکہ یہ کہو کہ جہاں جہاں فوج بیٹھی تھی وہاں سے ابھی اٹھ کر واپس بیرکوں میں نہیں گئی۔ اسمگلروں کا کام ٹھپ ہو گیا ہے۔ ان کا سرحدوں پر آنا جانا بالکل بند ہو گیا ہوا ہے۔ تمھیں کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔ اگر باڈر پر فوج نہ ہوتی تو یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ میں آج رات ہی انھیں پاکستان پہنچا دیتا۔"

بادل فکرمند سا ہو کر بولا "تمھارے اندازے کے مطابق ابھی فوج کب تک بیٹھی رہے گی۔"

رنگو ڈاکو نے اپنی پنڈلی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "کچھ نہیں کہا جا سکتا خان جی! ویسے میں کرتارے کو آج ہی بلا کر تمھارے سامنے اس سے بات کرتا ہوں۔ دیکھتا ہوں وہ کیا کہتا ہے۔"

کرتارا اس علاقے کا نامی گرامی اسمگلر تھا۔ وہ ایسے تمام خفیہ راستوں سے واقف تھا جو سرحد کے آر پار جاتے تھے۔ شام کو رنگو ڈاکو نے کرتارے اسمگلر کو بلا لیا۔ وہ چار پائی پر سر جوڑ کر بیٹھ

گئے۔ قریب ہی درخت کے ساتھ لالٹین جل رہی تھی۔ شبانہ، ندیم اور نجمی ندی کے پاس چار پائیوں پر بیٹھے اور نیم دراز آرام کر رہے تھے۔ کرتارا اسمگلر چار پائی کے پاس ہی زمین پر بیٹھا تھا۔ رنگو کی ساری بات سننے کے بعد کہنے لگا "سردار جی! آپ کا حکم ہم کبھی ٹال ہی نہیں سکتے۔ ویسے سرحد کے جو حالات ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں۔"

رنگو نے پوچھا "تمھارے خیال میں یہ حالات کب تک رہیں گے؟"

کرتارا صافے سے منہ صاف کرتے ہوئے بولا "کچھ کہا نہیں جا سکتا سردار جی! جنگ تو بند ہو چکی ہے مگر تناؤ بڑا ہے لگتا ہے کہیں پھر جنگ چھڑ نہ جائے۔ شاید اسی لیے دونوں طرف کی فوج اپنے مورچے نہیں چھوڑ رہی۔"

بادل خان نے کہا "دوسری کوئی ترکیب نکالو۔ کیا اتنے لمبے چوڑے باڈر پر کہیں بھی کوئی ایسی جگہ نہیں ہے کہ جہاں سے سرحد پار کی جا سکے۔ آخر ہر جگہ تو فوج کے مورچے نہیں ہوتے۔"

رنگو ڈاکو نے کرتارے کی طرف دیکھا۔ کرتارا ذرا ہنس کر بولا "خان جی! آپ باڈر سے واقف نہیں ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ سینکڑوں میل لمبی سرحد پر ہر جگہ فوج کے مورچے نہیں ہیں لیکن آپ یہ بات بھول گئے ہیں کہ دونوں طرف بارودی سرنگیں ابھی تک بچھی ہوئی ہیں۔ ایسی صورت میں خطرہ مول لینا تو اپنی جان ہی گنوانا ہے۔ راستے تو مجھے کئی آتے ہیں مگر سارے راستوں پر موت بیٹھی ہے آپ کچھ روز ٹھہر جائیں۔ ممکن ہے حالات جلدی ٹھیک ہو جائیں اور فوج بارکوں میں چلی جائے اور سیکورٹی فورس آ جائے پھر تو کوئی بات ہی نہیں ہو گی کیونکہ جانے سے پہلے فوج دونوں طرف کی بارودی سرنگیں صاف کر جائے گی۔ میں آپ کے مہمانوں کو راتوں رات باڈر کراس کرا دوں گا۔"

معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ رنگو ڈاکو نے کہا "خان جی! تم میرے پاس ہی ٹھہر جاؤ۔ یہ بھی تمھارا اپنا ہی ڈیرہ ہے۔ پرسوں میں نے دریا پار ایک ساہوکار کے گھر ڈاکا ڈالنے جانا ہے۔ تم بھی میرے ساتھ چلنا۔"

بادل خان نے کہا "اب تو ٹھہرنا ہی پڑے گا رنگو یار..... مگر میں پیچھے رہوں گا۔ تمھارے ساتھ دریا پار نہ جا سکوں گا۔"

رنگو ڈاکو قہقہہ لگا کر بولا "ارے نہیں خان جی! یہ بھی تمھارا ہی علاقہ ہے اسے صرف میرا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

علاقہ ہی نہ سمجھو۔"

پھر اس نے کرتارے سے پوچھا "کل شام تک مجھے دریا پار والے ہندو ساہوکار کی ساری خبر لاکر دو کہ وہ حویلی میں کہاں سوتا ہے اور تجوری کونسی کوٹھڑی میں ہے۔ میرا خیال ہے لالہ تجوری کے آگے ہی سوتا ہوگا۔" اور پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

کرتارا بولا "میں ساری خبر لاکر دوں گا سردار جی! کل دوپہر کے بعد آؤں گا۔ اب میں جاؤں۔"

"ہاں جاؤ۔ مگر کرتارے میرے مہمانوں کو بارڈر کراس کرانے کی کوئی ترکیب ضرور سوچو۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

کرتارا ہاتھ باندھ کر بولا "سردار جی! آپ کیوں شرمندہ کرتے ہیں جی۔ آپ کے آدمی میرے آدمی ہیں جونہی کوئی ترکیب دماغ میں آئی میں فوراً حاضر ہو جاؤں گا۔"

کرتارا چلا گیا۔ بادل نے نجمی، شبانہ اور ندیم کو آکر بتایا کہ ابھی انھیں کچھ روز زنگو ڈاکو کے ڈیرے پہ ہی رہنا ہوگا۔ ان کے چہرے اتر گئے۔ وہ اب پاکستان واپس جانے کے لیے بے چین تھے۔ پاکستانی سرحد کے بالکل قریب بیٹھے تھے۔

نجمی نے پوچھا "کیا ہم کشمیر کی طرف سے بھی سرحد پار نہیں کرسکتے؟ ادھر تو پہاڑوں میں بہت سے راستے ہوتے ہیں۔"

بادل نے کہا "شاید ادھر سے سرحد پار کرنا زیادہ مشکل ہو کیونکہ وہاں ایسے ایسے دشوار گزار راستے ہیں کہ ہم بغیر کسی گائیڈ کے سرحد پار نہیں کرسکیں گے۔ اور کرتارے کو ان راستوں کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ ویسے اس نے کہا ہے کہ وہ کوئی راستہ نکالے گا۔ یہاں کچھ دیر ٹھہرنے میں کوئی حرج نہیں۔ زنگو اپنا دوست ہے۔ یہاں تو ہم ایک طرح سے بالکل محفوظ بھی ہیں۔ کسی دوسری جگہ تو ہر وقت خطرہ لگا رہتا۔"

ندیم اور شبانہ خاموش تھے۔ شبانہ کو اب اپنے گھر کی اور بڑے بھائی کی یاد ستانے لگی تھی۔ اس کا خاوند تو ایک جابر آدمی تھا۔ شبانہ اسے کیا یاد کرتی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ جب وہ اس کے پاس امریکہ پہنچے گی تو اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ شبانہ کو ننانوے فیصد یقین تھا کہ اب وہ اسے اپنے ساتھ

نہیں رکھے گا اور طلاق دے دے گا۔ شبانہ نے بھی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر ایسی بات ہوگئی تو وہ طلاق لے کر لاہور آجائے گی اور کسی کالج میں لیکچرار لگ جائے گی اور باقی ساری زندگی کتابوں میں بسر کردے گی۔ اس نے بادل سے کہا "بھائی جان! آپ کے خیال میں ہمیں یہاں کتنے دن مزید رہنا ہوگا۔؟"

بادل گردن کو ایک طرف جھکاتے ہوئے بولا "کچھ نہیں کہا جاسکتا شبانہ بہن! ایک مہینہ بھی لگ سکتا ہے۔ پندرہ دنوں میں بھی فوج بارودی سرنگیں صاف کر کے واپس بارکوں میں جا سکتی ہے۔"

شبانہ ٹھنڈی آہ بھر کر چپ ہوگئی۔ نجمی نے بھی سر جھکا لیا تھا۔

ندیم کہنے لگا "یہاں بھی تو ہم زیادہ محفوظ نہیں ہیں۔ کسی وقت بھی پولیس پارٹی چھاپہ مار سکتی ہے۔"

بادل نے ہنس کر کہا "پولیس زنگو کے ڈیرے پر خودکشی کرنے کبھی نہیں آئے گی میں جانتا ہوں۔ میں بھی یہاں تمھارے ساتھ ہی ہوں۔ تم دیکھ لوگے یہاں کوئی نہیں آئے گا۔"

چاروناچار ان لوگوں کو زنگو ڈاکو کے ڈیرے پر ہی رکنا پڑ گیا تھا۔ وہاں سے واپس دلّی یا بہار کی طرف جانے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نجمی نے بادل سے ضرور کہا کہ اگر وہ واپس جانا چاہتا ہے تو چلا جائے۔

اس پر بادل بولا "نجمی بہن! میں آپ سب کو بارڈر کراس کرائے بغیر یہاں سے واپس نہیں جا سکتا۔ میں نے آپ کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

دوسرے دن رات کو زنگو ڈاکو دریا پار ہندو ساہوکار کے گھر ڈاکا ڈالنے چلا گیا۔ آدھے آدمی وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ڈیرے پر باقی آدھے ڈاکو موجود تھے۔ اسی رات صبح صبح زنگو واپس آگیا۔ وہ بہت سے زیور اور نقدی وہاں سے لوٹ کر لایا تھا۔ اس نے سونے کا ایک ایک ہار شبانہ اور نجمی کو پیش کرنا چاہا مگر انھوں نے یہ کہہ کر ہار واپس کردیئے کہ ان پر ان کا کوئی حق نہیں ہے۔ زنگو ڈاکو نے [illegible] اصرار نہ کیا۔

اس سے اگلے دن شام کے وقت اچانک کرتارا اسمگلر آگیا۔ وہ زنگو ڈاکو کے پاس زمین

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر بیٹھ گیا اور بولا "سردار جی! آپ کے مہمانوں کے واسطے ایک خوشی کی خبر لایا ہوں۔"

زنگو نے بادل خان کو بھی بلا لیا۔ کرتارا کہنے لگا "میں نے بارڈر پر مورچہ بند ایک ہندو صوبیدار سے بات کر لی ہے۔ وہ دو ہزار روپے فی آدمی کے حساب سے بارڈر کراس کرانے پر راضی ہو گیا ہے۔"

بادل نے جلدی سے کہا "ہم اسے چار ہزار فی آدمی بھی دے دیں گے۔ مگر کہیں وہ دھوکہ تو نہیں دے گا۔"

زنگو نے بات کاٹتے ہوئے کہا "بادل! تم میرے مہمان ہو۔ جتنے پیسے لگیں گے میں دوں گا یار میری توہین تو نہ کرو۔"

بادل خاموش ہو گیا۔ زنگو نے اب وہی سوال دہرایا جو بادل نے پوچھا "صوبیدار قابل اعتبار آدمی ہے کیا؟ کہیں وہ اپنی بات سے پھر تو نہیں جائے گا۔"

اس پر کرتارا بولا "سردار جی! کرتارا کچی گولیاں نہیں کھیلا کرتا۔ میں نے پوری طرح سے چھان بین کرنے کے بعد صوبیدار سے بات طے کی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس نے، پہلے وہ دو دو ہزار روپے لے کر کچھ لوگوں کو بارڈر کراس کرا چکا ہے۔"

تب بادل نے کہا "لیکن وہ ہندو صوبیدار تو صرف انڈیا کا بارڈر ہی کراس کرائے گا۔ آگے پاکستانی فوج ہو گی۔ وہاں سے ہم کیسے نکلیں گے؟"

کرتارا بولا "خان جی! آپ کے بہن بھائی بھی پاکستانی ہیں۔ اصولی طور پر تو آپ کو چاہیئے کہ بارڈر کراس کرتے ہی اپنے آپ کو پاکستانی فوج کے حوالے کر دیں۔ اس وقت تو آپ کو ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ کیونکہ پاکستانی بارڈر ان حالات میں کراس کرنا ناممکن ہے۔"

زنگو نے بادل کی طرف متوجہ ہو کر کہا "میرے خیال میں بہن جی اور بھائی صاحب کو ایسا ہی کرنا چاہیئے کہ بارڈر کراس کرنے کے بعد خود کو پاکستانی فوج کے حوالے کر دیں۔ کم از کم یہ لوگ پاکستان میں تو پہنچ جائیں گے۔"

بادل بولا "یہ میں ان لوگوں سے بات کر کے ہی بتا سکتا ہوں۔"

کرتارا کہنے لگا "لیکن ہندو صوبیدار نے ایک شرط یہ لگائی ہے کہ وہ سب کو اکٹھے بارڈر

کراس نہیں کرا سکتا۔ بلکہ ایک ایک کر کے بارڈر پار پہنچائے گا۔ اس نے اس بات کی گارنٹی بھی دی ہے کہ جب تک آپ کا آدمی انڈیا کی زمین کے اندر ہو گا اس پر پیچھے سے گولی نہیں چلائی جائے گی۔ پاکستانی فوج گولی چلا دے تو اس کی وہ ذمہ داری نہیں لیتا۔"

زنگو بولا "خان جی! انھیں سمجھا دیں کہ پاکستانی مورچوں کے سامنے پہنچتے ہی ہاتھ اٹھا کر بول دیں کہ ہم پاکستانی ہیں۔ ہم اسمگلر نہیں ہیں۔"

بادل کہنے لگا "میں ابھی بات کر کے آتا ہوں۔"

کٹیا کے پیچھے شبانہ اور ندیم بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ انھیں امید تھی کہ کرتارا اسمگلر کوئی اچھی خبر ہی لے کر آیا ہو گا۔ بادل قریب آیا تو ندیم نے پوچھا "خان بھائی! کوئی خوشخبری لائے ہو نا؟"

"ہاں"، بادل یہ کہہ کر ان کے قریب بیٹھ گیا۔

اس نے وہ ساری باتیں بتا دیں جو کرتارے نے اسے بتائی تھیں۔ سب سوچ میں پڑ گئے۔ موقع سنہری تھا مگر یہ خطرہ اپنی جگہ پر موجود تھا کہ اگر پاکستانی مورچوں سے ان پر فائرنگ شروع ہو گئی تو پھر کیا بنے گا؟ نجمی کہنے لگی۔

"پاکستانی مورچوں کے سامنے جاتے ہی ہم کلمہ شریف پڑھ کر ہاتھ اٹھا دیں گے۔ مسلمان کبھی کسی دوسرے مسلمان پر گولی نہیں چلاتا اور پھر عورتوں پر گولی چلانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہ کام ایک مسلمان سپاہی کبھی نہیں کرے گا۔ وہ ہمیں گرفتار ضرور کر لیں گے۔ گرفتار ہونے کے بعد معاملہ عدالت میں جائے گا جہاں ساری بات کھل جائے گی۔ مجھے پوری امید ہے کہ اس طرح ہمیں صرف غیر قانونی طور پر بارڈر کراس کرنے کی سزا ہی ہو گی۔ کم از کم ہم اپنے پیارے وطن میں تو پہنچ جائیں گے۔"

بادل زمین پر سے گھاس کا تنکا اکھاڑتے ہوئے کہنے لگا "لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ ہمیں ایک ایک کر کے بارڈر کراس کرایا جائے گا۔ کیونکہ جس ہندو صوبیدار سے ہمارے آدمی نے معاملہ طے کیا ہے وہ پہلے ایک کو پھر اگلی رات دوسرے اور اس سے اگلی رات تیسرے کو بارڈر کراس کرائے گا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اب تو شبانہ اور نجمی کو مزید حیرت ہوئی۔ شبانہ نے کہا" میں اکیلی سرحد پار کیسے کروں گی۔ مجھے تو کچھ معلوم نہیں کہ آگے کس طرف جانا ہوگا اور پاک فوج کے مورچے کہاں ہوں گے۔ کیا معلوم کوئی مجھ پر فائر کر دے۔ پھر رات کا وقت ہوگا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ ہم سرحد پار ہی نہ کریں"
نجمی نے بادل سے پوچھا "کیا یہ شخص ہمیں دن کے وقت سرحد پار نہیں کرا سکتا ؟"

بادل نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا " دن کی روشنی میں آجکل بارڈر کراس نہیں ہو سکتا۔ پہلے بارڈر سیکورٹی تھی تو اور معاملہ تھا۔ یہ لوگ انڈین بارڈر سیکورٹی والوں سے ملے ہوئے ہیں۔ مگر اب معاملہ دوسرا ہے۔ اگر آپ لوگ پاکستان جانا چاہتے ہیں تو میرا خیال ہے کہ آپ کو ایک ایک کر کے ہی بارڈر سے پار جانا ہوگا اور آگے جا کر اپنے آپ کو پاک فوج کے حوالے کر دینا ہوگا اور پھر اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ یہ لوگ جو بارڈر کراس کرواتے ہیں بڑے ذمہ دار لوگ ہوتے ہیں۔ یہ کم از کم آپ کو سرحد کی دوسری طرف ضرور لا کھڑا کر دیں گے۔"

ندیم کافی دیر سے خاموش تھا۔ جب نجمی نے اس کی رائے بھی مانگی تو وہ کہنے لگا" میں سمجھتا ہوں کہ بادل کی رائے بالکل درست ہے۔ ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اس ملک بھارت میں رہ سکیں۔ یہاں ہم جس دن بھی پکڑے گئے ہمارا انجام پھانسی کا تختہ ہی ہوگا۔ میرے اور نجمی کے کھاتے میں کئی قتل ہیں شبانہ کو پھانسی نہ لگے تب بھی وہ ساری عمر یہاں کی جیلوں میں سڑتی رہے گی۔ ظاہر ہے اس پر بھی جاسوسی کا الزام ہی لگے گا۔"

ندیم ٹھیک کہہ رہا تھا۔ نجمی اور شبانہ کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے اگر انھوں نے اس سنہری موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر شاید دیر ہو جائے وقت گزر جائے اور ممکن ہے زنگو ڈاکو کے ڈیرے پر ہی چھاپا پڑ جائے اور وہ ساتھ ہی گرفتار ہو جائیں۔
نجمی نے کہا " تو پھر میری تجویز یہ ہے کہ سب سے پہلے ندیم بارڈر کراس کرے اس کے بعد شبانہ اور سب سے آخر میں میں بارڈر کراس کروں گی۔"

اس پر ایک نئی بحث شروع ہو گئی۔ ندیم کہہ رہا تھا کہ نجمی کو آخر میں نہیں جانا چاہیئے۔ شبانہ الگ پریشان تھی کہ میں اکیلی رات کے اندھیرے میں کیسے جاؤں گی۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ

رہا تھا۔ بادل خاموش تھا۔ کافی بحث مباحثے کے بعد آخر وہی فیصلہ کیا گیا جس کا اظہار نجمی کر چکی تھی۔ یعنی سب سے پہلے ندیم اور اس کے بعد شبانہ بارڈر کراس کرے گی۔ زنگو ڈاکو اس فیصلے سے آگاہ کر دیا گیا۔ ساتھ ہی کرتارے اسمگلر کو بتا دیا گیا۔ بادل خان نے اسی وقت ندیم کو سرحد پار کرانے کی رقم کرتارے کو ادا کر دی۔

کرتارے نے کہا " کل اپنے آدمی کو تیار رکھنا میں آٹھ بجے رات کو پھر آؤں گا۔"

وہ رات اور اگلا دن نجمی، شبانہ اور ندیم نے ایک دوسرے کی معیت میں گزارا۔ نجمی بار بار ندیم کو ہدایت کر رہی تھی کہ وہ پاکستانی سرحد میں جانے کے بعد اپنے ہاتھ کھڑے کرنا نہ بھولے اور چیخ کر اعلان کر دے کہ میں مسلمان ہوں۔ پاکستانی ہوں۔ ندیم اسے تسلی دے رہا تھا کہ وہ فکر نہ کرے اور ساتھ ہی تاکید بھی کرتا جاتا تھا کہ وہ بھی احتیاط سے بارڈر کراس کرے۔ ندیم نے ایک بات خاص طور پر نجمی اور شبانہ کو بتا دی تھی کہ میں پاکستانی سرحد پر جاتے ہی پکڑا گیا تو انھیں بتا دوں گا کہ میرے بعد تم دونوں بھی بارڈر کراس کرنے والی ہو۔

"اسی طرح سے سرحد کراس کرتے ہوئے تم دونوں کو زیادہ خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔"

آخر دن گزر گیا۔ رات آ گئی۔ زنگو ڈاکو نے ان سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ وہ بھی بار بار ان کو تسلیاں دے رہا تھا۔ رات کے ٹھیک آٹھ بجے کرتارا اسمگلر وہاں پہنچ گیا۔ وہ جیپ ساتھ لے کر آیا تھا۔ ساتھ ایک ڈرائیور بھی تھا۔ اس نے آتے ہی کہا " اپنا بندہ لے کر میرے ساتھ چلو جی۔ ابھی ہمیں کافی دور جانا ہے۔"

ندیم نے باری باری سب سے ہاتھ ملایا۔ بادل اور زنگو ڈاکو کا شکریہ ادا کیا۔ پھر نجمی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا " اپنا خیال رکھنا میں تمھارا انتظار کروں گا۔"
نجمی کا دل ضرور اداس تھا مگر آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ آنسو نجمی کی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکے تھے۔ اس نے ندیم کا ہاتھ گرم جوشی سے دباتے ہوئے مسکرا کر کہا۔
" اللہ تمھارا نگہبان ہو۔"

ندیم نے شبانہ کو بھی حوصلے کے دو چار بول کہے اور کرتارے اسمگلر کے ساتھ جیپ میں سوار ہو گیا۔ شبانہ نے ندیم کو خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ وہ لاہور جا کر صرف اس کے بھائی کو بتا دے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ نبانہ زندہ ہے اور دو روز بعد بارڈر پر پہنچ جائے گی۔ جیپ کچے راستے پر رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں باڈر کی طرف روانہ ہو گئی۔ ندیم پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ کرتارا اگلی سیٹ پر اپنے ساتھی سکھ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ بالکل چپ تھا۔ جیپ دو گھنٹے تک اس ویران علاقے میں دوڑتی رہی آگے ایک کھال آگیا۔ کھال پار کرنے کے بعد جیپ کو ایک طرف کیکر کے درخت کے نیچے روک دیا گیا۔ کرتارے نے ندیم سے وہیں جیپ میں بیٹھے رہنے کو کہا اور خود اکیلا ہی چادر کی بکل مار کر اندھیرے میں آگے چلا گیا۔ چاروں طرف اندھیرا اور خاموشی تھی۔ آسمان تاروں سے بھرا ہوا تھا۔ دور دور کسی جگہ سے بھی کوئی ٹمٹماتی ہوئی روشنی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ سکھ ڈرائیور جیپ کی اگلی سیٹ پر اور ندیم پچھلی سیٹ پر خاموش بیٹھا تھا۔

دس پندرہ منٹ گزر گئے۔ پھر اندھیرے میں ایک ہیولا نظر آیا۔ یہ کرتارا تھا۔ اس نے آتے ہی ڈرائیور سے کہا کہ وہ جیپ واپس لے جائے۔ ندیم جیپ سے اتر آیا۔ کرتارا اُسے ایک طرف لے گیا اور بولا "یہاں سے خطرناک سرحدی علاقہ شروع ہوتا ہے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں بارودی سرنگیں نہیں ہیں۔ ہندو صوبیدار نے خاص طور پر مجھے یہ راستہ بتایا ہے۔ میرے پیچھے پیچھے چلو آؤ خبردار۔ ذرا سا کھانسنا بھی نہیں۔ ایک فرلانگ پر ہماری بائیں جانب بھارتی فوج کے مورچے ہیں۔"

چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا تھا۔ ندیم خاموشی سے کرتارے کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ یہاں سوکھی جھاڑیاں جگہ جگہ اگی ہوئی تھیں۔ ستاروں کی دھیمی دھیمی روشنی کے غبار میں دونوں انسانی سائے پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے آگے بڑھ رہے تھے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد کرتارا رک کر اندھیرے میں ادھر اُدھر دیکھ لیتا تھا۔ جھاڑیاں ختم ہو گئیں۔ اب سامنے بنجر علاقہ تھا۔ اندھیرے میں وہاں کوئی درخت یا جھاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ آگے ایک چھوٹا سا ٹبہ آگیا۔ ٹبہ کی ایک جانب کھال بہہ رہا تھا۔ کرتارے نے ندیم کو کھال کے کنارے ٹبے کے پاس اشارہ سے بٹھا دیا اور خود جھک کر ٹبے کی دوسری جانب چلا گیا۔ دو منٹ بعد واپس آیا تو اس کے پیچھے پیچھے ایک دوسرا انسانی سایہ بھی تھا چلا آ رہا تھا۔ قریب آنے پر ستاروں کی پھیکی روشنی میں ندیم نے دیکھا کہ وہ ایک

فوجی تھا جس کے ہیلمٹ کی جالی میں درخت کی شاخیں لگی تھیں اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اندھیرے میں اس کی زردی مائل آنکھیں چمک رہی تھیں۔ دونوں وہیں بیٹھ گئے۔ کرتارے نے آہستہ سے کہا۔ "صوبیدار جی! یہ ہمارا آدمی ہے۔"

صوبیدار نے بھی سرگوشی میں جواب دیا "اب تم جاؤ۔ اسے میرے ساتھ کر دو۔"

کرتارے نے ندیم کے کاندھے کو آہستہ سے دبایا اور اٹھ کر کھال کے کنارے کنارے واپس چل دیا۔

صوبیدار نے ندیم سے کہا "میرے پیچھے چلے آؤ۔"

ہندو صوبیدار ندیم کو لے کر کھال کے اندر اتر گیا۔ یہ کھال ادھر اُدھر سے گھوم گھام کر ایک چھوٹی سی جھلار کے پاس نکل آیا۔ صوبیدار نے ندیم کو ہاتھ سے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ باہر آ کر اس نے ندیم کو زمین پر بٹھا دیا اور اس کے کان کے پاس منہ لا کر سرگوشی میں بولا "وہ سامنے بائیں جانب پاکستانی فوج کے مورچے ہیں۔ یہاں سے ادھر بھاگ جاؤ پیچھے سے تم پر گولی نہیں چلائی جائے گی۔ آگے کی ذمہ داری تمہاری ہے چلو۔ ڈبل لگاؤ۔" ندیم کو آگے اور پیچھے دونوں جانب موت نظر آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ آگے بڑھنے پر مجبور تھا۔ ہندو صوبیدار نے اسے آگے دھکا دے دیا اور ندیم نے جھک کر سامنے کی جانب دوڑنا شروع کر دیا۔ یہ دونوں سرحدوں کے درمیان غیر جانبدار علاقہ تھا۔ اندھیرے میں ندیم بے تحاشا بھاگتا جا رہا تھا۔ سامنے اونچی ڈھیریاں سی آگئیں۔ ندیم دوڑتا ہوا ان ڈھیریوں کے پاس پہنچا تو کسی نے چلا کر کہا "ہالٹ! کون ہے۔"

ندیم نے بلند آواز میں کلمہ شریف پڑھا اور دونوں ہاتھ بلند کر دیئے۔

٭ ٭ ٭

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوسری رات کرتارے اسمگلر نے شبانہ کو بھی سرحد پار کرا دی۔

ان دونوں کو غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے کی کوشش میں پاکستانی حکام نے حراست میں لے لیا۔ ان کے ساتھ قانونی کارروائی ایک لازمی بات تھی ان دونوں کو ہم قانون کے حوالے کر کے نجمی اور بادل کی طرف چلتے ہیں۔ کرتارے نے زنگو ڈاکو، نجمی اور بادل کو بتا دیا تھا کہ ندیم اور شبانہ پاکستان پہنچ چکے ہیں اور پاکستانی حکام کی حراست میں ہیں۔ نجمی نے اطمینان کا سانس لیا کہ چاہے کسی طرح سے بھی سہی لیکن وہ دونوں پاکستان پہنچ گئے تھے اور ان کی زندگی اور عزت محفوظ ہو گئی تھی۔ زنگو ڈاکو نے کرتارے سے کہا "اب ہماری دوسری بی بی جی ندا کو بھی پاکستان پہنچانا ہے کرتارے!"

کرتارا بولا "میں حاضر ہوں سردار جی۔"

اس نے نجمی سے کہا "بہن جی! آپ آج کی رات آرام کر لیں واہگورو کی کرپا سے کل رات کو آپ کو بھی سرحد پار کرا دوں گا۔"

سارا دن زنگو ڈاکو کے ڈیرے پر نجمی نے کچھ سو کر اور کچھ بادل سے باتیں کرتے گزار دیا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ان کا بہت بڑا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ شبانہ اور ندیم پاکستان پہنچ چکے تھے یہ ایک بہت بڑا مسئلہ طے ہو گیا تھا اب کل رات وہ بھی بارڈر کراس کر کے پاکستان پہنچنے والی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ اسے بھی پاکستان کی سرحد میں داخل ہوتے ہی حراست میں لے لیا جائے گا۔ یہ اسے ندیم کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ اس کے باپ کا لاہور میں انتقال ہو چکا ہے اور سوتیلی ماں اپنے گاؤں جا چکی ہے اور لاہور کے پرانے مکان پر تالا پڑا ہے۔ نجمی کے کچھ

رشتے دار لاہور میں ضرور تھے لیکن ظاہر ہے وہ اس کی مدد کبھی نہیں کریں گے۔ بلکہ وہ تو نجمی کو پہچاننے سے بھی انکار کر دیں گے۔ نجمی خود بھی ان سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا مشن اب یہی تھا کہ ندیم سے شادی کر کے ہنزہ یا کاغان وغیرہ کے علاقے میں چلی جائے اور ایک نئی اور شریفانہ زندگی کا آغاز کرے۔ اس کے ماضی کے ساتھ کچھ ایسے واقعات منسلک ہو گئے تھے کہ شہر میں اس کے رشتے دار اسے کبھی اطمینان سے زندگی بسر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ اسے یقین تھا کہ ندیم اور شبانہ اس کے لیے بھی کسی وکیل کا انتظام کر دیں گے اور بہت ممکن ہے کہ عدالت اس کی طویل اور المناک کہانی سن کر اسے بری کر دے۔

انہی خیالات میں گم نجمی کو پتہ بھی نہ چلا کہ شام ہو گئی ہے۔ اس نے بادل کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ بادل بھی ندیم اور شبانہ کے پاکستان پہنچ جانے پر خوش اور مطمئن تھا۔ کہنے لگا۔

"اب خدا کرے کہ تم بھی خیریت سے اپنے وطن پہنچ جاؤ۔"

نجمی نے کہا "بادل! پاکستان پہنچ کر تمہارے احسان ضرور یاد آئیں گے۔"

بادل بولا "نجمی بہن! یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ میں نے تو اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اس میں احسان والی بات نہیں ہے۔"

کھانا کھانے کے بعد وہ کٹیا کے سامنے چارپائی پر بیٹھے، زنگو ڈاکو کے پاس جا کر بیٹھ گئے زنگو کھانا کھا چکا تھا اور دو ڈاکو اس کے کاندھے دبا رہے تھے۔ دور درخت میں لالٹین جل رہی تھی جہاں کچھ گھوڑے کھڑے چارہ وغیرہ کھا رہے تھے۔ باقی ڈاکو رات کو سونے کے لیے ادھر اُدھر زمین پر دریاں اور بانس کی چارپائیاں بچھا رہے تھے اتنے میں ایک آدمی درختوں کے اندھیرے میں سے نکل کر دوڑتا ہوا آیا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ آتے ہی بولا "سردار! کرتارا پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔"

زنگو ڈاکو نے حیرت سے پوچھا "پولیس مقابلہ؟ ارے پولیس یہاں کہاں سے آ گئی۔؟"

وہ آدمی جو زنگو ڈاکو کا خاص مخبر اور جاسوس تھا سانس درست کرتے ہوئے بیٹھ گیا اور بولا "سردار! پولیس رکھ میں داخل ہو گئی ہے۔ سب سے پہلے کرتارا ان کے سامنے آ گیا۔ کرتارے نے گولی چلانی چاہی تو سب انسپکٹر نے اسے گولی مار کر وہیں ڈھیر کر دیا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زنگو ڈاکو یہ سن کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو آواز دی "تیاری کر واوئے۔
ہمارے سالے ہندو پولیس والے آگئے ہیں۔"
نجمی اور بادل بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ زنگو ڈاکو نے ان کی طرف دیکھ کر کہا "پریشان
کیوں ہوتے ہو یار! جب تک زنگو زندہ ہے تم پر کوئی مائی کا لال ہاتھ نہیں ڈال سکتا"
نجمی کو سب سے زیادہ دکھ اس بات کا ہوا تھا کہ جس شخص یعنی کرتارے نے اسے اگلی
رات باڈر کراس کرانا تھا وہ مارا گیا تھا۔ فوری طور پر سرحد پار کرنے کی امید کی شمع گل ہو
گئی تھی۔ زنگو ڈاکو کے ڈیرے میں ایک ہل چل سی مچ گئی۔ ڈاکو ادھر ادھر دوڑ کر رائفلیں
اور بندوقیں وغیرہ سنبھالنے لگے۔ زنگو ڈاکو نے ریوالور میں گولی ڈالتے ہوئے اپنے مخبر سے
پوچھا "کتنی نفری ہے پولیس کی؟"
مخبر نے کہا "بڑی نفری ہے سردار جی!"
زنگو ڈاکو نے چلا کر پوچھا "اوئے بڑی کے پتر یہ بتا آدمی کتنے ہیں؟"
مخبر نے فوراً جواب دیا "ڈیڑھ دو سو سپاہی ہیں سردار جی! ان کے ساتھ اسلحے کی جیپیں بھی
ہیں۔"
ایک لمحے کے لیے زنگو ڈاکو چپ سا ہو گیا "ڈیڑھ دو سو؟" اس نے کسی قدر تعجب سے
کہا۔ پھر فوراً ہی نفرت انگیز قہقہہ لگا کر کہنے لگا "سوں گورو کی میں ایک ایک کو بھون کر رکھ دوں
گا۔ آج ان میں سے ایک بھی زندہ واپس نہیں جائے گا۔"
مخبر اٹھ کر دوسری طرف چلا گیا زنگو نے بادل اور نجمی کی طرف دیکھ کر کہا "گھبرانے کی ضرورت نہیں
ہے یارو۔ ایسے چھاپے پڑتے ہی رہتے ہیں۔ تم کو بھی اس کا تجربہ ہو گا۔ میرے ساتھ آؤ۔"
تمام لالٹینیں فوراً بجھا دی گئیں۔ زنگو نے اپنے ساتھیوں میں اسلحہ بانٹ کر انھیں ذخیرے میں
چاروں طرف پھیلا دیا اور خود نجمی اور بادل کو لے کر ذخیرے کے جنوب کی طرف بڑھا۔ ایک ایک
رائفل نجمی اور بادل نے بھی تھام رکھی تھی۔ ڈیرے سے کچھ دور ایک چھوٹا سا ٹبہ تھا جہاں ان لوگوں
نے مورچہ بنا رکھا تھا۔ زنگو ڈاکو، نجمی اور بادل اس مورچے میں بیٹھ گئے۔ رائفلوں کا رخ سامنے
درختوں کی جانب تھا۔ ایک پل کے لیے چاروں طرف گہری خاموشی چھا گئی۔ زنگو ڈاکو، نجمی اور بادل

کے درمیان میں مورچہ سنبھالے بیٹھا تھا۔ ان سب کی رائفلوں کا رخ بالکل سامنے تھا۔ زنگو نے
آہستہ سے کہا "ان کو آنے دو سب میرے سالے ہیں۔ ایک ایک کو ختم کر دوں گا۔"
بادل نے دبی زبان میں کہا "زنگو یہاں کے حالات تم بہتر جانتے ہو لیکن میری رائے میں ہمیں
آگے جا کر مورچے سنبھالنے چاہیئے تھے۔"
زنگو نے ہندو پولیس کو گالی دیتے ہوئے کہا "میں انھیں یہاں گھیر کر ماروں گا۔ میرے آدمی ان
کے پیچھے سے آگے بڑھیں گے۔ تم دیکھتے جاؤ خان۔"
پھر نجمی کی طرف دیکھ کر بولا "بہن جی! معاف کرنا تمھیں پریشان ہونا پڑا۔ پر تم بھی تو دلیر
بچی ہو۔"
اور زنگو ہنس دیا۔ نجمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک بات کا اسے ضرور احساس تھا کہ پولیس کی
نفری زیادہ ہے اور مخبر کی اطلاع کے مطابق وہ اسلحے کا کافی اسٹاک لے کر آئی ہے۔ اس کا بھی
یہی خیال تھا کہ انھیں ذخیرے میں آگے جا کر پولیس پر حملہ کرنا چاہیئے تھا۔ مگر وہ مشورہ دینے کی
پوزیشن میں نہیں تھی۔ سب سے زیادہ غم نجمی کو اس بات کا تھا کہ اسے سرحد پار کرانے والا
ہلاک ہو چکا تھا۔ اب انھیں نئے سرے سے منصوبہ تبدیل کرنی ہو گی۔ جنگل میں سناٹا تھا۔ اچانک
ایک طرف سے فائر کی آواز گونجی۔ اس کے ساتھ ہی دھائیں دھائیں تین چار فائر ہوئے
یہ تھری ناٹ تھری کے فائر تھے۔ جنگل گونج اٹھا۔ زنگو نے کہا "فائر پیچھے سے آیا ہے۔ میرے آدمی
مقابلہ کر رہے ہیں۔"
بادل نے کہا "اس طرف سے بھی پولیس ضرور آگے بڑھ رہی ہو گی۔"
زنگو ڈاکو نے قہر بھری آواز میں کہا "میں ایک ایک کو بھون کر رکھ دوں گا۔" ابھی تک سامنے سے
کوئی فائر نہیں آیا تھا۔ پیچھے کی جانب بھی خاموشی چھا گئی۔ یہ خاموشی بڑی ہولناک تھی۔ اس میں
آنے والے طوفان کی بجلیاں چھپی ہوئی تھیں۔ پھر یہ خاموشی جیسے پھٹ گئی اور دائیں بائیں...
فائرنگ شروع ہو گئی۔ فائرنگ مسلسل ہونے لگی تھی۔ کوئی پتہ نہیں تھا کہ پولیس کدھر سے فائر کر
رہی ہے اور زنگو کے ساتھی کس طرف فائر کر رہے ہیں۔ فائرنگ ایک جگہ پہلے تو رکی رہی۔ پھر
اس کی آواز پیچھے اور دائیں بائیں سے آگے بڑھنے لگی۔ زنگو ڈاکو کچھ بے چین سا دکھائی دیتا تھا۔ وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بار بار مورچے میں سے گردن نکال کر پیچھے دیکھ رہا تھا۔ "کتے! پیچھے سے آرہے ہیں میرے آدمی ان سب کو ڈھیر کر دیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی سامنے سے بھی فائر کھول دیئے گئے۔ پولیس ذخیرے کے اس جنگل کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے کر مسلسل فائرنگ کرتی آگے بڑھ رہی تھی۔ زنگو ڈاکو نے اونچی آواز میں للکار کر کہا "بھون کر رکھ دوں گا سو گورو دی۔"

اور ساتھ ہی اس نے دھڑا دھڑ فائرنگ شروع کر دی۔ نجمی اور بادل بھی فائر کرنے لگے۔ گولیاں سامنے اندھیرے میں درختوں سے ٹکرا ٹکرا کر گر رہی تھیں۔ ابھی تک کسی انسان کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ پولیس بڑے نظم و ضبط کے ساتھ برابر آگے بڑھ رہی تھی۔ فائرنگ کی آواز قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ پولیس آگے بڑھ رہی ہے۔ زنگو ڈاکو کا جوش بڑھتا جا رہا تھا۔ نجمی اور بادل نے محسوس کیا کہ زنگو ڈاکو کی منصوبہ بندی ناقص تھی اور وہ چاروں طرف سے پولیس میں گھر گئے ہیں۔ تڑا تڑ فائر ہو رہے تھے۔ سارا جنگل گونج رہا تھا۔ اب گولیاں نجمی، بادل اور زنگو کے سروں کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ بادل نے کہا "زنگو ہمیں بائیں جانب آگے جا کر مورچہ سنبھالنا چاہیئے۔ اس طرح ہم پولیس کے پیچھے نکل آئیں گے۔"

مگر زنگو ڈاکو کو کوئی ہوش نہیں تھا۔ وہ للکار رہا تھا۔ بھڑکیں مار رہا تھا اور میگزین چڑھا چڑھا کر دھڑا دھڑ بیکار فائر کر رہا تھا۔ اچانک ایک گولی سامنے سے آکر اس کے ماتھے میں لگی وہ پیچھے کو گرا اس کا چہرہ خون آلود ہو گیا۔ تھری ناٹ تھری کی گولی نے اس کی آدھی کھوپڑی اڑا دی تھی۔ نجمی نے اوپر تلے تین فائر کیے اور بادل سے کہا "یہاں سے بائیں طرف نکل چلو بادل۔"

بادل نے بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ بائیں جانب سے فائر نہیں آرہا تھا۔ وہاں ایک خالی شگاف تھا۔ گولیاں چاروں طرف چل رہی تھیں۔ بادل مورچے میں سے کھسک کر پیچھے ڈھلان پر اتر آیا نجمی اس کے پیچھے تھی۔ دونوں جھکے جھکے درختوں کی طرف دوڑ پڑے۔ درختوں کے اندھیرے میں وہ دور تک دوڑتے چلے گئے۔ پہلے گولیاں ان کے سروں کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ اب ان کے شرارے بائیں جانب پہلو میں نظر آنے لگے تھے۔ دونوں ٹاہلی کے چھریرے درختوں میں

دوڑتے جا رہے تھے۔ رائفلیں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ وہ جنگل کے شمال مغرب کی جانب کافی آگے نکل گئے۔ اب فائرنگ ان کے پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ اب بھی دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ اس شدید فائرنگ میں صرف یہی ایک علاقہ محفوظ تھا۔ پیچھے سے اب ڈاکوؤں اور پولیس کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ نجمی اور بادل کافی دور نکل آئے ہیں۔ لیکن ابھی تک وہ محفوظ نہیں تھے۔ نجمی تھک گئی تھی لیکن بادل اسی طرح لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندھیرے میں درختوں سے بچتا آگے بڑھ رہا تھا۔ درختوں کا یہ ذخیرہ بہت وسیع تھا۔ وہ ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا انھیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ جہاں یہ جنگل ختم ہوتا ہے اس سے آگے کیا ہے؟

نجمی جب بالکل ہی بے دم ہو گئی تو ایک جگہ بیٹھ گئی۔ بادل بھی وہیں بیٹھ گیا۔ دونوں کا سانس پھولا ہوا تھا۔ چند سیکنڈ ان سے بولا نہ گیا۔ پھر بادل نے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا "ہمیں یہاں سے نکلنا ہے نجمی۔ اٹھو۔ ہمت کرو۔"

وہ اٹھے اور ایک بار پھر دوڑ پڑے۔ اسی طرح اندھیری رات میں دوڑتے دوڑتے وہ ایک ایسی جگہ پر آگئے جہاں درختوں کا یہ ذخیرہ ختم ہو گیا تھا۔ سامنے ایک چھوٹا سا کھلا میدان تھا۔ اوپر آسمان پر چمکتے ستارے نظر آنے لگے تھے۔ فائرنگ کی آواز اب بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ ادھر سے انسانی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور بھی بلند ہو رہا تھا۔ پھر یہ شور بھی ختم ہو گیا۔ لگتا تھا پولیس نے ڈاکوؤں کو یا تو مار دیا ہے یا انھیں پکڑ لیا ہے۔ کیونکہ چند لمحوں کے بعد فائرنگ بھی بند ہو گئی۔ بادل اور نجمی درختوں سے نکلتے ہی میدان کے کنارے سوکھی گھاس پر بیٹھ کر سستانے لگے۔ نجمی کے منہ سے جیسے اپنے آپ نکل گیا "بڑی اچھی بات ہوئی ہے کہ شبانہ اور ندیم اس مصیبت سے نکل چکے ہیں۔"

بادل نے دو تین لمبے سانس لیے اور بولا "مجھے افسوس ہے کہ تمھیں پاکستان نہ پہنچا سکا۔ کرتارا بھی مارا گیا۔ زنگو بھی مارا گیا۔ اب ہمیں کوئی اور ترکیب نکالنی ہو گی لیکن سب سے پہلے ہمیں پولیس سے جان بچانے کی ضرورت ہے۔"

نجمی نے اندھیرے میں سامنے پھیلے ہوئے میدان کی طرف دیکھ کر کہا "ادھر آگے ضرور کوئی گاؤں ہو گا۔ میدان اونچا نیچا ہے۔ لگتا ہے آگے پہاڑی علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بادل نے پیچھے جنگل کی طرف نگاہ ڈالی اور بولا "اس علاقے سے میں تھوڑا بہت واقف ہوں لیکن ہمیں یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیئے۔میرے ساتھ آؤ۔"

اور وہ دونوں غیر ہموار میدان میں سے گزرنے لگے۔ان کا رخ شمال کی طرف تھا جہاں آسمان پہ دور قطبی ستارہ چمک رہا تھا۔نجمی شلوار قمیض میں تھی۔گلے میں چادر لٹک رہی تھی۔ ہاتھ میں رائفل تھی اور پاؤں میں ربڑ کے جوتے تھے جو زنگو کے ڈیرے پر آکر اسے دیئے گئے تھے۔بادل بھی شلوار قمیض میں ملبوس تھا۔اس نے صدری پہن رکھی تھی۔دونوں کے اپنے ریوالور ان کے پاس ہی تھے۔کچھ فالتو گولیاں بھی بادل کی صدری میں محفوظ تھیں۔مگر رائفل کا میگزین خالی ہو چکا تھا۔میدان کے پار ایک چھوٹی سی کھائی آئی تو بادل نے کہا "میرا خیال ہے رائفلیں اب ہمارے لیے بیکار ہیں انھیں اسی جگہ پھینک دینا چاہیئے۔"

اور انھوں نے دونوں رائفلیں کھائی کے کیچڑ میں پھینک دیں۔کھائی کو انھوں نے ایک چھوٹے سے پل کے ذریعے پار کیا۔بادل نے دور سامنے اندھیرے میں ایک پہاڑی کی چوٹی کی طرف اشارہ کیا اور بولا "پٹھان کوٹ کی پہاڑیاں وہاں سے شروع ہو جاتی ہیں۔ہمیں اسی طرف چلنا ہو گا۔"

نجمی نے کہا "کیا ادھر ہمیں کسی جگہ پناہ مل سکتی ہے؟"

بادل ایک لمحہ خاموش رہا۔پھر بولا "نجمی بہن! میرا تو خیال ہے کہ ہمیں واپس اپنے ڈیرے پہ ہی چلے جانا چاہیئے اور کسی دوسرے موقع کا انتظار کرنا چاہیئے کہ تم پنجاب میں آ کر سرحد پار کر سکو۔"

نجمی نے فوراً جواب دیا "نہیں بادل! اب میں واپس نہیں جاؤں گی اپنے ڈیرے سے نکل چکی ہوں اب میرا رخ پاکستان کی طرف ہے۔میں سرحد کے قریب بھی ہوں۔یہیں کہیں آس پاس کوئی ڈیرہ بنا لیتے ہیں۔خدا نے چاہا تو سرحد پار کرنے کی کوئی نہ کوئی ترکیب نکل آئے گی۔"

بادل نے نجمی کو اس وقت زیادہ مجبور کرنا مناسب نہ سمجھا۔وہ نجمی کی ضدی طبیعت سے واقف تھا اسے یہ بھی علم تھا کہ ایک طرح سے نجمی پیچھے اپنی ساری کشتیاں جلا کر آئی ہے اور اس نے عہد کر رکھا ہے کہ اب وہ پاکستان ہی جائے گی۔اس کے واپس جانے کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا۔لیکن بادل اپنے ساتھ اسے بھی کسی مصیبت میں گرفتار کرانا نہیں چاہتا تھا۔اس علاقے میں اس کا ایک بااعتماد دوست زنگو ڈکیت تھا جو مارا جا چکا تھا۔آگے جو علاقہ شروع ہو رہا تھا وہ جموں کشمیر

کے بارڈر کا ایریا تھا اور سارے کا سارا خطرناک علاقہ تھا بادل کو اپنی اور نجمی کی حفاظت سب سے مقدم تھی۔آگے کا سارا علاقہ بادل کا دیکھا بھالا تھا۔اس سارے ایریا میں صرف ایک جگہ پناہ مل سکتی تھی اور یہ جگہ جموں کشمیر کی ایک بستی تھی جہاں بادل کا ایک مسلمان ڈوگرہ دوست منیاری کی دکان کرتا تھا جس زمانے میں بادل ابھی ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل نہیں ہوا تھا اور بھوپال کی فیکٹری میں نوکر تھا تو جموں کا یہ دوست جس کا نام لال دین تھا۔بھوپال میں منیاری کی دکان کیا کرتا تھا۔لال دین کا مکان بادل خان کی گلی میں ہی تھا۔دونوں کی آپس میں بڑی دوستی تھی۔پھر بادل سے محلے میں ایک قتل ہو گیا اور وہ مفرور ہو کر جنگلوں میں نکل گیا جہاں اس نے ڈاکوؤں کے ایک گروہ میں شمولیت اختیار کر لی۔اس کے بعد دو ایک بار اپنے دوست لال دین سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔لال دین اب بھی بادل کو اپنا گہرا دوست سمجھتا تھا اور اس نے ایک بار بادل کو اپنے مکان میں پناہ بھی دی تھی جب پولیس اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔پھر لال دین بھوپال چھوڑ کر واپس اپنے شہر جموں چلا گیا۔اس نے شادی نہیں کی تھی اور جموں میں سکون کی زندگی بسر کر رہا تھا۔جموں میں ایک بار بادل کو اپنے گروہ کے سردار کے ساتھ بھیس بدل کر آنا پڑا تو وہ چھپ کر لال دین کے گھر اس سے ملنے چلا گیا تھا۔

بادل نے یہی سوچ رکھا تھا کہ وہ سیدھا جموں کشمیر اپنے دوست کے پاس جا کر پناہ لے گا اور وہاں اطمینان کے ساتھ نجمی کو اس بات پر راغب کرنے کی کوشش کرے گا وہ واپس بہار کے جنگل میں اپنی کمین گاہ میں چلی چلے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔کیونکہ اس علاقے میں بادل نجمی کو ساتھ لے کر آزادی سے نہیں پھر سکتا تھا۔اس سارے علاقے میں خفیہ پولیس کے آدمی سفید لباس میں موجود تھے۔یہ بات پہلے ہی سے بادل کو معلوم ہو چکی تھی چلتے چلتے وہ دونوں ایسے علاقے میں آ گئے جہاں چھوٹی چھوٹی گھاٹیاں شروع ہو گئی تھیں۔یہ ہماچل پردیش کی ابتدائی ترائی کا علاقہ تھا اوپر اس ترائی کی شمال کی طرف چمبہ تھا۔مشرق کی طرف کانگڑہ وادی شروع ہو جاتی تھی اور شمال مغرب کی طرف جموں کا ایریا تھا۔یہاں سے آگے بادل کی پہلی منزل پٹھان کوٹ تھی۔وہاں سے وہ جموں اپنے دوست کے پاس جانا چاہتا تھا۔اپنے دوست کے بارے میں بادل نے نجمی کو بتایا اور کہا کہ وہ جموں پہنچنے کی کوشش کریں گے۔

نجمی بولی "یہ ٹھیک ہے۔جموں سے آگے ہم کشمیر کی طرف نکل جائیں گے۔میرا خیال ہے کہ کشمیر کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہاڑیوں میں سے میں پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ بادل کشمیر میں تمھارا کوئی ایسا آدمی واقف نہیں ہے جو مجھے آزاد کشمیر پہنچا دے؟"

بادل نے کہا "سب سے پہلے ہمیں جموں پہنچنا ہے وہاں جا کر میں اپنے دوست لال دین سے بات کروں گا۔ ہو سکتا ہے وہاں کوئی سبیل پیدا ہو جائے اور سرحد پار کرنے کا کوئی راستہ نکل آئے۔"

نجمی بادل کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہی تھی، وہ تھک گئی تھی۔ کھائیاں اور گھاٹیاں ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ رات بھی گھپ اندھیری تھی کہیں سبزہ آ جاتا اور کہیں سنگلاخ پتھریلی زمین شروع ہو جاتی۔ ایک جگہ انھیں پانی کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ اس آواز کی طرف بڑھے۔ ایک جگہ پتھروں میں پانی کا چشمہ بہہ رہا تھا۔ دونوں کو سخت پیاس لگ رہی تھی چشمے پر بیٹھ کر انھوں نے سیر ہو کر پانی پیا۔ منہ ہاتھ اور پاؤں دھوئے۔ تھوڑی دیر وہاں ستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ جب طبیعت بحال ہوئی تو پھر چل پڑے۔ بادل نے قطبی ستارے کو اپنا راہنما بنا رکھا تھا۔ ساری رات وہ دونوں اسی طرح چلتے رہے کہ تھک جاتے تو کہیں تھوڑی دیر کے لیے ستاتے اور پھر سفر شروع کر دیتے دن کی نیلی نیلی روشنی آسمان پر پھیلنے لگی۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلے اور میدان اندھیرے میں سے ابھرنے لگے۔

بادل نے ایک ٹیلے پر چڑھ کر شمال مغرب کی طرف دیکھا اور بولا "ہم ٹھیک راستے پر چلتے رہے ہیں نجمی! وہ سامنے پہاڑیاں دیکھ رہی ہو۔ یہ پٹھان کوٹ کی پہاڑیاں ہیں۔ ہماری پہلی منزل پٹھان کوٹ ہی ہے۔"

بادل نے صدری کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر کہا "روپے میرے پاس موجود ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آگے دنیا نگر آئے گا۔ ہم وہاں سے پٹھان کوٹ والی بس پکڑ لیں گے۔"

نجمی نے کہا "سو سو کے پندرہ بیس نوٹ میرے پاس بھی ہیں۔ ان ریوالوروں کا کیا کریں۔ آگے کہیں پولیس چیکنگ تو نہیں کرتی؟"

بادل سر کھجاتے ہوئے بولا "ایسی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے۔ ہم عام شہریوں کے لباس میں ہیں۔ کسی کو ہم پر شک نہیں ہو گا۔ ہاں پولیس کو اگر شک ہو گیا تو ہماری تلاشی لی جا سکتی ہے کیونکہ

اس علاقے میں ہر وقت ہنگامی حالات ہی رہتے ہیں۔"

نجمی نے کہا "میں ریوالور اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں۔"

میرا ریوالور بھی میرے پاس ہی ہے۔ تم بھی اپنا ریوالور اپنے پاس ہی رکھو اگر کوئی ایسی صورتحال پیدا ہو گئی تو دیکھا جائے گا۔" یہ کہہ کر بادل ٹیلے سے نیچے اتر آیا۔ تھوڑی دیر میں ساری ترائی میں سورج کی سنہری روشنی پھیل گئی۔ اس سارے علاقے میں چھوٹے قد کی چھتری دار درخت جگہ جگہ جھنڈوں کی صورت میں موجود تھے۔ نجمی کو اس کی پچھلی زندگی نے کافی سخت جان بنا دیا تھا۔ پھر بھی وہ ساری رات سے بادل کے ساتھ وقفے وقفے کے بعد چل رہی تھی، اور اب وہ تھک کر چور ہو چکی تھی۔ ساری رات کا جگراتا الگ تھا۔ لیکن یہ ان دونوں کی زندگی اور موت کا معاملہ تھا جس کی وجہ سے وہ ابھی تک چلے جا رہے تھے۔ دن نکلا تو انھیں ہر شے صاف نظر آنے لگی۔ ایک جگہ نشیب میں چھوٹی سی پانی کی آبشار گر رہی تھی۔ یہاں انھوں نے منہ ہاتھ دھویا۔ پانی پیا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر تازہ دم ہوئے۔ بادل نے راستے کا تعین کیا پھر اندازے سے دنیا نگر کی طرف چل پڑے۔ گھاٹیاں ختم ہونے لگیں۔ زمین ہموار ہو گئی تھی۔ پہاڑیاں دور سے صاف دکھائی دے رہی تھیں، ایک جانب چھپے اور دوسری جانب جموں کے پہاڑ وہاں سے کافی فاصلے پر تھے۔ چھتری دار درخت ختم ہوئے تو کیکر اور دھریک کے درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پھر چھوٹے چھوٹے کھیت نظر آنے لگے۔

بادل نے کہا "سامنے ایک گاؤں نظر آ رہا ہے۔"

نجمی نے بھی درختوں کے جھنڈوں میں ایک گاؤں میں سے دھواں اٹھتے دیکھ لیا تھا۔ گاؤں کے قریب پہنچ کر وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ گاؤں وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ مکانوں کی ڈھلانی چھتیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ ایک کسان کھیتوں میں ہل چلا رہا تھا۔ ایک عورت سر پر چارے کا گٹھا رکھے گاؤں میں داخل ہو رہی تھی۔ بادل کہنے لگا "تم اسی جگہ بیٹھو میں جا کر پتہ کرتا ہوں کہ یہاں سے دنیا نگر کو کونسا راستہ جاتا ہے۔"

نجمی کو دھریک کے درخت کے نیچے بٹھا کر بادل آہستہ آہستہ اس کسان کی طرف چل پڑا جو کھیتوں میں ہل چلا رہا تھا۔ کھیت کے کنارے پہنچ کر اس نے کسان کو دور سے سلام کیا اور پوچھا کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دینا نگر کو یہاں سے کونسا راستہ جاتا ہے۔ کسان نے ہل روک لیا۔ ماتھے پر آیا ہوا پسینہ صافے سے پونچھتے ہوئے بادل کی طرف دیکھا پھر مغرب کی طرف اشارہ کرکے بولا "وہاں تمہیں باولی کے قریب جاتی پکی سڑک ملے گی۔ اس پر دو کوس چلو گے تو دینا نگر والی پکی سڑک آجائے گی۔ یہی کوئی چھ کوس ہوگا دینا نگر، تم کہاں سے آرہے ہو؟"

بادل نے کہا "میری بہن بیمار ہے۔ وہ میرے ساتھ ہے۔ اسے دینا نگر کے اسپتال میں داخل کرانے لے جا رہا ہوں۔"

بادل کسان کے سوال کو گول کر گیا۔ وہ اسے کیا بتاتا کہ کہاں سے آرہا ہوں کسان نے کوئی جواب نہیں دیا اور بیلوں کو ہانکتے ہوئے دوبارہ ہل چلانے میں مصروف ہوگیا۔ بادل کو یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ وہ اپنی منزل کے قریب ہے اور اس کا اندازہ ٹھیک نکلا۔ وہ منزل سے بھٹک کر بارڈر کے خطرناک علاقے میں بھی نکل سکتا تھا۔ اس نے واپس آکر نجمی کو بتایا کہ ہم دینا نگر کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ نجمی نے پوچھا "وہاں سے پٹھان کوٹ کتنی دور ہے؟"

بادل بولا "کوئی زیادہ دور نہیں اور پھر ہم دینا نگر سے پیدل تھوڑا ہی جائیں گے، پٹھانکوٹ والی بس پکڑ لیں گے۔ آؤ اب چلتے ہیں۔ یہاں زیادہ دیر رکنا ٹھیک نہیں۔"

گاؤں کو ایک طرف چھوڑ کر وہ کھیتوں کھیت باولی کے پاس آگئے۔ یہاں سے ایک کچی سڑک باہر ہوگئے یہ دو کوس کا فاصلہ انھوں نے سڑک سے ہٹ کر کھیتوں ہی سے گزرتے ہوئے طے کیا۔ آگے پکی سڑک آگئی۔ یہاں سے ایک لاری شور مچاتی ہوئی گزر گئی۔ بادل نے نجمی سے کہا کہ یہاں سے دینا نگر زیادہ دور نہیں ہے اتنے میں دو فوجی ٹرک گزرے۔ بادل اور نجمی نے دوسری طرف منہ کر لیا۔ انھیں یونہی فوجی ٹرکوں سے خطرہ محسوس ہوا تھا۔

نجمی نے کہا "بادل! یہاں سے دینا نگر جانے والی لاری کیوں نہ پکڑ لیں؟ ادھر سے کوئی لاری یا بس آئی تو اسے ہاتھ دے کر روک لینا۔"

مگر بادل یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ کیا معلوم لاری میں پہلے سے پولیس کا کوئی سپاہی موجود ہو۔ رات کو ہی پولیس نے نہر والے جنگل میں چھاپہ مارا تھا۔ گھمسان کا رن پڑا تھا۔ کچھ ڈاکو جان بچا کر بھاگے بھی ہوں گے اور بہت ممکن تھا کہ پولیس ان کی تلاش میں سارے علاقے

میں پھیل گئی ہو۔ اس نے نجمی سے کہا "یہاں سے بس میں بیٹھنا مناسب نہیں ہے۔ نجمی دینا نگر یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں ہے چلتی چلو۔" سورج مشرق میں کافی اوپر تک آگیا تھا۔ یہاں موسم ٹھنڈا تھا اور گرمی بنگال بہار والی نہیں تھی ویسے بھی یہ پہاڑی ترائی کا علاقہ تھا۔ نجمی نے اپنے سر اور جسم کو چادر میں اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ بادل کے کاندھے پر بھی چادر تھی اور وہ چاروں طرف نگاہ رکھے نجمی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ دینا نگر کے مضافاتی مکانات شروع ہو گئے تھے۔ سڑک پر ٹریفک بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ یہ کوئی زیادہ بڑا شہر نہیں تھا۔ مگر امرتسر سے پٹھان کوٹ جاتے ہوئے یہی ایک اہم شہر تھا۔ لاری اڈہ شہر کے باہر ہی تھا۔ وہاں لاریاں اور چھوٹی چھوٹی بسیں کھڑی تھیں۔ کچھ میں سے مسافر اتر رہے تھے۔ کچھ میں مسافر بیٹھے تھے۔ ہارن بجتا اور کوئی نہ کوئی بس اڈے سے نکل کر امرتسر یا پٹھان کوٹ کی طرف روانہ ہو جاتی۔ لاری اڈے میں پہنچ کر بادل نے نجمی کو ایک گیراج نما مسافر خانے میں دوسری مسافر عورتوں کے پاس بٹھایا اور خود ٹکٹ والی کھڑکی کی طرف بڑھا۔ پٹھان کوٹ والی بس اڈے پر تیار کھڑی تھی۔ بادل نے دو ٹکٹ لیے۔ واپس آکر نجمی کو ساتھ لے کر بس میں سوار ہو گیا۔

بس جب بھر گئی تو پٹھان کوٹ کی طرف چل پڑی۔ بس نیم پہاڑی سڑک پر چلی جا رہی تھی۔ نجمی چادر سر پر آگے کیے خاموش بیٹھی تھی۔ کسی کو اندازہ تک نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ وسطی ہند کی ایک ایسی خطرناک ڈاکو ہے جس کو پولیس ایک عرصے سے تلاش کر رہی ہے۔ یہی حال بادل کا تھا۔ دونوں اپنے کئی دشمنوں کو ٹھکانے لگا چکے تھے۔ دونوں کبھی کبھی ایک دوسرے کو نگاہیں ملا کر دیکھ لیتے تھے۔ ابھی تک ان کی کسی پولیس والے یا خفیہ آدمی سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ نجمی نے اس سے پہلے پٹھان کوٹ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بادل دو تین بار پٹھان کوٹ آچکا تھا۔ یہاں سے اسے جموں کی طرف جانا تھا۔ پٹھان کوٹ کافی بڑا شہر تھا۔ نیم پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے شہر کی سڑکیں کہیں کہیں ڈھلوان تھیں تو کہیں چڑھائی آجاتی تھی۔ شہر کا وسطی حصہ ہموار تھا۔ یہاں ریلوے اسٹیشن بھی تھا۔ جموں تک ٹرین بھی جاتی تھی لیکن بادل لاری کے ذریعے سفر کرنا چاہتا تھا۔ بس پٹھان کوٹ کے لاری اڈے میں داخل ہونے کے بعد رک گئی۔ بادل اور نجمی نے کھڑکی میں سے باہر نگاہ دوڑائی۔ دو پولیس والے اڈے کی ایک طرف چائے کی دکان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے باہر لوہے کی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ بادل اور نجمی لاری سے اتر آئے۔ بادل اسے مسافر خانے میں لے آیا۔ یہاں جموں جانے والی سواریاں پہلے سے بیٹھی تھیں۔

پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ جموں جانے والی لاری دوپہر کے تین بجے روانہ ہوگی پٹھان کوٹ سے جموں تک پہاڑی راستہ تھا۔ ایسا پہاڑی راستہ نہیں تھا جیسا کہ ہمارے ہاں پنڈی سے مری تک کا ہے۔ کٹھوعہ سے آگے تین بڑے بڑے پہاڑ تھے جن کے گرداگرد بنی ہوئی سڑک پر سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔ بادل نے جموں کے دو ٹکٹ لے کر رکھ لیے اور کھانے کے لیے ایک ڈھابے سے دال کا کٹورا اور چھ سات چھوٹے چھوٹے پھلکے لے آیا۔ بھوک سے دونوں کا برا حال ہو رہا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ان کی کھوئی ہوئی طاقت بحال ہوئی۔ نجمی نے چہرہ نیچے کیے کیے بادل سے کہا "ایک آدمی میری دائیں جانب دکان کے باہر بیٹھا مجھے دیر سے گھور رہا ہے۔"

بادل نے اس آدمی کی طرف دیکھے بغیر نجمی سے کہا "تم اس طرف اب مت دیکھنا۔"

بادل نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا اور دیہاتیوں کی طرح کش لگانے لگا۔ جان بوجھ کر وہ زور زور سے کھانسنے لگا اور کھانستے کھانستے دائیں جانب گھوم کر اس طرف دیکھا جہاں پان سگریٹ کی دکان کے باہر ایک کھدر پوش، صدری والا ہندو بینچ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کی نظریں اس وقت بھی نجمی اور بادل کی جانب تھیں۔ جب بادل نے اس کی طرف دیکھا تو صدری والے ادھیڑ عمر ہندو نے آنکھیں دوسری طرف کر لیں۔ پہلے تو بادل کو لگا کہ وہ یونہی اوباش قسم کا آدمی ہے جن کی عادت ہوتی ہے کہ وہ ہر عورت کو گھور کر دیکھتے ہیں۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس قسم کے آدمی مسلسل ایک جگہ بیٹھ کر نہیں گھورا کرتے۔ ویسے شکل سے بھی وہ ہندو کوئی اوباش آدمی نہیں لگتا تھا۔ کہیں یہ خفیہ پولیس کا آدمی نہ ہو؟ اس خیال سے بادل ہوشیار ہو گیا۔ وہ اس بات کی تصدیق کیے بغیر جموں کی طرف روانہ نہیں ہونا چاہتا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اگر یہ خفیہ پولیس کا آدمی ہے تو ان کے تعاقب میں جموں تک ساتھ جائے یا کسی دوسرے آدمی کو ان کے پیچھے لگا دے۔

بادل نے نجمی سے کہا "تم اسی جگہ بیٹھی رہو۔ مجھے شک ہے کہ یہ آدمی جموں کی خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔ میں اس کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔ میں سامنے والے بازار میں سگریٹ لینے کے بہانے

جاتا ہوں۔ ابھی واپس آجاؤں گا۔"

اور بادل خان آہستہ سے اٹھا اور لاری اڈے سے نکل کر سامنے والے بازار کی طرف چل پڑا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کھدر پوش صدری والا آدمی وہیں بیٹھا رہتا ہے یا اس کے پیچھے آتا ہے۔ بادل نے بازار عبور کیا۔ سامنے کچھ چائے سگریٹ کی دکانیں تھیں ایک دکان پر کھدر کے تھیلے لٹکے ہوئے تھے۔ بادل ان تھیلوں کو دیکھنے لگا۔ ایک تھیلا اس نے خرید لیا۔ اور ایسے دوسری دکان کی طرف مڑا جیسے اسے مزید کسی شے کی ضرورت ہو۔ دوسری دکان میاری کی تھی۔ یہاں اس نے دکاندار کو جوتوں کے سفید تسمے دینے کو کہا۔ دکاندار تسمے نکالنے لگا تو بادل نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ اس کا شبہ صحیح نکلا۔ صدری والا آدمی پیچھے کی جانب تین دکانیں چھوڑ کر ایک دکان کے سامنے کھڑا سگریٹ پیتے ہوئے اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ بادل خان نے تسمے لے کر پیسے دیئے اور چوک میں آگیا۔ یہاں ایک ریڑھی والا سنگترے بیچ رہا تھا۔ اس نے کچھ سنگترے خرید کر تھیلے میں ڈالے اور واپس لاری اڈے کی طرف مڑ گیا۔ صدری پوش برابر اس کے تعاقب میں تھا۔ پرانی چھت والے مسافر خانے میں آکر بادل تھیلے میں سے سنگترے نکال کر نجمی کو دکھاتے ہوئے بولا "یہ خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔ یہ ہمارا پیچھا کرتے جموں تک جائے گا۔ اس سے یہیں نمٹنا ضروری ہے۔"

نجمی نے ایک سنگترے کو چھیلتے ہوئے آہستہ سے کہا "اس شہر میں ہم اجنبی ہیں۔ یہاں ہم اس سے کیسے نمٹ سکتے ہیں؟"

بادل بولا "یہ تم مجھ پر چھوڑ دو اور میرے ساتھ چلو۔ ہم ابھی جموں نہیں جائیں گے۔"

بادل نے نجمی کو ساتھ لیا اور پٹھان کوٹ کے لاری اڈے سے نکل کر اسٹیشن بازار کی طرف روانہ ہو گئے۔ بازاروں میں کافی رونق تھی۔ اسٹیشن کے احاطے میں زرد اور کیسری رنگ کی پگڑیاں باندھے چمبہ کانگڑہ کے دیہاتی ٹکڑیاں بنا کر بیٹھے باتیں وغیرہ کر رہے تھے۔ بادل اسٹیشن سے آگے نکل گیا کنک منڈی کی طرف گھومتے ہوئے اس نے بڑے طریقے سے پیچھے گھوم کر دیکھا۔ صدری پوش آدمی برابر ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ بادل نے اپنے دل میں اس ہندو سی آئی ڈی والے سے چھٹکارا حاصل کرنے کے عہد کو مزید پختہ کر لیا تھا۔ اس نے نجمی کے قریب ہو کر کہا "وہ ہمارا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پیچھا کر رہا ہے۔"

کنک منڈی کے بیچ میں سے ایک چھوٹا سا بازار شہر کے کمیٹی باغ کی طرف جاتا تھا۔ بادل ادھر مڑ گیا۔

نجمی اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ اس نے پوچھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔

بادل نے آہستہ سے کہا "تم خاموشی سے چلتی رہو سب ٹھیک ہو جائے گا یہ آدمی ہمارے لیے بے حد خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

باغ کا ایک پرانا گیٹ تھا جس کے درمیان میں آر پار لوہے کی موٹی زنجیر سڑک سے دس پندرہ انچ اونچی بندھی تھی تاکہ رکشہ اسکوٹر وغیرہ اندر نہ لے جائے جا سکیں۔ باغ میں دھوپ نکلی ہوئی تھی، دن کے وقت سیر کرنے والے نظر نہیں آ رہے تھے۔ کہیں کہیں پلاٹوں میں دو ایک آدمی بیٹھے یا کاہلی سے لیٹے دکھائی دے جاتے تھے۔ بادل اس باغ کے حدود اربعہ سے واقف تھا۔ وہ باغ کی دوسری جانب پرانے کنوئیں کے پاس آ کر چیڑ کے ایک درخت کے نیچے نجمی کو ساتھ لے کر بیٹھ گیا اس نے نگاہیں گھما کر دیکھا۔ صدری پوش ہندو بھی کچھ فاصلے پر درخت کے پاس کھڑے ہو کر یونہی سامنے کی طرف تکنے لگا تھا۔ بادل نے نجمی سے کہا "اب تم اسی جگہ بیٹھی رہنا میں اسے ٹھکانے لگا کر آتا ہوں۔"

نجمی نے تھیلے میں سے سنگترہ نکال کر چھیلتے ہوئے کہا "یہ کہیں شور نہ مچا دے۔"

"اس کا موقع نہیں دوں گا۔"

یہ کہہ کر بادل آہستہ سے اٹھا اور پرانے کنوئیں کے پیچھے جو ڈھلان نیچے بدرو کی طرف جاتی تھی اس پر اتر گیا۔ یہاں ڈھلان پر چیڑ اور کیکر کے بے شمار درخت بالکل ساتھ ساتھ اگے ہوئے تھے۔ بادل ان میں جان بوجھ کر مشتبہ انداز میں چلنے لگا۔ وہ بار بار جھک کر یوں زمین کو دیکھنے لگتا جیسے اسے کسی شے کی تلاش ہو۔ یہاں سامنے بھی گندے نالے کی ڈھلان تھی۔ یوں یہاں ایک گھاٹی سی بن گئی تھی۔ اور ادھر باہر کے مکان دکھائی نہیں دیتے تھے۔ بادل نے خاص طور پر یہ جگہ منتخب کی تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ صدری پوش خفیہ پولیس کا آدمی کچھ فاصلہ رکھ کر برابر اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ بادل نے ایک تناور درخت کو چن لیا۔ اس درخت کا تنا کافی بڑا تھا۔

بادل اس کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے صدری کے اندر والی جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور نکالا اور اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ وہ اپنے پیچھے لگے ہوئے خفیہ آدمی کا انتظار کرنے لگا۔ وہ آدمی کچھ پریشان ہو گیا تھا کیونکہ اسے اپنا ٹارگٹ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ تیز تیز چلنے لگا۔ بادل کو اس کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز اس کے درخت کی طرف آ رہی تھی۔ پھر یہ آواز بہت قریب سے آنے لگی۔ خفیہ پولیس والا درخت کے قریب پہنچ گیا تھا۔ ریوالور پر بادل کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ جونہی وہ آدمی درخت کے قریب سے گزرا بادل نے لپک کر ریوالور کی نالی اس کی گردن کے ساتھ لگا دی اور کہا "یہیں بیٹھ جاؤ۔ ذرا آواز نکالی تو گولی چلا دوں گا۔"

خفیہ پولیس والا ہندو بالکل ساکت ہو گیا۔ بادل نے ریوالور کی نالی کو ذرا دبایا اور کہا "بیٹھ جاؤ۔" خفیہ پولیس والا وہیں بیٹھ گیا۔

...

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بادل کی انگلی پستول کے ٹریگر پہ مضبوطی سے جمی ہوئی تھی۔

پستول کی نالی ہندو سی آئی ڈی والے کی گردن میں تھوڑی سی اندر کو دھنسی ہوئی تھی۔ یہ ہندو درختوں کی اوٹ میں بدرو کی ڈھلان پہ دونوں پاؤں پہ بیٹھا کانپ رہا تھا۔ بادل اسے جان بوجھ کر اپنے پیچھے لگا کر یہاں لے آیا تھا۔ نجمی پٹھان کوٹ کے پارک میں بیٹھی تھی۔ وہ اسے بتا کر آیا تھا کہ میں اس سی آئی ڈی والے کو ٹھکانے لگانے جا رہا ہوں۔ کیونکہ وہ آگے جموں میں جا کر ہماری گرفتاری کا باعث بن جائے گا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اس طرف کوئی انسان دور دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ بادل پستول کا فائر بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس ہندو سی آئی ڈی والے کے زمین پہ بیٹھتے بیٹھتے بادل نے سوچ لیا کہ اسے کیا کرنا ہوگا۔ بادل کوئی معمولی جرائم پیشہ آدمی نہیں تھا۔ وہ ایک پورا ڈاکو تھا اور اس کی ساری جوانی ڈاکے مارتے اور قتل و غارت میں گزری تھی۔ وہ ایک طاقتور اور بے رحم آدمی تھا اور دشمن کو اس نے کبھی معاف نہیں کیا تھا۔ وہ نجمی کا وفادار تھا اور اسے ہر حالت میں بارڈر کراس کروا کر واپس پاکستان بھیجنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ سی آئی ڈی والا ہندو اس کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ بن کر کھڑا ہوگیا تھا۔ نجمی اور بادل عام آدمیوں کے بھیس میں دلی سے جموں جا رہے تھے۔ جہاں بادل کا ایک لال دین نام کا پرانا دوست رہتا تھا اور جس کی مدد سے بادل نجمی کو بارڈر کراس کروانا چاہتا تھا کہ راستے میں یہ کم بخت سی آئی ڈی والا اس کے پیچھے لگ گیا تھا۔

سی آئی ڈی والے نے کپکپاتی آواز میں کہا: "مجھے جان سے نہ ماریں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ میں دھرم کی قسم کھاتا ہوں۔"

لیکن بادل دل میں ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے پستول سی آئی ڈی والے کی گردن سے ہٹا لیا وہ سمجھا کہ بادل نے اسے معاف کر دیا ہے لیکن عین اسی لمحے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے اوپر اچانک کوئی پہاڑ گر پڑا ہو۔ اس کی آنکھوں میں بجلی سی چمک گئی۔ یہ اس کی زندگی کی آخری روشنی تھی۔ اس کے بعد سی آئی ڈی والے کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ بادل نے پوری طاقت سے نیچے بیٹھے ہوئے سی آئی ڈی والے کی گردن پر عین پیچھے کی جانب مکا مارا تھا۔ اس ضرب نے اس کی گردن کا منکا دو جگہوں سے توڑ ڈالا تھا۔ وہ آگے کی جانب لڑھک گیا۔ بادل نے اسے پکڑنا چاہا۔ کیونکہ وہ اس کی لاش کو خود بدرو میں کسی مناسب جگہ کیچڑ میں دبا دینا چاہتا تھا لیکن ہندو سی آئی ڈی والے کی لاش ڈھلان کی وجہ سے نیچے لڑھکتی چلی گئی اور دھپ سے بدرو کے گندے پانی میں گری پھر ڈوب گئی۔ بادل نے تیز نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ اسے اپنے ارد گرد اور سامنے بھی کوئی نظر نہ آیا۔ سامنے بدرو کے دوسرے اونچے کنارے کے پیچھے کوٹھیوں کے پچھواڑے لگتے تھے۔ کوٹھیوں کی اکثر دیواروں پر گارڈینیا کی جنگلی بیل چڑھی ہوئی تھی اور یوکلپٹس اور کہیں پوپلر کے درخت پٹھان کوٹ کی چمکیلی دھوپ میں لہرا رہے تھے۔ بادل اوپر چڑھنے لگا۔

پستول اس نے شلوار کے اندر چھپا لیا تھا۔ چادر کو اس نے جسم کے گرد اچھی طرح سے لپیٹا اور باغ میں آ کر نجمی کو ساتھ لے کر بڑے آرام سے لاری اڈے کی طرف روانہ ہو گیا مگر اس کی عقابی نظریں ارد گرد کا جائزہ برابر لے رہی تھیں۔ اسے ایک خطرہ ضرور تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس خفیہ آدمی کے پیچھے بھی اس کی حفاظت کے لیے کوئی دوسرا خفیہ آدمی بھی لگا ہوا ہو۔ بظاہر ایسی بات نظر نہیں آتی تھی۔ پھر بھی بادل پوری احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ پٹھان کوٹ کے باغ سے نکل کر وہ لاری اڈے کی طرف جانے کی بجائے ایک تنگ اور ویران سی سڑک کی طرف چل پڑا۔ اس سڑک پر کوئی دکان وغیرہ نہیں تھی۔ یہاں بھی کوٹھیوں کے عقبی حصے تھے۔ ایک آدمی ریڑھے پر بیٹھا چلا آ رہا تھا۔ جب وہ بادل کے قریب سے گزرا تو اس نے بادل سے وقت پوچھا۔ بادل نے کہا: "گھڑی نہیں ہے میرے پاس۔" ریڑھے والا رام رام کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

چند قدم چلنے کے بعد بادل نے پیچھے مڑ کر دیکھا ریڑھا سڑک کا موڑ گھوم چکا تھا۔ بادل آگے جا کر دوسری سڑک پر آ گیا اور تیز تیز چلنے لگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نجمی اور بادل لاری اڈے کی طرف چلنے لگے۔ بادل نے مڑکر دیکھا نجمی بھی بڑی بے نیازی سے دوسری طرف دیکھنے لگی۔ بادل نے باہر ایک دکان سے پکوڑے خرید لیے تھے۔

پکوڑوں والا لفافہ نجمی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے وہ خاموشی سے اس کے پاس بیٹھ گیا اور دھیمی آواز میں بولا "ختم کر دیا ہے اُسے۔"

نجمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی تھی۔ وہ خود اس خفیہ پولیس والے کی وجہ سے پریشان تھی۔ کیونکہ اس مرحلے پر اگر پولیس بادل اور نجمی کو گرفتار کر لیتی ہے تو پھر ان دونوں کے سامنے بے پناہ مسائل کھڑے ہو سکتے تھے اور شاید اس بار پولیس بھی انھیں کسی بہانے ہلاک کر ڈالتی۔ نجمی نے لفافہ کھول کر پکوڑوں کو دیکھا اور آہستہ سے کہا "لاری کس وقت چلے گی؟"

بادل نے اڈے کی اس جانب دیکھا جہاں ایک لاری مسافروں سے بھر چکی تھی یہ لاری جموں نہیں جا رہی تھی۔ بادل آہستہ سے اٹھا اور لاری کی طرف چلا۔ نجمی نے چادر سے سر کو اس طرح ڈھانپ رکھا تھا کہ اس کا آدھا چہرہ بھی ساتھ ہی چھپ گیا۔ وہ روشن چمکیلی اور تیز نگاہوں سے فضا کا جائزہ لینے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ یہاں سے کچھ فاصلے پر اس ہندو کی لاش پڑی ہے جسے بادل قتل کر آیا ہے۔ اگرچہ اسے یقین تھا کہ بادل نے لاش کو بڑی احتیاط سے ٹھکانے لگایا ہوگا۔ اس کے باوجود کوئی اتفاق بھی ہو سکتا تھا جائے قتل سے کوئی آدمی بادل کے پیچھے بھی لگ سکتا تھا۔ بادل لاری کے پاس ایک سکھ سے باتیں کر رہا تھا۔

واپس آکر بادل نے نجمی کو بتایا کہ جموں کو جانے والی لاری اس کے بعد ایک گھنٹے بعد چلے گی۔ نجمی نے سر پہ چادر ٹھیک کرنے کے بہانے پیچھے نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا "ہم کسی دوسرے اڈے سے لاری نہیں پکڑ سکتے بادل؟"

بادل نے پکوڑوں کا لفافہ نجمی کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔ وہ بڑے سکون سے پکوڑے کھا رہا تھا کہنے لگا "اس کو میں نے بدرو کی کیچڑ میں دبا دیا ہے۔ دو گھنٹے تک لاش اوپر نہیں آئے گی۔ مجھے کسی دوسرے لاری اڈے کا علم بھی نہیں۔"

ایک پھولی ہوئی توند والا کانسٹیبل ہاتھ میں چھڑی لیے بادل اور نجمی کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ بادل کے ہاتھ میں پکوڑا ویسے ہی پکڑے کا پکڑا رہ گیا۔ مگر اس نے اپنے حواس بحال رکھے اور دھیمی آواز میں نجمی سے کہا "تم فائر مت کرنا۔"

بادل نے لفافہ پھینک کر چادر سے ہاتھ پونچھنے کے بہانے ہاتھ چادر کے اندر پستول پر جما لیا۔ موٹی توند والا کانسٹیبل بادل کے قریب سے گزر گیا اور دو قدم پر رک کر بنچ پر بیٹھی ہوئی ایک ہندو عورت سے کہنے لگا "راجو! یہاں کب تک بیٹھی رہو گی۔ میرے ساتھ چلو میں تمھیں پولیس کی گاڑی پر ساما لیے چلتا ہوں۔"

اور وہ ہندو عورت اپنی پوٹلی سنبھال کر اٹھی اور کانسٹیبل کے ساتھ دوسری طرف نکل گئی۔ بادل نے اپنا ہاتھ پستول سے الگ کر لیا۔ نجمی نے قریب ہو کر پوچھا "میں نے فائر کی آواز نہیں سنی تھی۔" بادل کی نگاہیں ہندو کانسٹیبل کا تعاقب کر رہی تھیں۔ کہنے لگا "میں نے اس کا منکا توڑا تھا۔ اس کانسٹیبل نے ایک بار تو مجھے ہلا دیا تھا۔"

نجمی کہنے لگی "یہاں زیادہ دیر بیٹھے رہنا مناسب نہیں ہے۔"

بادل نے کہا "میرا خیال ہے جو لاری جموں جائے گی اسی میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ میں ابھی پتہ کر کے آتا ہوں۔"

بادل اٹھ کر لاری اڈے کے سکھ منیجر کے پاس گیا۔ اُسے کہا کہ میری بیوی کے بچہ ہونے والا ہے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اسے اس لاری میں بٹھا دوں جو تھوڑی دیر بعد جموں جائے گی۔ سکھ منیجر نے سر سے پاؤں تک بادل کو ایک نظر دیکھا اور ایک طرف اشارہ کر کے بولا "وہ سامنے پیپل کے نیچے لاری کھڑی ہے اس میں اپنی تیمنی کو جا کر بٹھا دو۔"

بادل نے ہاتھ باندھ کر دھنوار کہا اور نجمی کے پاس آکر بولا "آؤ لاری میں چل کر بیٹھتے ہیں۔"

جموں جانے والی لاری ایک طرف ہٹ کر پیپل کے درخت کے تلے کھڑی تھی اور دو ہندو لڑکے اس کے ٹائروں پر پانی ڈال کر دھو رہے تھے۔ بادل نجمی کو لے کر لاری کی طرف بڑھا تو سکھ منیجر نے پیچھے سے ان لڑکوں کو آواز دی "اوئے! ایہ لالے تے لالی نو بیٹھن دیو۔" دونوں لڑکوں کے ہاتھ وہیں رک گئے۔ انھوں نے ایک نظر بادل اور نجمی کو دیکھا۔ نجمی کا ہاتھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بادل نے تھام رکھا تھا اور وہ جان بوجھ کر آہستہ آہستہ چل رہی تھی جیسے بیمار ہو۔ ایک لڑکے نے آگے بڑھ کر لاری کا دروازہ کھول دیا۔ لاری کے اندر بیٹھ کر نجمی کو کچھ اطمینان ہوا۔ آہستہ سے کہنے لگی "وہاں ہم کھلی جگہ پر پڑے تھے۔"

بادل بھی نجمی کے ساتھ ہی بیٹھ گیا پھر نیچے اتر کر وہ اس کے لیے سوڈا واٹر کی بوتل لے آیا۔ نجمی کہنے لگی "ہماری تصویریں پولیس نے اخباروں میں ضرور چھپوا دی ہوں گی۔ جموں بڑا شہر ہے وہاں ہمیں بڑی احتیاط سے کام لینا ہو گا۔"

بادل نے کہا "اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔" دس بارہ کو مار کر مروں گا۔"

نجمی بوتل پینے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ایک سکھ ڈرائیور جھومتا جھامتا مونچھوں کو ایک ہاتھ سے مروڑتا کلینر لونڈوں کو گالیاں بکتا لاری کی طرف بڑھا۔ گھور کر نجمی اور بادل کی طرف دیکھا اور لڑکوں سے پوچھا "اوئے! ایناں نوں کنے اندر واڑ یا اے۔"

بادل نے فوراً عاجزانہ انداز میں کہا "میری پتنی بیمار ہے سردار جی! مینجر صاحب نے ہمیں اندر بٹھایا ہے۔"

سکھ ڈرائیور نے لاری اڈے کے مینجر کو زیر زبان ایک گندی گالی دی اور اگلی سیٹ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے غرایا "اوئے! اگوں ہٹ جاؤ اوئے۔"

لاری دھونے والے لڑکے فوراً آگے سے ایک طرف ہٹ گئے۔ سکھ ڈرائیور لاری کو پیپل کے نیچے سے نکال کر اڈے کی چھت کے نیچے لے آیا جہاں پہلے سے کئی سواریاں سامان لیے تیار کھڑی تھیں سکھ ڈرائیور نے کلینر کو آواز دے کر کہا "اوئے گوپالے! ٹائم راڈ چیک کر لئیں اوئے۔"

لاری دیکھتے دیکھتے بھر گئی۔ اوپر سامان لاد کر رسوں سے باندھا جانے لگا سامان کے اوپر ترپالیں بھی ڈال دی گئی تھیں۔ بادل اور نجمی اپنی اپنی جگہوں پر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ نجمی کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ سکھ مینجر سکھ ڈرائیور کو کاغذ کاپی میں سے کاٹ کر دے رہا تھا۔ کاغذ صدری میں ڈالتے ہوئے سکھ ڈرائیور مونچھوں کو مروڑتے لاری کی طرف آیا۔ سیٹ پر چڑھتے ہوئے اس نے کلینر کو گالی دے کر پوچھا سب کے ٹکٹ چیک کر لیے ہیں؟ کلینر گوپال ایک دبلا پتلا لڑکا سا تھا۔ لاری کے پچھلے دروازے سے اس نے آواز لگائی "ٹھیک ہے استاد جی۔"

پھر اس نے زور سے لاری کی باڈی پر ہاتھ مارا "چلو استاد جی رام بھروسے۔"

سکھ ڈرائیور نے لاری اسٹارٹ کر دی۔ لاری پٹھان کوٹ شہر کے گنجان بازاروں میں سے نکل کر کٹھوعا روڈ پر آئی تو نجمی اور بادل نے اطمینان کا سانس لیا۔

کھلی نیم پہاڑی سڑک پر آتے ہی لاری کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ لاری چلتی چلی گئی تھی کبھی کھلی وادی آ جاتی کبھی دونوں طرف ویران ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ پٹھان کوٹ کی پہاڑیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔ پھر سہ پہر کے وقت کٹھوعا کا علاقہ شروع ہو گیا۔ کٹھوعا لاری اڈے پر بھی نجمی اور بادل پوری طرح چوکس رہے۔ یہاں سے لاری نکلی تو سامبا جا کر رکی۔ یہ سارا علاقہ خالص پہاڑی علاقہ نہیں تھا بلکہ نیم میدانی اور نیم پہاڑی علاقہ تھا اور یہاں سردی بھی واجبی سی تھی۔ بس گرمی نہیں تھی۔

سورج غروب ہو رہا تھا کہ دور سے جموں توی کے پہاڑ تیزی سے قریب آنے لگے اب لاری اونچے نیچے ٹیلوں کے ارد گرد سے گھوم کر آگے بڑھ رہی تھی۔ جموں پہنچتے پہنچتے گھروں، دکانوں اور سڑکوں کی روشنیاں جلنے لگی تھیں۔ جموں کا لاری اڈہ پٹھان کوٹ سے زیادہ بڑا تھا اور یہاں رش بھی زیادہ تھا کیونکہ یہاں سے آگے کشمیر کو لاری جاتی تھی۔

سیزن شروع ہو چکا تھا جس کی وجہ سے وہاں کافی سواریاں موجود تھیں۔ پولیس کے دو چار سپاہی بھی ادھر ادھر منڈلا رہے تھے۔ بادل نے نجمی کو ساتھ لیا اور پیدل ہی اپنے دوست لال دین کے محلے کی طرف چل پڑا۔ بادل جموں شہر کے سارے علاقوں سے واقف تھا۔ نجمی نے کہا "کوئی سواری کر لیتے ہیں۔"

بادل بولا "میں شارٹ کٹ سے لے جاؤں گا۔ سواری کی تو وہ لوگوں سے بھرے ہوئے بازاروں سے گزرے گی۔"

بادل پرانی منڈی کے پہلو سے گزر کر دریائے توی کے پل کی طرف چلنے لگا۔ اب شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ جموں کے خوبصورت اور گنجان شہر کی روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔ پرانی منڈی سے کچھ فاصلے پر بادل رگھوناتھ مندر کے عقب سے ہو کر اس خالی سڑک پر آ گیا جس نے آگے جا کر محلہ استاداں کو جانے والی سڑک پر مل جانا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد جموں میں مسلمانوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بڑا قتلِ عام ہوا تھا۔ ہزاروں مسلمان شہید ہو گئے تھے۔ محلہ استاداں جموں کا وہ محلہ ہے جہاں سن سنتالیس کے مسلم کش فسادات میں بچے، کچے مسلمان کسی نہ کسی طرح یہیں رہ گئے تھے۔ یہاں ایک کشادہ بازار ہے اور پرانی جامع مسجد بھی ہے۔ بادل کا پرانا دوست لال دین جو کبھی بھوپال میں اس کے ساتھ زندگی کے کچھ دن گزار چکا تھا اسی محلے استاداں میں ہی رہتا تھا۔ بادل نجمی کو لے کر اسی کے پاس جا رہا تھا۔ بادل کا خیال تھا کہ ہو سکتا ہے لال دین بارڈر کراس کروانے میں اس کی کوئی مدد کر سکے۔ کیونکہ ایک بار جموں سے لال دین اس کے پاس بھوپال آیا تھا اور اس نے باتوں ہی باتوں میں بادل سے کہا تھا کہ وہ جموں کشمیر کے بارڈر پر کچھ اسمگلروں کے ساتھ مل کر چیزیں اِدھر اُدھر پہنچانے کا کاروبار کرتا ہے۔ دو تین بار بادل جموں آ کر لال دین سے مل بھی چکا تھا۔

یہاں ایک خالی سائیکل رکشا گزرتا دیکھ کر بادل نے اسے آواز دے کر روک لیا وہ دونوں رکشے میں بیٹھ گئے۔ رات ہونے کی وجہ سے موسم ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ دور دریائے توی کے پل کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ محلہ استاداں والی سڑک پر پہنچ کر بادل نے رکشا رکوا لیا۔ یہاں سے وہ نجمی کو لے کر پیدل ہی بڑے بازار میں داخل ہو گیا۔ بائیں جانب ایک گلی دو تین گلیوں میں سے ہو کر لال دین کے مکان کو جاتی تھی۔ لال دین نے شادی نہیں کی تھی اور وہ اکیلا ہی تھوڑا بہت کاروبار کر کے زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ محلہ استاداں کی گلیوں کے مکانوں میں کہیں اندھیرا تھا اور کہیں روشنی نظر آ جاتی تھی۔ گلیاں بھی کہیں اندھیری تھیں اور کہیں کھمبوں پر بلب جل رہے تھے۔ بادل ان تمام راستوں سے واقف تھا۔ وہ لال دین کے مکان کے سامنے آ کر رک گیا۔

نجمی نے منہ کے آگے سے چادر ہٹا کر پوچھا "کیا یہی تمہارے دوست کا مکان ہے؟"

"ہاں۔"

مکان کا دروازہ بند تھا۔ دوسری منزل کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ بادل نے آہستہ سے مکان کے بند دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد اوپر والے کمرے کی کھڑکی کھلی۔

لال دین نے نیچے جھانک کر پوچھا "کون؟"

بادل نے منہ اوپر کر کے آہستہ سے کہا "نیچے آؤ تو بتاؤں یار۔"

لال دین نے بادل کی آواز پہچان لی تھی۔ جلدی سے نیچے آ کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ بادل کو دیکھتے ہی وہ اس کے گلے لگ کر ملا۔ ساتھ ایک عورت کو دیکھا تو جلدی سے انھیں اندر آنے کو کہا۔ اوپر والی منزل کے چھوٹے سے کمرے میں دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ کونے میں صندوق رکھا تھا۔ زمین پر ایک طرف دری بچھی تھی اور دو بڑے تکیے دیوار کے ساتھ لگے تھے۔ لال دین نے نجمی اور بادل کو چارپائیوں پر بٹھایا اور نجمی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "بھابی! یہ میرا بڑا دوست ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہی نہیں اور چپکے چپکے شادی بھی کر لی۔"

یہاں نجمی کی جگہ کوئی دوسری عورت ہوتی تو وہ شرما کر منہ دوسری طرف کر لیتی مگر نجمی ان باتوں سے اب بہت دور ہو چکی تھی۔ اس نے لال دین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے گھورتے ہوئے کہا "میں بادل کی بیوی نہیں ہوں۔"

لال دین چپ سا ہو گیا فوراً نجمی سے معافی مانگنے لگا۔

پھر بولا "تم بیٹھو میں تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرتا ہوں۔ تم تو جانتے ہو کہ میں چھڑا ہوں۔ تم فکر بالکل نہ کرو۔ ابھی بازار سے سب کچھ آ جاتا ہے۔"

لال دین تھیلا لے کر نیچے اُتر گیا۔ بادل نے نجمی سے معذرت کے انداز میں کہا "لال دین نے ناسمجھی میں ایسا کہہ دیا تھا۔ تم اس کی بات کا برا نہ ماننا ویسے یہ دل کا بڑا اچھا ہے میرا دوست۔"

نجمی نے اس بات کا بادل کو کوئی جواب نہ دیا وہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی کہنے لگی "مجھے نہیں لگتا کہ یہ شخص مجھے بارڈر کراس کروا سکے گا۔ یہ شکل سے شریف اور گھامڑ لگتا ہے۔"

بادل مسکراتے ہوئے بولا "شریف اور گھامڑ ضرور ہے لیکن اس کے اسمگلروں کے ساتھ پرانے تعلقات ہیں۔"

نجمی نے بوسیدہ مکان کے اس پرانے کمرے کو چاروں طرف سے دیکھتے ہوئے کہا "اگرچہ یہ مسلمانوں کا علاقہ ہے لیکن ہمیں یہاں زیادہ دیر تک نہیں رہنا چاہیے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہاں ہماری کوئی مخبری نہ کر دے۔"

بادل نے پستول نکال کر سامنے رکھ لیا اور نجمی سے کہا "تم بھی اپنا پستول مجھے دیدو اور وہ سامنے غسل خانہ ہے جا کر منہ ہاتھ دھو لو۔ پھر میں بھی منہ ہاتھ دھو لوں گا۔ بہر حال میں آج

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رات لال دین سے بات کروں گا۔ کل تک معاملہ سامنے آجائے گا میرا خیال ہے ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رہیں گے ۔"

نجمی نے کپڑوں کے اندر سے پستول نکال کر بادل کو دے دیا۔ بادل نے دونوں پستول سرہانے کے نیچے چھپا دیئے۔ نجمی غسلخانے میں چلی گئی۔ نیچے گلی میں خاموشی تھی۔ تھوڑی دیر بعد لال دین کچھ کباب کچھ مچھلی اور نان وغیرہ لے کر آگیا کہنے لگا۔ "چائے ہم خود بنا لیں گے ۔"

جب اس نے دیکھا کہ نجمی وہاں نہیں تو بادل کے قریب ہو کر بولا "یار مجھ سے بڑی بھول ہو گئی مگر یہ عورت کون ہے؟ بڑی منہ پھٹ عورت ہے ۔"

بادل نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے آہستہ سے کہا "اس کا نام نجمی ہے۔ بنگال والی چنداڈکیت کا نام تم نے کبھی نہیں سنا؟"

لال دین کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا "تو یہ چنداڈکیت ہے ؟"

"ہاں" بادل نے جواب دیا۔ اب تم کیا سوچتے ہو؟ کیا میں اسے لے کر یہاں سے چلا جاؤں"

لال دین نے بادل کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا "یار! ہم تیرے یار ہیں۔ تیرے لیے جان بھی حاضر ہے۔ خدا کی قسم تو سارے شہر کے ہندوؤں کو قتل کر کے میرے پاس آجا۔ کوئی تیری طرف دیکھے تو سہی ۔"

بادل نے موقع غنیمت جان کر کہا "لال دین! میں تیرے پاس ایک خاص مقصد لے کر آیا ہوں ۔"

"کہو! میں حاضر ہوں۔ اگر کوئی خدمت کر سکا تو مجھے دلی خوشی ہوگی ۔"

بادل نے مختصر لفظوں میں لال دین کو ساری کہانی بیان کر دی اور پھر کہا "اب وہ بارڈر کراس کر کے واپس پاکستان جانا چاہتی ہے۔ تم بتاؤ کہ تم اس معاملے میں ہماری کیا مدد کر سکتے ہو ۔؟"

لال دین سوچ میں پڑ گیا کہنے لگا "اصل میں بات یہ ہے کہ جن اسمگلروں سے میرے تعلقات تھے اب وہ مجھ سے کافی دور ہو گئے ہیں۔ میں نے عرصہ ہوا یہ دھندا چھوڑ رکھا ہے اور یہاں شہر میں چھوٹی موٹی دکانداری کر کے عزت کی روٹی کما رہا ہوں۔ ویسے بھی جموں کی پولیس مسلمانوں کو جینے نہیں دیتی پہلے کچھ اور بات تھی۔ لیکن تم فکر نہ کرو میں کل ہی اپنے ایک اسمگلر دوست

کے پاس جاتا ہوں مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور ہماری مدد کرے گا ۔"

نجمی غسل خانے سے باہر آئی تو بادل نے اندر جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ لال دین پر نجمی کا بے حد رعب پڑ چکا تھا۔ کن انکھیوں سے اسے بالوں میں کنگھی کرتے دیکھ رہا تھا کہ یہ ہے بنگال کی شیرنی چنداڈاکو۔ جس کا نام سن کر بنگال کی پولیس پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ نجمی کارنس پر رکھے شیشے کے سامنے کھڑی بالکل آدمیوں کی طرح جلدی جلدی اپنے کٹے ہوئے بالوں میں کنگھی چلا رہی تھی۔ اس نے کوئی میک اپ بھی نہیں کیا۔ تولیے سے منہ پونچھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ لال دین نے کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ کہا "بہن جی! میں غریب آدمی ہوں آپ کی پوری طرح سے خدمت نہیں کر سکوں گا۔ بازار سے جو کچھ مل گیا ہے لے آیا ہوں ۔"

نجمی نے لفافہ کھولتے ہوئے کہا "یہ تو نان کباب اور مچھلی ہے مجھے یہ بہت پسند ہے۔ آپ کا شکریہ ہماری وجہ سے آپ کو تکلیف ہو رہی ہے ۔"

لال دین فوراً بچھ سا گیا "چندا بہن! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں میں تو....."

نجمی نے چونک کر لال دین کی طرف دیکھا "آپ کو کس نے کہا کہ میرا نام چندا ہے ؟"

اب تو لال دین گھبرا گیا کہ کہیں یہ عورت بادل اور اس پر بھی نہ برس پڑے ۔

فوراً ہاتھ باندھ کر بولا "معافی چاہتا ہوں بہن جی! مجھے میرے دوست بادل نے آپ کا نام بتایا ہے۔ اصل میں وہ آپ کا تعارف کروا رہا تھا ۔"

نجمی سمجھ گئی کہ بادل نے اسے بتایا ہوگا کہ مجھے کیوں غیر قانونی بارڈر کراس کرنا پڑ رہا ہے۔ نجمی نے ہاتھ ذرا سا اٹھا کر کہا "کوئی بات نہیں بھائی صاحب سب ٹھیک ہے۔ ویسے آپ مجھے چندا کی بجائے نجمی کہہ کر پکاریں تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی اور ہاں یہ ہندوؤں کی طرح ہاتھ نہ جوڑا کریں آپ مسلمان ہیں اور مسلمان کسی انسان کے آگے ہاتھ نہیں جوڑا کرتے ۔"

لال دین شرمسار سا ہو کر بولا "بہن جی! معافی چاہتا ہوں۔ یہاں جموں کے ہندوؤں کے گروہ میں رہ کر عادت پڑ گئی ہے ۔"

نجمی نے کہا "اسی لیے تو قائداعظم نے پاکستان کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ ان کے مذہب رہن سہن ہر شے الگ ہے یہ کبھی ایک ساتھ نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہ سکتے۔"

لال دین نے حسرت سے کہا "خوش قسمت ہیں بہن جی! وہ مسلمان جو اسلامی ملک پاکستان میں رہ رہے ہیں یہاں تو ہمیں ہندوؤں کا غلام بن کر رہنا پڑ رہا ہے۔ ہندو مسجدوں کے آگے باجا بجاتے گزرتے ہیں اور ہم انھیں منع نہیں کر سکتے۔ ہمارے مسلمان بچوں کو زبردستی ہندووانی تہذیب سکھائی جا رہی ہے۔ جموں میں تو کشمیر کی وجہ سے پھر بھی اردو پڑھنے کی سہولت ہے لیکن باقی ہندوستان میں تو ہر مسلمان بچے کو لازمی طور پر ہندی پڑھنی پڑتی ہے ورنہ تو کہیں نوکری نہیں ملتی۔"

نجمی نے کہا "میں جانتی ہوں دلی جو اردو کا گھر تھا وہاں کے مسلمانوں کی حالت بھی کسی سے چھپی نہیں۔ کلکتہ مدارس کے مسلمانوں کے بارے میں بات کرنی ہی بیکار ہے۔"

اتنے میں بادل غسل خانے سے باہر آ گیا انھوں نے مل کر کھانا کھایا۔ رات کو نجمی الگ کمرے میں سو گئی۔ بادل اور لال دین بیٹھک میں آ گئے۔ لال دین اپنے پرانے دوست اسمگلر سے ملنے چلا گیا۔ کوئی دو گھنٹے بعد واپس آیا اس کے چہرے سے مایوسی ٹپک رہی تھی۔ بادل اس کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ "کیوں لال دین کیا ہوا؟"

لال دین سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گیا اور بولا "بات نہیں بنی بادل خان! بارڈر پر فوج گشت کر رہی ہے۔ وندیا رام اسمگلر کا کہنا ہے کہ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب بارڈر پر تناؤ ختم ہو گا۔"

بادل خان بھی چپ ہو گیا۔ جانتا تھا کہ وہ نجمی کو لے کر لال دین کے پاس زیادہ دن نہیں ٹھہر سکتا۔ اس کا خیال تھا کہ لال دین اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے دو ایک دن میں نجمی کو بارڈر کراس کروا دے گا اور کہانی کا انجام بخیر و خوبی وقوع پذیر ہو جائیگا۔ لیکن یہاں معاملہ ٹھیک نہیں تھا بادل نے دونوں پستول لال دین کے حوالے کر دیئے تھے جو اس نے لکڑی کے پرانے صندوق میں چھپا دیئے تھے۔ بادل نے پوچھا کہ "کیا کوئی دوسرا ایسا آدمی نہیں جو تمھارا واقف ہو اور جو اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکے۔؟"

لال دین کھیس اپنے اوپر کھینچتے ہوئے بولا "بادل خان! میں سوائے اپنے پرانے ساتھی وریام سنگھ کے دوسرے کسی اسمگلر پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ یہاں کسی اسمگلر کو یہ بتانا بڑی خطرناک بات ہے

کہ میں کسی لڑکی کو پاکستان پہنچانا چاہتا ہوں۔ جموں میں پولیس مسلمانوں کے بارے میں بڑی محتاط ہے۔ کسی پر ذرا سا بھی شبہ ہو جائے تو اسے پولیس پوچھ گچھ کے لیے پکڑ کر لے جاتی ہے اور پھر اس کی کوئی خبر نہیں ملتی۔"

بادل خاموش ہو گیا پھر بولا "ایسی صورت میں تم کیا مشورہ دیتے ہو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں یہاں تمھارے پاس بھی زیادہ دیر تک چھپا نہیں رہ سکتا۔ پولیس ہم دونوں کی تلاش میں ہے اور نجمی کی تو تصویریں بھی اخباروں میں چھپ چکی ہیں۔ محلے کی کسی عورت نے نجمی کو دیکھ کر پہچان لیا تو تم پر بھی مصیبت ٹوٹ پڑے گی۔"

لال دین کہنے لگا "تم میری بات نہ کرو میں تم پر اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔"

بادل بولا "لیکن میں تمھیں یوں ہی اپنے اوپر قربان ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

دونوں خاموش ہو گئے۔ دونوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ بادل نے لال دین سے پوچھا۔ "تم مجھے کیا مشورہ دیتے ہو؟ میرا تو خیال ہے کہ بہتر یہی ہے کہ میں نجمی کو لے کر واپس اپنے گوماہ والے جنگل میں چلا جاؤں۔ کم از کم وہاں ہم پولیس سے محفوظ ہوں گے۔ ایک دو ماہ بعد میں پھر تمھارے پاس آ کر پتہ کر جاؤں گا۔ اگر حالات ٹھیک ہو گئے تو نجمی کو بھی لے آؤں گا۔"

لال دین بولا "میرا خیال ہے ان حالات میں تمھارے لیے یہی بہتر رہے گا کیونکہ یہاں کچھ ایسے مسلمان بھی رہتے ہیں جن کے بارے میں مجھے شک ہے کہ وہ پولیس کے مخبر ہیں۔ دو ایک دن کی بات ہوتی تو میں تمھیں چھپا سکتا تھا لیکن اب معاملہ لمبا ہے اور تمھیں اور نجمی کو یہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ مجھے یہاں کے مشکوک لوگوں سے خطرہ ہے۔"

بادل نے کہا "گھبراؤ نہیں لال دین! آج کی رات تو کسی طرح گزار لیتے ہیں کل رات کو نجمی کو لے کر میں یہاں سے واپس نکل جاؤں گا۔"

لال دین نے کہا "اگر پیسوں کی ضرورت ہو تو پیش کر سکتا ہوں۔"

بادل نے کہا "پیسے تمھاری دعا سے ہمارے پاس بہت ہیں۔ اچھا کل بات کریں گے مجھے نیند آ رہی ہے۔"

لال دین چارپائی پر لیٹتے ہوئے بولا "سو جاؤ دوست سفر کے تھکے ہوئے ہو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور تھوڑی دیر بعد دونوں گہری نیند سو رہے تھے۔ دوسرے دن بادل اور نجمی کافی دیر سے اٹھے
لال دین بازار سے ان کے لیے ڈبل روٹی اور مکھن لینے گیا ہوا تھا۔ لال دین بیکری میں ہی چیزیں
لفافے میں ڈلوا رہا تھا کہ غلام احمد زرگر نے قریب آکر پوچھا "کیوں لال دین کیا بات ہے باہر سے
مہمان آگئے ہیں کیا۔ رات بھی تم ۔۔ نان کباب اور مچھلی بازار سے لے کر گئے تھے۔"

لال دین کچھ پریشان سا ہو گیا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ غلام احمد زرگر کے جموں کی خفیہ پولیس
سے تعلقات ہیں۔ لال دین نے اس پریشانی کو اپنے چہرے سے ظاہر نہ ہونے دیا اور مسکرا کر
بولا "ارے بھائی میرا ایک رشتے دار کٹھوعا سے آگیا تھا رات کو اب ناشتہ کرکے چلا جائے گا تم
سناؤ تمہارا کیا حال ہے؟"

غلام احمد بڑی معنی خیز نگاہوں سے لال دین کی طرف دیکھ رہا تھا کہنے لگا "بس لال دین تمہاری
دعا سے ٹھیک ٹھاک ہوں اچھا چلتا ہوں۔"

اور وہ بیکری سے باہر چلا گیا۔ لال دین کا ماتھا ٹھنکا۔ غلام احمد زرگر کا چہرہ بتا رہا تھا کہ
اسے لال دین کی بات کا اعتبار نہیں آیا۔ لال دین ناشتے کا سامان لے کر واپس اپنے مکان پر آگیا
اس نے بادل اور نجمی سے کوئی بات کرنا مناسب نہ خیال کیا۔ ناشتے کے بعد لال دین نے کہا "بادل
خاں! تم اور نجمی اوپر والے کمرے میں ہی رہنا۔ کوئی بھی آئے اوپر سے آواز مت دینا۔ میں مکان
پر تالا لگا کر تھوڑی دیر کے لیے جا رہا ہوں۔"

لال دین مکان کو تالا لگا کر چلا گیا۔ بادل اور نجمی دوسری منزل والے کمرے میں بیٹھے باتیں کر
رہے تھے۔ بادل نے نجمی کو بتا دیا تھا کہ لال دین ابھی بارڈر کراس نہیں کروا سکتا اور ہمارے لیے
یہی بہتر ہے کہ ہم مہینے دو مہینے کے لیے واپس اپنے جنگل والے ٹھکانے پر چلے جائیں۔"
نجمی نے کہا "ٹھیک ہے مجبوری ہے یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔"

دوپہر کے وقت لال دین بھی آگیا۔ وہ بازار سے مچھلی کباب وغیرہ ساتھ لایا تھا۔ گلی میں اسے
ایک بار پھر غلام احمد زرگر مل گیا وہ معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا بولا۔
"تمہارا مہمان تمہارا بڑا خرچہ کرا رہا ہے لال دین۔ کہو تو میں کھانا بھجوا دیا کروں؟"
لال دین کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ خاموش رہا۔ شام ہو چکی تھی۔ گلی میں ہلکا ہلکا رات کا اندھیرا

اترنے لگا تھا کہ لال دین گھبرایا ہوا مکان کا تالا کھول کر اوپر آیا اور بولا۔
"جلدی سے میرے ساتھ آؤ پولیس کو تمہاری خبر ہو گئی ہے جلدی کرو۔"
بادل اور نجمی نے پستول اور روپے تھیلے میں ڈال کر ساتھ لیے اور لال دین کے پیچھے پیچھے
سیڑھیاں اتر کر گلی کے اندھیرے میں تیز تیز چلنے لگے۔ لال دین نے مکان پر تالا لگا دیا تھا۔ وہ
بازار کی طرف جانے کی بجائے دوسری طرف ایک اور گلی میں آگیا۔ یہ گلی ڈھلانی تھی آگے ایک
اور تنگ گلی آتی تھی ان گلیوں سے گزرتا لال دین بادل اور نجمی کو لے کر دریائے توی کے پل
کی طرف آگیا۔ پل کی روشنیاں جل رہی تھیں۔

یہاں آکر لال دین نے بادل اور نجمی کو بتایا کہ غلام احمد زرگر نے مخبری کر دی ہے۔ ہو سکتا ہے
اب تک پولیس میرے مکان پر پہنچ گئی ہو۔ مگر تم فکر نہ کرو۔ وہاں تمہاری موجودگی کا کوئی ثبوت
نہیں ہے۔ میں واپس جاکر پولیس کو سنبھال لوں گا۔"

بادل نے پوچھا "اب وہ ہمیں کہاں لے جا رہا ہے؟"

لال دین نے دریائے توی کے دوسرے کنارے والے سنگتروں کے گھنے باغوں کی طرف اشارہ
کر کے کہا۔

"دریا پار کے سنگتروں کے باغ میں ایک جگہ ہے وہاں تم محفوظ ہو گے۔ ابھی تو وہاں رہو
بعد میں دیکھا جائے گا۔"

اور وہ تینوں دریا کے پل پر سے گزرنے لگے۔

-- -- ❖ -- --

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جموں شہر کے رہنے والوں کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ دریائے توی کے شمال کی جانب دوسرے کنارے پر آم اور سنگتروں کے گھنے باغ ہیں ان کے پیچھے پہاڑیوں کی ڈھال میں جگہ جگہ بڑے بڑے کھوہ یعنی گہرے شگاف بنے ہوئے ہیں یہ قدرتی کھوہ ہیں اور ان کو وہاں کی مقامی زبان میں پیر کھوہ کہتے ہیں۔ لال دین نے بادل خان اور نجمی کو ساتھ لے کر دریائے توی پار کیا اور آم سنگتروں کے گھنے باغ میں سے ہوتا ہوا پہاڑیوں کے پیر کھوہ کے پاس آ کر رک گیا۔ شام کا اندھیرا کافی گہرا ہو گیا تھا۔ لال دین نے بادل سے کہا "تم لوگ اس پہاڑی کھوہ میں کسی طرح رات گزار لو میں منہ اندھیرے آؤں گا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں اس اجاڑ جگہ پر کوئی نہیں آئے گا۔"

لال دین تیزی سے واپس چل دیا۔ بادل اور نجمی پہاڑی کھوہ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ پستول دونوں کے پاس موجود تھے۔

بادل کہنے لگا "ہماری مخبری ہو گئی ہے۔ لال دین نے تو کہا ہے کہ خطرے کی کوئی بات نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں ہر اعتبار سے چوکس رہنا چاہیئے۔ تم یہاں بیٹھو میں باہر پہرہ دیتا ہوں۔"

بادل کھوہ سے نکل کر باہر آ گیا یہاں اندھیرے میں پہاڑ کی ڈھلان پر جگہ جگہ جنگلی جھاڑیاں اگی تھیں۔ آگے جا کر آم کے گھنے باغ آ جاتے تھے۔ دور نیچے جموں شہر کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ بیچ میں دریائے توی بہہ رہا تھا جو دکھائی نہیں دیتا تھا صرف اس کے پل کی روشنیاں جھلملاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ بادل نے پستول نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا وہ کھوہ کے سامنے ایک جھاڑی کے پیچھے بیٹھ گیا۔

دوسری طرف لال دین جب اپنے مکان پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ مکان کا تالا توڑ کر پو

مکان کی تلاشی لے رہی ہے۔

لال دین کو دیکھتے ہی ہندو ڈوگرا تھانیدار نے گرجدار آواز میں کہا "وہ پاکستانی جاسوس کہاں ہیں جنھوں نے تمھارے پاس پناہ لے رکھی تھی۔"

لال دین نے ہاتھ باندھ لیے اور عاجزانہ لہجے میں کہا "مہاراج کسی نے آپ کو غلط اطلاع دی ہے میرے گھر تو کٹھوعہ سے رات ایک رشتے دار آیا تھا سویٹر اور پراندے خریدنے۔ ابھی ابھی وہ چلا گیا ہے میں اسے کٹھوعہ جانے والی لاری میں چڑھا کر آ رہا ہوں۔"

ہندو تھانیدار نے آگے بڑھ کر اتنی زور سے لال دین کے منہ پر تھپڑ مارا کہ وہ لڑھک کر گر پڑا اور اس کے ہونٹ کا ایک کنارہ پھٹ گیا اور خون بہنے لگا "حرامی جھوٹ بولتے ہو ہم تم سب غداروں سے واقف ہیں سیدھی طرح بتا دو کہ پاکستانی جاسوسوں کو تم نے کہاں چھپایا ہے ورنہ ہمیں راز اگلوانا آتا ہے بتاؤ۔"

لال دین اسی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑا تھا اور عاجزی سے کہنے لگا "مہاراج! یہ کسی نے میرے ساتھ دشمنی کی ہے۔ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا کہ کسی پاکستانی جاسوس کو پناہ دوں۔"

ہندو تھانیدار نے لال دین کو ایک اور تھپڑ مارا اور اپنے کانسٹیبل سے کہا "اسے تھانے لے چلو یہ ایسے نہیں بکے گا۔"

لال دین کے مکان سے پولیس کو بادل اور نجمی کی موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔ صرف اوپر والی کوٹھڑی میں ایک بستر بچھا تھا جس کے بارے میں لال دین نے یہی کہا کہ یہ اس نے اپنے کٹھوعہ والے رشتے دار کے لیئے بچھایا تھا۔ پولیس لال دین کو پکڑ کر تھانے لے گئی۔ اس کے مکان کو دوبارہ تالا لگا دیا گیا۔ ساری رات لال دین پر شدید تشدد ہوتا رہا۔ اسے لاتوں، گھونسوں اور جوتوں سے مارا گیا چھت سے الٹا لٹکایا بھی گیا۔

مگر ہر بار لال دین ہاتھ باندھ کر یہی کہتا "مہاراج! کسی نے میرے ساتھ دشمنی کی ہے میرے ہاں اگر کوئی پاکستانی جاسوس آتا تو میں خود تھانے آ کر اطلاع کر دیتا۔"

مگر ہندو تھانیدار کو ابھی تک لال دین کے بیان پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ لال دین پر ساری رات تشدد کا سلسلہ جاری رہا لیکن لال دین کی ہمت اور دلیری کی داد دینی پڑے گی کہ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے شدید درد اور تکلیف میں بھی بادل اور نجمی کا نام نہ لیا۔

پولیس کو بھی ابھی تک یہ علم نہیں تھا کہ اس کے ہاں جو لوگ ٹھہرے تھے ان میں ایک بادل ڈاکو تھا اور دوسری عورت بنگال کی مشہور ڈکیت اور قاتلہ چندا ڈاکو تھی۔ مخبر نے صرف یہی خبر دی تھی کہ لال دین کے گھر کوئی ایسا مہمان آیا ہے جس کو اس نے مکان کے اندر بند کر کے رکھا ہوا ہے اور اسے باہر نہیں نکلنے دیتا۔ مخبر نے یہ بھی خدشہ ظاہر کیا تھا کہ یہ دو مہمان ہیں اور یقینی طور پہ پاکستانی جاسوس ہیں جو بارڈر کراس کر کے وہاں پہنچے ہیں۔

جموں توی کے تھانے میں رات بھر لال دین پر تشدد ہوتا رہا۔ اس کی چیخوں کی آوازیں در و دیوار ہلاتی رہیں اور دوسری طرف بادل اور نجمی رات بھر توی دریا کے پار والے ویرانے میں جاگتے رہے۔ نجمی پہاڑی کی پیر کھوہ میں چھپی رہی اور بادل باہر جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھا پستول ہاتھ میں لیے پہرہ دیتا رہا۔ رات کے پچھلے پہر وہ نجمی کے پاس کھوہ کے اندر آ گیا۔ نجمی کی آنکھ لگ گئی تھی۔ بادل باہر آ گیا رات تیزی سے ڈھلنے لگی تھی۔ آسمان پہ سلیٹی رنگ کی دھندلی دھندلی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ اندھیرے میں سے جموں شہر کے مکانوں، گھنے باغ کے آم کے درختوں اور توی کے پل کا خاکہ ابھر رہا تھا۔ لال دین نے بادل سے کہا تھا کہ وہ رات کے پچھلے پہر آئے گا۔ رات کا پچھلا پہر بھی گزر گیا۔ پھر مشرقی پہاڑیوں کے عقب سے سورج کی سنہری کرنیں نمودار ہوئیں۔ بادل اب واپس کھوہ کے اندر چلا گیا تھا۔ نجمی جاگ پڑی تھی۔ بادل نے پہلے سے دیکھ لیا تھا کہ ایک چھوٹا سا پہاڑی نالہ قریب ہی پتھروں کے درمیان بہہ رہا ہے۔ بادل نے ہاتھ منہ دھو لیا تھا اور ٹھنڈا پانی بھی پیا تھا۔ اس نے نجمی سے کہا "نیچے پتھروں میں نالہ بہہ رہا ہے تم بھی وہاں جا کر منہ ہاتھ دھو لو۔"

نجمی بولی "تمہارا دوست ابھی تک نہیں آیا دن تو نکل آیا ہے۔"

بادل بولا "وہ نہیں آیا خدا خیر کرے کہیں پولیس اسے پکڑ کر نہ لے گئی ہو۔"

نجمی نے تشویش کے لہجے میں کہا "کہیں وہ بک تو نہیں پڑے گا۔"

بادل کہنے لگا "وہ مر جائے گا مگر ہمارا نام نہیں لے گا وہ نڈر آدمی ہے میں اس کو اچھی طرح جانتا ہوں۔"

نجمی نے کہا "ٹھیک ہے لیکن ہم یہاں کب تک چھپے رہیں گے اگر اسے پولیس پکڑ کر لے گئی

ہے تو وہ اسے نہیں چھوڑے گی۔ ظاہر ہے کسی نے یہی مخبری کی ہو گی کہ اس کے ہاں بادل اور چندا ڈکیت چھپے ہوئے ہیں۔"

بادل بولا "میرا خیال ہے پولیس کے مخبر کو ہمارا علم نہیں ہے اس نے یہی اطلاع دی ہو گی کہ لال دین کے ہاں پاکستانی جاسوس ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

نجمی نے کہا "یہ بھی بڑا سنگین الزام ہے۔ پولیس لال دین کو کم از کم ایک ہفتے تک اپنی حراست میں ضرور رکھے گی۔ مجھے خطرہ لگتا ہے بادل! اگر جسمانی اذیت سے گھبرا کر لال دین بک پڑا تو ہماری گرفتاری یقینی ہے۔ ہمیں یہاں سے کسی دوسری طرف نکل جانا چاہیئے تم تو اس شہر سے واقف ہو کیا ہم کسی اور جگہ جا کر نہیں چھپ سکتے؟"

بادل سوچنے لگا۔ پھر بولا "دوسری کوئی جگہ اوپر پہاڑیوں کا جنگل ہی ہو سکتا ہے۔"

نجمی نے پوچھا "کیا اوپر والے چیڑ کے جنگل میں دیہاتی لوگ نہیں رہتے؟"

بادل بولا "گوجروں اور گوالوں کے کچھ کچے پکے مکان ضرور ہیں مگر جنگل اتنا بڑا ہے کہ ہم وہاں کوئی محفوظ جگہ تلاش کر سکتے ہیں۔"

نجمی نے کہا "تو پھر ہمیں اوپر والے جنگل میں ہی چلے جانا چاہیئے۔ میں منہ ہاتھ دھو کر آتی ہوں۔ ہم ابھی یہاں سے نکل چلیں گے۔"

نجمی کھوہ میں سے نکل کر نیچے پہاڑی نالے کی طرف چلی گئی۔ بادل کا ذہن تیزی سے سوچنے لگا کہ کیا جنگل میں انھیں چھپنے کے لیے کوئی مناسب جگہ مل جائے گی۔ لیکن نجمی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ان کا وہاں رہنا کسی طرح سے بھی مناسب اور محفوظ نہیں تھا۔ لال دین لاکھ پکا اعتماد اور بھروسے کا آدمی سہی لیکن پولیس کے تشدد سے گھبرا کر وہ ہتھیار بھی ڈال سکتا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر بادل نے آخر اوپر والے جنگل میں ہی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جب نجمی چشمے سے واپس آئی تو بادل خان اسے ساتھ لے کر پہاڑیوں کی آڑ میں پہاڑی کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ چڑھائی زیادہ تکلیف دہ نہیں تھی وہ رک رک کر چڑھائی چڑھتے چلے گئے۔ جب وہ پہاڑ کی چوٹی والے چیڑ کے گھنے جنگل میں پہنچے تو نجمی بے دم سی ہو کر ایک جگہ لیٹ گئی اس چڑھائی نے اسے تھکا دیا تھا۔ جب ان کے سانس درست ہوئے تو نجمی نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور بولی "یہاں کوئی مکان وغیرہ نظر نہیں آ رہا"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بادل بولا "آگے مشرق کی طرف جائیں تو نیچے ڈھلوان پر کسانوں اور گوالوں کے چند ایک پتھریلے مکان ضرور ہیں مگر ہم اس طرف نہیں جائیں گے۔"

نجمی نے کہا "ہم ادھر نہیں جائیں گے لیکن وہ تو بھیڑ بکریاں چراتے ادھر آسکتے ہیں۔"

بادل بولا "تو پھر ہمیں پہاڑی کی جنوب کی طرف چھپنے کے لیے کوئی نہ کوئی جگہ تلاش کرنی ہوگی۔"

سورج کی روشنی اب پہاڑی کے اوپر چیڑ کے درختوں میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں سے نیچے جموں شہر کا سارا منظر نظر آرہا تھا۔ چیڑ کے درختوں کا یہ جنگل کافی گھنا تھا۔ اونچے اونچے درخت اوپر جاکر ایک دوسرے میں گھل مل گئے تھے۔ جنوب کی جانب ڈھلان پر کئی چٹانیں باہر کو ابھری ہوئی تھیں ان چٹانوں میں ایک جگہ چھوٹا سا چشمہ بہہ رہا تھا۔ یہ چشمہ درختوں اور پہاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ بادل نے آس پاس کسی محفوظ پناہ کی تلاش شروع کردی۔ بہت جلد انھیں چشمے کے پاس چٹان کے اندر چھوٹا سا غار نما شگاف مل گیا وہ اس کے اندر جاکر بیٹھ گئے

بادل کہنے لگا "یہاں ہمیں کھانے کو کچھ نہیں ملے گا پانی تو چشمہ پہ مل جائے گا۔" نجمی نے دور کی پہاڑیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم اس علاقے سے واقف ہو کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم ادھر کسی گاؤں سے کچھ کھانے کو لے آؤ۔"

نجمی کی تجویز معقول تھی۔ دن کافی چڑھ آیا تھا بہر حال یہ لوگ وہاں بھوکے نہیں رہ سکتے تھے۔ بادل نے اپنا پستول اور روپے نجمی کے پاس رکھے۔ صرف دس روپے کا نوٹ اپنے پاس رکھا اور بولا "میں کہیں سے کھانے کو کچھ لاتا ہوں۔ تم اسی جگہ بیٹھی رہنا۔"

بادل وہاں سے چلتا ہوا نیچے ایک پہاڑی پگڈنڈی پر آگیا یہاں اسے ایک جانب چھوٹا سا گاؤں نظر آیا وہ پگڈنڈی پر سے گزر کر گاؤں میں آگیا۔ یہ گاؤں ڈھلانی کھیتوں والے چند ایک دیہاتی مکانوں پر مشتمل تھا۔ ایک ٹیلے کی چوٹی پر چھوٹا سا مندر بنا ہوا تھا جس پہ مائی شیرانوالی کا پیلا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ گاؤں کا ایک ہی چھوٹا سا بازار تھا جس میں چار یا پانچ دکانیں تھیں یہاں ایک دکان پر سے بادل نے کچھ گڑ، تیل میں تلی ہوئی بڑی بڑی چھ سات مٹھیاں اور ڈھابے سے دس بارہ چھوٹی چھوٹی روٹیاں خریدیں اور جدھر سے آیا تھا ادھر ہی سے چلتا واپس نجمی کے پاس آگیا۔ انھوں نے گڑ کے ساتھ تھوڑی تھوڑی روٹی کھائی۔ باقی چادر میں لپیٹ کر ایک طرف رکھ

دیں۔ پہاڑی کے اوپر اس چیڑ کے جنگل میں خشک ہوا چل رہی تھی۔ دن کافی چڑھ آیا تھا۔ اب ایک طرف سے کچھ بکریاں نمودار ہوئیں ایک گوالن چھڑی لیے ان کے ساتھ تھی۔ یہ جموں کی دیہاتی گوالنوں والے لباس میں تھی۔ نجمی نے کہا "یہ ادھر تو نہیں آئے گی بادل؟"

بادل نے دیکھا گوالن وہاں سے کافی دور درختوں میں بکریوں کو آوازیں دیتی چل پھر رہی تھی کہنے لگا "میرا خیال ہے وہ ادھر نہیں آئے گی۔ بکریاں نیچے ڈھلانوں پہ ہی عام طور پر چرا کرتی ہیں۔"

اس غار میں بیٹھے بیٹھے انھیں سارا دن گزر گیا پھر دن کی روشنی کم ہونے لگی۔ سورج مغرب کی طرف پہاڑیوں کے عقب میں چلا گیا۔ آہستہ آہستہ دن کی روشنی بھی مغرب کی طرف سمٹ گئی اور سارے چیڑ کے جنگل پر شروع رات کا سرمئی سا اندھیرا چھا گیا۔ نجمی نے کچھ بے چین سا ہو کر پوچھا "بادل! یہاں اس طرح ہم کب تک پڑے رہیں گے؟ ظاہر ہے تمھارا دوست اب ہمیں بارڈر پار کرانے کی پوزیشن میں نہیں ہے پھر ہم کس لیے خطرات میں گھر کر یہاں بیٹھے ہیں۔"

بادل نے کہا "میں آج ہی رات شہر جاکر لال دین کا پتہ کرتا ہوں۔"

نجمی نے کہا "تمھارا شہر جانا ٹھیک نہیں پولیس کے آدمی ضرور لال دین کے مکان کی نگرانی کر رہے ہوں گے۔ میرا تو خیال ہے کہ ہمیں یہیں سے واپس اپنے گوماہ والے جنگل کی کمین گاہ کی طرف کوچ کر جانا چاہیئے۔ اب یہاں پڑے رہنا بیکار ہے۔"

بادل کو بھی اب بارڈر کراس کرنا اب ناممکن نظر آرہا تھا کہنے لگا "تم ٹھیک کہتی ہو لیکن میں ایک بار لال دین سے ملنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اتنی دور سے چل کر ہم یہاں آئے ہیں اتنا طویل فاصلہ طے کرکے اتنے خطروں میں سے گزر کر واپس جانا بھی آسان کام نہیں ہے۔ ایک بار لال دین سے مل کر پتہ کرلوں شاید وہ کوئی دوسرا راستہ بتادے اس کے اس علاقے کے اسمگلروں سے تعلقات ہیں۔"

نجمی کہنے لگی "کیا تمھیں یقین ہے کہ پولیس نے اسے چھوڑ دیا ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اسے ملنے جاؤ اور پولیس تمھیں پکڑ لے۔"

بادل کچھ سوچ کر بولا "تمھارا خدشہ بھی صحیح ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ جانے سے پہلے لال دین سے ایک بار مل لوں۔ آخر ہمیں یہاں سے واپس جانا ہے ہی تو کیوں نہ یہ چانس بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دل سے نکال لی جائے۔ ممکن ہے وہ گھر واپس آ گیا ہو اور ہمیں کوئی دوسری ترکیب بتا دے وہ ہمیں آگے کشمیر کے بارڈر تک بھی پہنچا سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ جموں کو چھوڑ کر وادی سے بھی ہمیں بارڈر کراس کروا سکتا ہے۔"

نجمی نے دم بدم گہری ہوتی شام کے اندھیرے میں گم ہوتے چیڑ کے درختوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے تم جا کر دیکھ لو لیکن وہاں دیر مت لگانا یہ بات دھیان میں رکھنا کہ جب تک تم واپس نہیں آؤ گے میں پریشان رہوں گی۔"

بادل بولا "میں ہر حالت میں واپس آؤں گا انشاءاللہ۔"

جونہی اندھیرا ہوا بادل نے اپنا بھرا ہوا پستول کپڑوں کے اندر چھپایا، گڑ کے ساتھ تھوڑی سی روٹی کھائی اور نجمی کو غار کے اندر ہی بیٹھے رہنے کی تاکید کر کے اللہ کا نام لے کر وہاں سے نیچے اترنے لگا۔ پہاڑی ٹیکریوں کی اترائی آسان تھی۔ وہ دس پندرہ منٹ میں نیچے بیر کھوہ کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں آ گیا۔ یہاں سے اس نے آم اور سنگتروں کے اندھیرے باغ کو عبور کیا اور توی دریا کے پل کا رخ پکڑ لیا۔ پل کراس کرتے ہوئے اسے خطرہ تھا کہ اگر وہاں پولیس ہوئی تو اس کی چیکنگ ضرور ہو گی وہیں سے بادل نے فیصلہ کر لیا کہ وہ پیدل چل کر پل عبور نہیں کرے گا۔ پل ابھی ایک فرلانگ دور تھا کہ بادل سڑک کی ایک جانب بیٹھ گیا اس نے چادر لپیٹ رکھی تھی۔ بھرا ہوا پستول اس کی صدری کی جیب میں پڑا تھا۔ پیچھے اودھم پورے والی سڑک کی طرف سے ایک لاری آتی نظر آئی۔ اس کی بتیاں جل رہی تھیں اس کے ہارن کی آواز سے بادل نے اندازہ لگا لیا کہ یہ لاری ہی ہو سکتی ہے جو بانہال بٹوت وغیرہ سے آ رہی ہو گی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ لاری قریب آئی تو بادل نے اسے ہاتھ دے دیا۔ لاری اس کے قریب سے ہوتی ہوئی تھوڑا آگے جا کر رک گئی۔ بادل اس کے پیچھے دوڑا کلینر دروازے میں لٹکا ہوا تھا اس نے وہیں سے آواز لگائی "دو روپے لگیں گے جموں اڈے کے۔"

بادل نے لاری میں گھستے ہوئے کہا "ہاں ہاں لے لینا یارا۔"

کلینر نے زور سے لاری کی دیوار پر ہاتھ مارا۔ لاری پل کی طرف روانہ ہو گئی۔ جوں جوں دریائے توی کا پل قریب آ رہا تھا بادل کی تشویش بڑھ رہی تھی اندھیرے میں اسے کچھ نظر

نہیں آ رہا تھا کہ پل کے پاس پولیس کھڑی ہے کہ نہیں... لاری پل کے دروازے پر پہنچ کر رک گئی۔ ایک ڈوگرہ پولیس کانسٹیبل دروازے میں سے جھک کر لاری کے اندر آ گیا۔ یہ سکھ تھا اس نے اندر آتے ہی مسافروں پر ایک اڑتی ہوئی نظر ڈالی اور پوچھا "سواریاں کہاں سے آ رہی ہیں بھائی؟"

ایک دو ہندو مسافروں نے یک زبان کہا کہ ہم بٹوت سے آ رہے ہیں اتنی دیر میں سکھ کانسٹیبل دو تین قریب کی سواریوں کو یوں جھک کر دیکھ چکا تھا جیسے انھیں سونگھ رہا ہو۔

کلینر جو باہر سڑک پر کھڑا تھا چلا کر بولا "کسی کے پاس ناجائز اسلحہ ہے تو نکال کر رکھ دے یہاں۔"

بادل کی اندرونی صدری میں بھرا ہوا پستول موجود تھا لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ بادل جیسا ڈاکو اتنی آسانی سے اپنا پستول ان کے حوالے کر دیتا۔ وہ چپکا بیٹھا رہا۔ سکھ کانسٹیبل لاری سے اتر گیا۔ باہر والے کانسٹیبل نے پوچھا "ٹھیک ہے سردارا؟"

سکھ کانسٹیبل نے گالی دے کر کہا "ٹھیک ای اے۔" کلینر نے دونوں کانسٹیبلوں کو سلام کیا اور لاری کی باڈی پر زور سے ہاتھ مار کر چلایا "چلو جی۔"

لاری توی کے پل پر سے گزرنے لگی۔ بادل خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے صرف اتنا کیا کہ جو ہاتھ صدری کے اندر پستول پر جما ہوا تھا باہر نکال لیا۔

لاری پل پار کر کے جموں کے مین لاری اڈے کی طرف بڑھنے لگی۔ بادل نے ایک خاص سڑک پر لاری کو رکوایا اور نیچے اتر کر محلہ استاداں کی طرف چلنے لگا وہ بڑی سڑک کی طرف جانے کی بجائے تنگ گلیوں کی جانب سے محلہ استاداں میں داخل ہوا۔ گلیاں نیم روشن تھیں۔ وہ لال دین کے مکان کے سامنے آ کر رک گیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ لال دین کے مکان پر تالا نہیں لگا ہوا تھا۔ اوپر والے چوبارے میں بتی جل رہی تھی۔ بادل کو بڑی خوشی ہوئی کہ لال دین تھانے سے واپس آ گیا تھا۔ اس نے دروازے کو ذرا سا اندر دھکیلا۔ دروازہ اندر سے کھلا تھا۔ بادل کو دستک دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ڈیوڑھی میں آ گیا۔ دائیں طرف جو بیٹھک تھی اس کے دروازے پر قفل چڑھا ہوا تھا۔ ڈیوڑھی میں سے اوپر تنگ زینہ دوسری منزل کو جاتا تھا۔ یہاں زینے میں اوپر چڑھ کر بادل نے آہستہ سے آواز دی "لال دین؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اوپر سے کوئی جواب نہ آیا۔ بادل خان نے دوسری بار آواز دی تو اوپر والے چوبارے کے بند دروازے کے پیچھے سے ایک عورت کی آواز آئی "کون ہے؟"

بادل حیران ہوا کہ یہ عورت کہاں سے آگئی؟ اتنی دیر میں دروازہ کھلا۔ ایک جوان عورت جس نے ساڑھی پہن رکھی تھی دروازے میں نمودار ہوئی اور نیچے سیڑھیوں میں جھانک کر بولی۔ "تمھیں یہاں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں۔"

بادل سمجھ گیا کہ یہ لال دین کی کوئی رازدار عورت ہے اور لال دین نے ہی یہاں رکھا ہوا ہے اس کے باوجود بادل نے اپنی شناخت ظاہر کرنی مناسب نہ سمجھی اور کہا "بی بی! میں لال دین سے ملنے ادھم پورے سے آیا ہوں۔"

جوان عورت دروازے میں بیٹھ گئی اور ہاتھ کا اشارہ کر کے سرگوشی میں بولی "اتنی اونچی آواز میں کیوں بول رہے ہو؟ میری بات کا جواب دو تمھیں یہاں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

بادل پھر بھی اپنی جگہ پہ قائم رہا۔ کہنے لگا "بی بی! میں تمھاری بات نہیں سمجھا۔ مجھے یہاں آتے کوئی دیکھ بھی لے گا تو کیا ہوگا۔ میں کوئی چور ڈاکو تو نہیں ہوں۔ میں لال دین کا پرانا دوست ہوں اور ادھم پور میں منیاری کی دکان کرتا ہوں۔"

جوان اور خوبصورت عورت نے سیڑھیوں میں آ کر بادل کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی "مجھے لال دین نے خاص طور پر تمھارے لیے یہاں بھیجا ہے۔ تم سیڑھیوں میں کس لیے کھڑے ہو؟ اپنے ساتھ مجھے بھی گرفتار کرواؤ گے کیا؟"

بادل چپکے سے اوپر والے کمرے میں آ گیا ابھی تک اس نے اپنے آپ کو ظاہر نہیں کیا تھا۔ اوپر آتے ہی بولا "لال دین کہاں ہے؟ کیا جموں سے باہر گیا ہوا ہے؟"

جوان عورت نے گلی والی کھڑکی بند کر دی اور بادل کو چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بادل چارپائی پر بیٹھ گیا تو عورت بھی سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اپنی ساڑھی کے پلو کو سینے پر درست کرتے ہوئے کہنے لگی "اسے پولیس پکڑ کر لے گئی ہے میں اس سے حوالات میں ملنے گئی تو اس نے مجھے تمھارے بارے میں بتایا کہ تم اسے ملنے شاید اس کے مکان پر آؤ گے۔"

بادل نے انجان پن سے پوچھا "پولیس اسے کیوں پکڑ کر لے گئی ہے؟ اس نے کیا کیا ہے؟ وہ تو بڑا شریف آدمی ہے۔"

جوان عورت نے کہا "تمھاری وجہ سے تو وہ حوالات میں بند ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ اسے پولیس کیوں پکڑ کر لے گئی ہے؟"

بادل چپ ہو گیا۔ وہ ایک زیرک ڈاکو تھا۔ یہ ایک چال اور پولیس کا بچھایا ہوا جال بھی ہو سکتا تھا۔ اس نے عورت سے ایک ایسا سوال کر دیا جس کے جواب میں عورت کچھ بوکھلا سی گئی۔ بادل نے پوچھا "لال دین نے تمھیں میرا نام کیا بتایا تھا۔؟"

لال دین نے پولیس کی گھناؤنی اذیتیں برداشت کر لی تھیں مگر زبان سے بادل یا چندا نجمی کا نام تک نہیں لیا تھا۔ جوان عورت کچھ چکر سا کھا گئی۔ مگر جلدی سنبھل کر بولی "اس نے مجھے تمھارا نام نہیں بتایا۔ اتنا وقت ہی نہیں تھا۔ ہمارے سر پہ حوالات کے باہر کانسٹیبل کھڑا تھا۔"

بادل اب اپنی جگہ پہ پکا ہو گیا اس کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ پولیس کی ایک سازش ہے۔ ایک جال ہے جس کے وہ بالکل قریب بلکہ اس کے تقریباً اندر آ چکا ہے۔ اس نے چادر کے اندر ہی اندر اپنا ہاتھ صدری کی پستول والی جیب میں ڈال لیا اور کہا "بی بی! مجھے کچھ معلوم نہیں کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ میں تو ادھم پور سے لال دین سے مال لینے آیا ہوں اب تم کہہ رہی ہو کہ وہ حوالات میں ہے۔ پولیس اسے پکڑ کر لے گئی ہے میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اچھا میں چلتا ہوں۔"

بادل اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک صدری کی جیب میں پستول پہ ہی تھا جوان اور خوبصورت عورت نے بادل کو اٹھتے دیکھا تو بے اختیار اس سے لپٹ گئی "رات کے وقت کہاں جاؤ گے۔ آج رات میرے پاس ہی رہ جاؤ میں تمھارے لیے کھانا بناتی ہوں۔"

اب اس میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہ گیا تھا کہ اس عورت کو یہاں پولیس نے بھیج رکھا ہے اور یقیناً پولیس بھی اس مکان میں موجود ہے۔ بادل نے اسے جھٹک کر اپنے سے الگ کیا اور بولا۔ "میں ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں بی بی! لال دین سے جا کر کہہ دینا کہ بشیرا ادھم پور والا آیا تھا۔"

یہ کہہ کر بادل نیچے سیڑھیوں کی طرف بڑھا ہی تھا کہ جو زینہ چھت کو جاتا تھا وہاں سے ایک سکھ چھلانگ لگا کر سامنے آ گیا اور تحکمانہ لہجے میں بولا "کھڑا رہ اوئے ایتھے ای۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سکھ کے ہاتھ میں پستول تھا۔ بادل پولیس کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس چکا تھا لیکن وہ اتنی آسانی سے پولیس کے قبضے میں آنے والا نہیں تھا۔ وہ کوئی شریف سیدھا سادا احمق اور ناتجربہ کار آدمی نہیں تھا ایک ایسا سنگدل اور بے رحم ڈاکو تھا جو اب تک نہ جانے کتنے سکھ پولیس والوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ موت اس کے بالکل سامنے تھی۔ سکھ کانسٹیبل ایک سیکنڈ میں فائر کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود بادل نے موت کا خطرہ اور چیلنج قبول کر لیا اور بجلی کی تیزی کے ساتھ ہاتھ چادر سے باہر نکالا اور سکھ پر گولی چلا دی۔ اس کا ہاتھ باہر نکلنا اور اس پستول میں سے دھماکے کے ساتھ گولی کا فائر ہونا یہ جیسے ایک ہی فعل تھا، ایک ہی عمل تھا۔ گولی سکھ کے سینے میں جا کر لگی اور سب سے پہلے اس کے ہاتھ والا پستول نیچے گرا اس کے بعد وہ بھی دھڑام سے نیچے گر پڑا۔ جوان عورت کی چیخ نکل گئی۔ بادل جانتا تھا کہ وہاں مزید پولیس والے موجود ہیں۔ وہ چھلانگ لگا کر نیچے جاتے والی سیڑھیوں میں آ گیا ڈیوڑھی میں سے چھلانگ لگا کر گلی میں آیا تو دھپ دھپ کرتے دو پولیس کانسٹیبل جو وردیوں میں تھے اس کی طرف بڑھے ان کے پاس بندوقیں تھیں ایک نے بندوق کا فائر کر دیا۔ بادل جلدی سے سامنے والے مکان کے تھڑے کے پیچھے ہو گیا۔ اس نے اندھا دھند دونوں کانسٹیبلوں پر فائرنگ شروع کر دی ایک کانسٹیبل وہیں گلی میں ڈھیر ہو گیا دوسرا پیچھے کو بھاگا۔ بادل نے پیچھے سے بھاگتے ہوئے دوسرے کانسٹیبل پر فائر کیا۔ بادل کا نشانہ بے حد اچھا تھا وہ ایک نامی گرامی ڈاکو تھا اور اسے اندھیرے جنگلوں میں بھی دشمن پر فائر کرنے کا بڑا تجربہ تھا۔ گولی گلی میں بھاگتے ہوئے کانسٹیبل کی پیٹھ میں گھس گئی۔ وہ لڑھک کر منہ کے بل گر پڑا بادل اس کے اوپر سے چھلانگ لگا کر گلی میں آگے کی طرف دوڑا۔ آگے گلی میں اندھیرا تھا۔ یہ گلیاں زیادہ روشن نہیں تھیں۔ مکانوں کی کھڑکیاں کھل رہی تھیں اور لوگ نیچے دیکھ رہے تھے کہ یہ فائرنگ کیوں ہو رہی ہے اتنی دیر میں بادل گلیوں سے نکل کر توی دریا کے پل کی طرف نکل آیا تھا۔ رات ہونے کی وجہ سے وہ اندھیرے میں ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ تھوڑے فاصلے پر سامنے ایک پولیس کی جیپ کھڑی تھی اس میں کوئی کانسٹیبل نہیں تھا۔

دونوں کانسٹیبل جو اس میں بیٹھے تھے فائرنگ کی آواز سن کر گلی کی طرف بھاگے تھے اور اب

دونوں کی لاشیں گلی میں پڑی تھیں۔ بادل جیپ کی طرف بڑے آرام سے بڑھا۔ ایک رکشا اس کے قریب سے گزر گیا۔ بجلی کے کھمبے دور دور لگے تھے۔ جیپ میں چابی لگی ہوئی تھی۔ فائرنگ کی آواز پر گھبراہٹ میں کانسٹیبل چابی لگی ہوئی چھوڑ گئے تھے۔ بادل جیپ میں بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کر کے تیزی سے ایک طرف نکل گیا۔ وہ دریا کے پل پر جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ پولیس کی جیپ دیکھ کر اسے وہیں گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ اگر وہ گاڑی کو بھگا کر لے بھی جاتا ہے تو پل کے دوسرے کنارے پر اس کی ناکہ بندی کی جا سکتی تھی۔ پل کی دوسری طرف بھی مسلح پولیس موجود تھی۔ اس پر فائرنگ کر کے اسے ہلاک کیا جا سکتا تھا۔ بادل نے جیپ کا رخ دریا کے پیچھے کی جانب پرانے جموں کے ریلوے اسٹیشن کی طرف موڑ دیا۔ اسے ہر حالت میں پہاڑیوں میں نجمی کے پاس پہنچنا تھا۔ جموں کے پرانے ریلوے اسٹیشن کے علاقے میں روشنیاں بھی تھیں اور ٹریفک بھی کافی تھی وہ سویلین کپڑوں میں تھا اور جیپ جموں پولیس کی تھی۔ کوئی بھی پولیس گاڑی اس کے پیچھے لگ سکتی تھی۔ ایک بات کا اسے علم تھا کہ جو عورت لال دین کے گھر بیٹھی تھی اس نے اب تک پولیس اسٹیشن اطلاع کر دی ہو گی کہ لال دین کا ساتھی جس کے کھوج میں پولیس نے اسے وہاں بھیجا تھا۔ تین پولیس کانسٹیبلوں کا خون کر کے بھاگ گیا ہے اور تھوڑی ہی دیر بعد سارے جموں شہر کی پولیس چوکس ہو جائے گی اور اس کی تلاش شروع ہو جائے گی چوکوں، بازاروں کے ناکوں ریلوے اسٹیشن اور لاریوں کے اڈوں اور شہر سے پٹھانکوٹ اور کشمیر جانے والی سڑکوں کی ناکہ بندی کر دی جائے گی۔ بادل جیپ کو پوری رفتار سے چلاتے ہوئے پرانے ریلوے اسٹیشن کے علاقے سے بھی نکل گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے جموں کشمیر روڈ پر وہ دریا کو پار کیے بغیر نہیں جا سکتا تھا اور دریا کے پل پر پولیس موجود تھی تو کیا وہ تیر کر دریا پار کرے۔ دریا کا پانی تیز اور یخ تھا اس کے پاس وقت بہت تھوڑا تھا اسے جو کچھ بھی کرنا تھا پندرہ بیس منٹ کے اندر اندر کر گزرنا تھا۔ ورنہ اس کے بعد پولیس ہر حالت میں سارے شہر میں پھیل جاتے والی تھی اور اس کی جیپ کو کسی بھی جگہ پکڑا جا سکتا تھا۔ بادل دریا کے نیچے دور تک جیپ بھگاتا چلا گیا۔ پرانے مندر کے قریب اس نے ایک کھڈ کے پاس اندھیرے میں جیپ کھڑی کر دی اور اتر کر دریا کے کنارے آ گیا۔ دریا کا پانی ایک ہلکے ہلکے شور کے ساتھ رات کے اندھیرے میں تیزی سے بہہ رہا تھا۔ بادل نے پستول کو کھول کر دیکھا اس کی ساری گولیاں ختم ہو چکی تھیں۔ اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پستول صدری میں رکھ لیا۔ کنارے پر بیٹھ کر پانی میں ہاتھ ڈالا۔ پانی بے حد ٹھنڈا تھا۔ دریائے توی کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا مگر جموں سے گزرتے وقت اس کا بہاؤ تیز ہو جاتا ہے۔ بادل نے سامنے دوسرے کنارے کی طرف نگاہ ڈالی دوسرا کنارہ اونچا تھا اوپر درخت تھے اور ایک طرف پیچھے راجہ کے محل کی بلند عمارت اندھیرے میں ایک بڑے قلعے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ بادل نے چادر اتار کر اپنی کمر کے گرد اچھی طرح لپیٹی۔ جوتے اتار کر چادر میں پھنسائے اور اللہ کا نام لے کر دریا میں اتر گیا۔ ٹھنڈا یخ پانی نے اس کے جسم کو جیسے ایک دم سرد کر دیا۔ بادل نے تیرنا شروع کر دیا دریا کا تیز بہاؤ اسے پل کی طرف بہائے لے جانے لگا۔ بادل پورا زور لگا کر اپنی سیدھ میں دوسرے کنارے کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا آخر بادل نے دریا پار کر لیا مگر پانی کا تیز بہاؤ اسے اس مقام سے کافی آگے لے گیا جہاں اس کا خیال تھا کہ وہ کنارے پر اترے گا۔

یہاں وہ آم اور سنگترے کے گھنے باغ نہیں تھے۔ جہاں سے گزر کر وہ نجمی کے ساتھ اوپر والی پہاڑی پر گیا تھا اور جہاں اس وقت بھی وہ جانا چاہتا تھا وہ آم کے باغوں والے علاقے سے آگے نکل آیا تھا جہاں ڈھلان پر کہیں کہیں کوٹھیوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ یہ آباد علاقہ تھا بادل اس طرف نہیں جانا چاہتا تھا۔ دریا سے نکلتے ہی وہ واپس آم کے باغوں کی طرف چلنے لگا خالی پستول اس کی جیب میں تھا اس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے اسے سردی بھی لگنے لگی تھی لیکن وہ تیز تیز چل رہا تھا وہ آم اور سنگترے کے باغوں میں سے ہو کر اوپر پہاڑی کے کھوہ میں نجمی کے پاس پہنچنا چاہتا تھا کئی بار اسے خیال آیا کہ وہ خالی پستول پھینک دے لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ اس خیال پر عمل نہ کر سکا۔ وہ آبادی والے علاقے سے جب کافی نکل آیا تو اسے اپنی بائیں جانب آم کے باغوں کا اندھیرا نظر آنے لگا۔ یہاں سے چھوٹی سی چڑھائی چڑھنے کے بعد وہ آم کے باغ میں آ گیا یہاں وہ رک گیا اس نے اپنی چادر کمر سے اتار کر نچوڑی اسے جھاڑ کر کندھے پر ڈالا اور صدری کو بھی نچوڑ کر دوبارہ پہن لیا۔ صدری کی جیب میں خالی پستول موجود تھا اس کے پاس جو کرنسی نوٹ تھے وہ بھی گیلے ہو گئے تھے مگر بادل نے انہیں ویسے ہی رومال میں لپٹے رہنے دیا۔ آم کے باغ میں اندھیرا چھایا ہوا تھا رات ہو گئی تھی۔ بادل نے ایک راستہ متعین کیا اور آگے بڑھا۔ جونہی وہ آگے بڑھا اس پر تین جانب سے روشنی کی آبشاریں گرنے لگیں۔ ساتھ ہی یک وقت چار پانچ ہوائی فائر

ہوئے اور کسی کی بلند آواز گونجی "کھڑے رہو اپنی جگہ ورنہ بھون دیئے جاؤ گے۔"

بادل کچھ بوکھلا سا گیا روشنی میں وہ اور آس پاس کے درخت نہا گئے تھے۔ ایک تھانیدار چار مسلح کانسٹیبلوں کے ساتھ روشنی کے دائرے میں نمودار ہوا اس نے پستول تان رکھا تھا۔۔۔ کانسٹیبلوں نے رائفلوں کا رخ بادل کی طرف کیے ہوئے تھا۔ تھانیدار نے چلا کر کہا "ہاتھ اوپر اٹھالو نہیں تو گولی مار دوں گا۔"

بادل نے آہستہ سے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔

-- -- ٭ -- --

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بادل کے ہاتھ اٹھاتے ہی سپاہی اس کی طرف بڑھے۔

تین سپاہی اور تھانیدار ابھی تک اس کی طرف اپنی رائفلیں اور پستول تانے ہوئے تھے۔ پولیس کی دو جیپیں آم کے باغ میں درختوں کے نیچے قریب کھڑی تھیں۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پولیس نے بادل کو الٹی ہتھکڑی لگا دی اس کے دونوں ہاتھ پشت پر لے جا کر ہتھکڑی لگائی گئی تھی۔ تلاشی لینے پر بادل کی گیلی صدری میں سے وہ پستول بھی برآمد ہو گیا جس سے اس نے تھوڑی دیر پہلے تین کانسٹیبلوں کو ہلاک کیا تھا۔

تھانیدار نے پستول اور رائفلوں کی نوک پر بادل خان کو جیپ میں سوار کرایا اور دونوں جیپیں جموں پولیس اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئیں۔ لال دین نے پولیس کے تشدد کے باوجود پولیس کو بادل اور نجمی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اسی محلّے میں مقیم پولیس کے ایک مخبر نے اطلاع دی تھی کہ اس نے ایک مرد اور ایک عورت کو لال دین کے ساتھ رات کے وقت آم کے باغوں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ پولیس نے اسی وقت آم کے باغ کی ساری تلاشی لی مگر اسے بادل اور اس کی ساتھی وہاں نہ مل سکے لیکن جب پولیس نے لال دین کو حراست میں لے لیا تو اس کے گھر سی آئی اے نے اپنی ایک مخبر عورت کو رکھ دیا کہ ہو سکتا ہے لال دین کے ہاں پناہ لینے والا پاکستانی جاسوس وہاں اس کی تلاش میں آجائے اور ایسا ہی ہوا۔ بادل خان وہاں گیا اور پھر اس کے ہاتھوں بیک وقت تین کانسٹیبلوں کا قتل ہو گیا۔ اس تہرے قتل کی اطلاع ملتے ہی پولیس نے باغ کو گھیرے میں لے لیا۔ پولیس کو یقین تھا کہ قاتل جو پاکستانی جاسوس ہے اسی طرف آئے گا۔ چنانچہ جب بادل دریا پار کر کے رات کے اندھیرے میں باغ میں داخل ہوا تو ایک دم سے اس پر حملہ کر کے اسے

گرفتار کر لیا گیا۔

پولیس کی یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ ہندو ڈوگرہ تھانیدار اپنی اس کامیابی پر بے حد خوش تھا۔ ابھی تک پولیس کو یہ علم نہیں ہوا تھا کہ بادل اصل میں چندا ڈاکو کا ساتھی ہے اور خود بھی قتل اور ڈکیتی کی ان گنت وارداتوں میں ملوث رہ چکا ہے۔

پولیس نے اسے پاکستانی جاسوس تصور کر کے اس سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ لال دین کو بادل کی گرفتاری سے بے خبر رکھا گیا۔ صرف اس پر کیے جانے والا تشدد روک دیا گیا۔ کیونکہ اب پولیس بادل سے پوچھ گچھ کر کے اس کے نام نہاد ساتھیوں کا پتہ کرنا چاہتی تھی۔ بادل پولیس کی حراست میں آتے ہی گونگا بن گیا۔ اس نے چپ سادھ لی۔ ساری رات اسے پولیس مارتی رہی۔ اسے الٹا لٹکا کر ڈنڈوں سے پیٹا گیا مگر بادل نے زبان نہ کھولی پولیس اس سے معلوم کرنا چاہتی تھی کہ جس عورت کے ساتھ وہ بارڈر کراس کر کے انڈیا میں داخل ہوا تھا وہ عورت کہاں ہے؟ مگر بادل ہر قسم کا بھیانک تشدد برداشت کرتا رہا اور زبان نہ کھولی اخباروں میں نجمی کی تصویر چھپی تھی۔ بادل کی تصویر پولیس کے پاس موجود نہیں تھی اس لیے پولیس اسے نہ پہچان سکی۔

دوسرے روز پولیس نے چالان کر کے بادل کو عدالت میں پیش کیا اور عدالت سے اس کا تین دن کا ریمانڈ لے لیا ریمانڈ لینے کے بعد بادل پر تشدد کا دور شروع ہو گیا۔

اب ہم واپس نجمی کی طرف آتے ہیں۔ رات کے وقت بادل نجمی کو پہاڑی کے اوپر ٹیلان کی کھوہ میں چھوڑ کر لال دین کا پتہ کرتے جموں شہر کے محلہ استاداں کی طرف گیا تھا اور جلدی واپس آجانے کا کہہ گیا تھا۔ نجمی کا خیال تھا کہ آدھی رات تک بادل واپس آجائے گا یا زیادہ سے زیادہ پچھلے پہر پلٹ آئے گا۔ لیکن جب رات گزر گئی اور دن نکل آیا اور بادل واپس نہ آیا تو نجمی کو تشویش ہوئی کہ خدا خیر کرے۔ بادل شہر میں رکنے والا نہیں ہے کہیں وہ پولیس کے ہتھے نہ چڑھ گیا ہو۔ اس خیال کے ساتھ ہی نجمی کا خون کھولنے لگا وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کھوہ سے باہر آگئی اس نے سب سے پہلے اپنے پستول کو چیک کیا۔ بارہ بور کا پستول گولیوں سے بھرا ہوا تھا وہ کسی طرح شہر جا کر بادل کا کھوج لگانا چاہتی تھی۔ مصیبت کے اس دور میں بادل نجمی کا وفادار ساتھی ہی نہیں بلکہ اس کا واحد سہارا بھی تھا۔ اچانک وہ اپنے آپ کو دشمن ملک میں تنہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محسوس کرنے لگی تھی۔ لیکن نجمی مایوس ہونے اور مصیبت میں صبر شکر کر کے بیٹھی رہنے والی عورت نہیں تھی وہ مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کرنا جانتی تھی۔ اس کے باوجود نجمی نے اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کیا کہ وہ اکیلی رہ کر دشمن کا زیادہ دیر تک مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ وہ ہر حالت میں کسی نہ کسی ترکیب سے بارڈر کراس کر کے پاکستان پہنچ جانا چاہتی تھی۔

ندیم پاکستان جا چکا تھا اسے پاکستان میں نجمی کا انتظار ہوگا۔ لیکن نجمی بادل کی مدد کے بغیر بارڈر کراس نہیں کر سکتی تھی وہ اس سارے علاقے سے ناواقف تھا۔ اس کے ہم پیشہ ساتھی بہت پیچھے بہار کے ایک جنگل کے غار میں پناہ گزین تھے جہاں بادل کو واپس جانا تھا۔ نجمی اتنی آگے آ کر اب واپس ان لوگوں کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی۔ واپس جا کر وہ سوائے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھی رہنے کے اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ بادل کے سوا وہاں اس کی بات سمجھنے اور اس کو مشورہ دینے اور اس کی مدد کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔

نجمی چیڑھ کے درختوں میں آ کر ایک پتھر کی اوٹ میں بیٹھ گئی۔ دن کی سنہری روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ نجمی نے سوچا کہ ہو سکتا ہے بادل کسی خاص وجہ سے اپنے دوست لال دین کے پاس رک گیا ہو۔ آخر اسے بارڈر کراس کروانے کا مسئلہ بھی تو حل کرنا ہے۔ ممکن ہے لال دین اسے اپنے کسی ساتھی کے پاس لے گیا ہو۔ یہ سوچ کر نجمی کو کچھ حوصلہ ہوا اور اس نے یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دی کہ بادل دوپہر یا زیادہ سے زیادہ شام تک آ جائے گا۔ وہ ڈھلان کے پتھروں سے اترتی ہوئی نیچے گھاٹی کے چشمے تک گئی وہاں اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ واپس غار میں آ کر نمکین مٹھی کھائی تھوڑا سا گڑ بھی کھایا اور غار کے اندر بچھی ہوئی چادر پہ نیم دراز ہو کر بادل کے بارے میں غور و فکر کرنے لگی۔ وقت گزرتا چلا جا رہا تھا۔ سورج چیڑھ کے درختوں کے اوپر آ گیا۔ دوپہر ہو گئی نجمی نے کل کی باسی روٹی گڑ کے ساتھ کھائی۔ نیچے چشمے پہ جا کر پانی پیا۔ وہ اوپر واپس آ کر اپنے غار کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اسے ایک عورت کی ہلکی سی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ یہ وہی گوالن تھی جسے ایک روز پہلے ڈھلان کے سبزے پہ بکریاں چراتے دیکھا تھا۔ یہ گوالن درخت کے پاس کھڑی نجمی کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی اس کے ایک ہاتھ میں چھڑی تھی اور دوسرے ہاتھ کی انگلی اس نے دانتوں میں داب رکھی تھی۔ دو بکریاں اس کے پیچھے درختوں کے نیچے بڑے انہماک سے گھاس چر رہی تھیں۔

سب سے پہلے نجمی کو یہ خیال آیا کہ گوالن کو اسے نہیں دیکھنا چاہیئے تھا مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ گوالن چند قدموں پہ کھڑی نجمی کی طرف دیکھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ نجمی نے اپنی حیرت پہ بہت جلد قابو پا لیا اور کچھ سوچ کر گوالن کی طرف بڑھی۔ نجمی نے اپنا لہجہ بھی دیہاتی عورتوں جیسا بنا کر پوچھا "کیا نام ہے تمھارا؟"

مگر نجمی کا پنجابی لہجہ کسی صورت میں بھی جموں کے ڈوگری لہجے جیسا نہیں تھا۔ گوالن اسی طرح نجمی کی طرف دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھی۔ اتنی دیر میں نجمی نے ایک فرضی کہانی دماغ میں سوچ لی تھی۔ کہنے لگی "میرا نام بملا ہے۔ میں بٹالہ کی رہنے والی ہوں میں اپنے پتی کے ساتھ جموں کی سیر کو آئی ہوئی ہوں۔ میرا پتی میرے ساتھ ہی تھا ہم ان پہاڑوں کی سیر کر رہے تھے کہ بھگوان جانے وہ کہاں چلا گیا میں اسے ڈھونڈ رہی ہوں۔"

گوالن نے مسکراتے ہوئے کہا "میرا نام سرداراں ہے ہم مسلمان ہیں۔ پر ہمارے گاؤں میں ہندو بھی ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔"

نجمی ابھی اپنے غار میں نہیں جا سکتی تھی۔ وہ گوالن کے قریب جا کر ایک پتھر پہ بیٹھ گئی اسے بیٹھتے دیکھ کر سرداراں بھی بیٹھ گئی۔ نجمی نے کہا "کیا یہاں سے آگے بھی کسی گاؤں کو راستہ جاتا ہے؟"

سرداراں بولی! "ہاں جی! آگے کئی گاؤں ہیں۔" پھر اس نے ایک ایک کر کے سب گاؤں کے نام بول دیئے اس کے بعد کچھ فکر مند سی ہو کر کہنے لگی "تمھارا پتی کس طرف گیا تھا؟"

نجمی نے یونہی ایک طرف اشارہ کر کے کہا "ہم ادھر دریا کی طرف سے یہاں آئے تھے میرا پتی گوردیال بھی میرے ساتھ تھا بس یہاں آ کر کہیں ادھر ادھر ہو گیا ہے۔ یہیں کہیں ہو گا۔ میں اسے ڈھونڈ لوں گی۔"

نجمی مسکراتے ہوئے اٹھی اور درختوں میں ایک طرف چلنے لگی۔ کچھ دور جا کر وہ رکی۔ یونہی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے نگاہ پیچھے ڈالی تو دیکھا گوالن اپنی بکریوں کو ہنکاتی ہوئی پہاڑی کی دوسری طرف جا رہی تھی۔ نجمی نے خدا کا شکر ادا کیا اور اوپر سے ہو کر واپس غار میں آ کر بیٹھ گئی۔

اب اسے یہ خطرہ بھی تھا کہ کہیں وہی گوالن پھرتی پھراتی ادھر نہ آ جائے۔ نجمی غار سے باہر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نکل کر جو سامنے گھنی جھاڑی تھی اس کی اوٹ میں بیٹھ گئی۔ اس کے پیچھے چٹان اور غار تھا اور دائیں بائیں اور سامنے چیڑھ کے درخت تھے۔ اگر کوئی اس طرف آئے تو وہ اسے دور ہی سے دیکھ سکتی تھی لیکن وہ وہاں کب تک بیٹھی رہتی۔

تھوڑی دیر بعد اٹھی اور غار میں چلی گئی۔ دن غروب ہونے لگا۔ نجمی کو ایک بار پھر بادل کا فکر دامن گیر ہو گیا۔

خدا جانے کیا بات ہے جو وہ ابھی تک نہیں آیا۔ جوں جوں دن ڈھل رہا تھا نجمی کی فکر میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جب سورج ڈوب گیا اور چیڑھ کے درختوں میں شام کا سرمئی دھندلکا پھیلنے لگا تو نجمی بے چین سی ہو کر غار سے باہر آ گئی اس کی حالت اس شیرنی ایسی تھی جس کو پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ وہ وہاں رہنا بھی نہیں چاہتی تھی اور وہاں سے جانے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتی تھی۔ لیکن یہ خطرہ مول لیے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

نجمی نے تھوڑا بہت کھایا اور چشمے پر آ کر پانی پینے لگی چیڑھ کے پہاڑی جنگل میں خنک ہوا چلنے لگی تھی۔ موسم ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ نجمی کا ذہن تیزی سے سوچنے لگا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے کیا وہ آج رات بادل کا انتظار کرے یا پھر شہر میں خود جا کر اس کا کھوج لگائے؟ مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ شہر میں کہاں جائے؟

اگر لال دین پولیس کی حراست سے نکل کر اپنے گھر آ گیا ہوتا تو اب تک بادل بھی اس سے مل کر واپس آ چکا ہوتا۔ اور اگر لال دین اپنے مکان پر نہیں ہے اور ابھی تک پولیس کی حراست میں ہی ہے تو یقینی طور پر پولیس اس کے مکان کی نگرانی کر رہی ہو گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بادل کو پولیس نے پکڑ لیا ہو گا۔ نجمی بے چین سی ہو گئی وہ اٹھ کر چشمے کے پاس درختوں میں ٹہلنے لگی۔ لیکن نہیں۔ وہ اپنے آپ کو تسلی دینے لگی۔ ایسی بات نہیں ہو گی بادل پکڑا نہیں جا سکتا۔ وہ شیر ہے وہ دو چار کو مار کر فرار ہو سکتا ہے لیکن فرار ہونے کے بعد بھی اسے اب تک واپس آ جانا چاہیئے تھا۔ آخر نجمی اسی نتیجے پر پہنچی کہ بادل اپنے دوست لال دین کے ساتھ بارڈر کراس کرانے کے سلسلے میں کسی خاص جگہ گیا ہو گا وہاں دن چڑھ آیا ہو گا اور اب بادل اسی انتظار میں ہو گا کہ رات کا اندھیرا ہو اور وہ واپس نجمی کے پاس جائے۔

نجمی کے دماغ سے جیسے اچانک بوجھ سا اتر گیا اس نے دل میں کہا بادل آج رات ضرور آ جائے گا اور چشمے سے چل کر واپس اپنے غار میں آ گئی۔ شام کے سرمئی سائے رات کے اندھیرے میں بدل گئے۔ رات پڑتے ہی چیل کے درختوں میں سے گزرتی ہوا کی پُراسرار سرسراہٹیں صاف طور پر سنائی دینے لگیں ایسا لگ رہا تھا جیسے چیڑھ کے درخت آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ نجمی کے پاس کھانے کے لائق اب صرف گُڑ ہی باقی رہ گیا تھا۔ روٹیاں باسی ہو گئی تھیں نمکین مٹھیوں پر چیونٹیوں نے حملہ کر دیا تھا۔ گُڑ اس لیے بچ گیا کہ نجمی نے اس کی پوٹلی کو غار کے ایک پتھر سے لٹکا رکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ بادل رات کو آیا تو وہ اسے لے کر صبح ہونے سے پہلے پہلے کسی طرف نکل جائے گی۔ اول تو بارڈر کراس کرانے کا سارا بندوبست کر کے آئے گا اور ممکن ہے کل صبح وہ انڈیا کی سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل ہو جائے۔ نجمی نے باسی روٹیاں اور مٹھیاں اٹھا کر نیچے گھاٹی میں پھینک دیں۔ چادر کو پھر سے جھاڑ کر غار کے اندر بچھایا اور اس پر لیٹ کر بادل کا انتظار کرنے لگی۔ اسے سردی لگنے لگی۔ اس نے نیچے سے چادر نکال کر اپنے جسم کے گرد لپیٹ لی۔ جسم کو گرمائش پہنچی تو اسے نیند آنے لگی اور وہ سو گئی۔ آنکھ کھلی تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ چاروں طرف چیڑھ کے جنگل میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہوا کی درختوں کے ساتھ سرگوشیاں بھی ختم ہو چکی تھیں۔

نجمی کو معلوم نہیں تھا کہ رات کا کیا بجا ہو گا جسم کے گرد چادر لپیٹ کر وہ غار سے باہر آ گئی باہر غار کے مقابلے میں ٹھنڈ تھی مگر زیادہ سردی نہیں تھی۔ نجمی فکرمند ہو گئی۔

بادل کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں تھا۔ وہ وہیں بیٹھ کر درختوں کے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تنوں کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگی تھوڑی ہی دیر بعد اسے آسمان پر ستاروں کی روشنی ماند پڑتی نظر آنے لگی۔ تو کیا یہ رات کا پچھلا پہر تھا؟ کیا وہ ساری رات سوتی رہی تھی؟ لیکن بادل ابھی تک کیوں نہیں آیا؟ رات گزر گئی۔

ایک بار پھر سورج طلوع ہوا اور چیڑھ کے درخت اس کی روشنی میں سنہری ہو گئے۔ پرندے بولنے لگے۔ نجمی کا دل جیسے ڈوبنے لگا۔

ایک دم سے اس پر مایوسی کا شدید حملہ ہوا اور وہ وہیں دل کو تھام کر بیٹھی رہی لیکن مایوسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی یہ کیفیت تھوڑی ہی دیر بعد گزر گئی اس نے اپنی گردن اٹھا کر مشرق میں صبح کی نیلی روشنی بڑھتے پھیلتے دیکھی اور اس کی مٹھیاں اپنے آپ بھینچ گئیں۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو جائے وہ خود جا کر بادل کا کھوج لگائے گی۔ وہ چشمے پر نیچے اتر گئی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ منہ ہاتھ دھو کر بالوں میں انگلیاں پھیر کر انہیں سنوار رہی تھی۔ پھر اس نے سر اور جسم کو چادر میں اچھی طرح سے ڈھانپا قمیض کے اندر چھپائے ہوئے پستول کو ہاتھ لگا کر محسوس کیا اور اللہ کا نام لے کر نیچے پہاڑی کی ٹیکریوں کی طرف اترنے لگی۔ اترائی زیادہ خطرناک اور مشکل نہیں تھی۔ آدھ گھنٹے بعد وہ پہاڑی سے اتر کر ان چٹانوں اور ٹیکریوں کے پاس پہنچ گئی جہاں قدرتی کھوہ بنے ہوئے تھے اور جہاں سب سے پہلے لال دین انہیں چھپا کر گیا تھا۔ یہاں سے آگے آموں کے گھنے باغ تھے۔ ایک جانب سنگتروں کے باغ تھے۔ پھلوں کا موسم نہیں تھا اس لیے یہ باغ ویران پڑے تھے نجمی کو بھوک بھی لگ رہی تھی۔ یہاں سے اسے باغ کے شروع میں پانی کا ایک چھوٹا سا نالہ بہتا دکھائی دیا۔ یہ پہاڑی نالہ تھا جس میں شفاف پانی بڑی تیزی سے آم کے باغ کے اندر کی طرف بہہ رہا تھا۔ نجمی نے یہاں بیٹھ کر ٹھنڈا پانی پیا جس سے اس کی تھکان کافی حد تک دور ہو گئی۔ وہ پتھر کی ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے پیچھے تقریباً چھپ کر بیٹھ گئی اب اسے خیال آیا کہ شہر جموں اس کے سامنے ہے اور اسے دن کی روشنی میں لال دین کے مکان پر نہیں جانا چاہیئے۔ اگر بادل کا یہ دوست مکان پر نہ ہوا اور وہاں پولیس کی نگرانی ہوئی تو وہ یقینی طور پر گرفتار ہو جائے گی۔ اس نے یہی سوچا کہ اسے کسی نہ کسی طرح دن اسی جگہ گزار دینا چاہیئے اور رات کے اندھیرے میں لال دین کے گھر جائے۔ اس نے دائیں بائیں نگاہ ڈالی آم کے باغ میں دور اسے ایک چھوٹی سی ویران بارہ دری نظر آئی۔ بارہ دری ٹوٹی پھوٹی تھی اور آس پاس کوئی انسان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کسی باغبان کی جھگی بھی نہیں تھی۔ وہاں سے دور آم کے درختوں کے نیچے ہی ایک غیر آباد سی پرانی کوٹھی دکھائی دے رہی تھی مگر وہاں بھی کسی انسان کا نام و نشان نہیں تھا۔ نجمی کو صرف دن کے دن وہاں بیٹھنا تھا۔ وہ بارہ دری کی ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔

جوں جوں دن گزرتا گیا اسے بھوک اور پیاس ستانے لگی دوپہر کے بعد پیاس کی وجہ سے نجمی چادر اوڑھ کر اٹھی اور باغ کے ویران علاقے میں پانی کی تلاش میں نکل گئی۔ باغ کے باہر قریبی

ٹیکری کے پاس اسے ایک باؤلی کی شکل میں پانی مل گیا۔ اس نے پانی پیا اور بارہ دری میں واپس آنے کی بجائے وہیں اجڑی ہوئی باؤلی کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ بھوک اسے ضرور لگی تھی مگر بھوک وہ برداشت کر سکتی تھی۔ پانی پی کر اس کی توانائی بحال ہو گئی تھی۔ خدا خدا کر کے سورج غروب ہوا۔ پھر شام گہری ہوتی گئی۔ جب رات پوری طرح سے چھا گئی تو نجمی اٹھ کر دریائے توی کے پل کی جانب چل پڑی۔ بھوک سے اسے کمزوری ضرور محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ چلتی چلی گئی۔

چادر اوڑھنے کی وجہ سے وہ بالکل دیہاتی عورت لگ رہی تھی۔ اندھیرا ہونے کے باعث اسے کوئی آسانی سے پہچان بھی نہیں سکتا تھا۔ لال دین کی گھر والی گلی اسے یاد تھی۔ نجمی کی یادداشت اس معاملے میں کافی تیز تھی اور ایک بار دیکھی ہوئی جگہ اسے یاد رہ جاتی تھی۔

دریائے توی کے پل پر گاڑیوں کو پولیس چیک کر رہی تھی مگر پیدل چلنے والوں کو کوئی چیک نہیں کر رہا تھا۔ نجمی نے منہ سر اچھی طرح سے ڈھانپ رکھا تھا۔ پستول اس کے پاس ہی تھا۔ اس نے ایک ہاتھ پستول پر جما لیا تھا کہ اگر خطرناک صورتِ حال پیدا ہوئی تو وہ آسانی سے فائر کر سکے مگر اسے پل پر سے آتے ہوئے کسی نے نہ پوچھا اور کسی نے اس کی طرف دھیان بھی نہ دیا۔ وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ پل پر سے گزر گئی۔ پل کی دوسری طرف آ کر اس نے پیپل کے درخت کو دیکھا۔ یہ اس کی نشانی تھی اس درخت کے ساتھ ہی ایک گلی آگے دو چار گلیوں میں سے گزر کر لال دین کے گھر کو جاتی تھی۔

نجمی اللہ کا نام لے کر گلی میں داخل ہو گئی۔ یہ دھندلی اور نیم روشن گلیاں تھیں اپنی یادداشت کے بھروسے آخر نجمی لال دین کے مکان پر پہنچ گئی ایک بار تو وہ مکان کے آگے سے گزر گئی اس نے انتہائی ہوشیاری سے آس پاس کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہاں اسے کوئی مشتبہ شخص نظر نہ آیا۔ گلی کے سرے پر جا کر وہ واپس پلٹی اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ بادل کے دوست لال دین کے مکان پر تالا نہیں لگا تھا۔ اب وہ مکان کے سامنے آ کر رک گئی اور ایک، دم سے دستک دے دی وہ چاہتی تھی کہ دروازہ جلدی سے کھل جائے مگر دوسری بار دستک دینے پر دروازہ کھلا۔ نجمی نے دیکھا کہ ڈیوڑھی میں بادل کا دوست لال دین کھڑا تھا۔ اس نے جلدی سے نجمی کو ڈیوڑھی میں بلا لیا اور فوراً ہی دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ پھر وہ سکون کا سانس لے کر کچھ پریشانی کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے بولا "تمھیں کسی نے دیکھا تو نہیں ؟"

نجمی نے کہا "میرا خیال ہے کسی نے نہیں دیکھا۔ بادل کہاں ہے ؟"

"وہ تو پولیس کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔" لال دین بولا۔

نجمی کا دل ایک دم بیٹھ گیا جس کا اسے ڈر تھا وہی ہوا تھا۔ لال دین نجمی کو اوپر لے گیا۔ نجمی کو دیکھ کر وہ خود بھی پریشان ہو گیا تھا۔ کھڑکی کھلی تھی اس نے گلی میں جھانک کر دیکھا۔ پھر کھڑکی بند کر دی اور بولا "بہن جی! آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا۔ میری نگرانی ہو رہی ہے مجھے پولیس نے پکڑ لیا تھا۔ مجھے انھوں نے بڑی اذیتیں دیں مگر میں نے آپ میں سے کسی کا نام نہیں لیا۔"

"تو پھر بادل کیسے پکڑا گیا ؟" نجمی نے پوچھا۔

لال دین بولا "میں یہاں نہیں تھا میرے گھر کی پولیس نگرانی کر رہی تھی۔ بادل مجھے ملنے میرے پیچھے یہاں آیا۔ یہاں پولیس اس پر جھپٹی اس نے گولی چلا کر تین کانسٹیبلوں کو ڈھیر کر دیا اور فرار ہو گیا۔ لیکن توی دریا کے پار آم کے باغ میں پولیس نے انھیں گھیرے میں لے کر گرفتار کر لیا۔"

نجمی یہ جان کر حیران رہ گئی کہ بادل نے تین خون بھی کر ڈالے تھے۔ لال دین کہہ رہا تھا "یہاں کسی نے مخبری کر دی تھی کہ بادل آموں کے باغ کی طرف گیا ہے۔ مجھے حوالات میں ہی یہ ساری کہانی معلوم ہو گئی تھی۔ بادل کی گرفتاری کے بعد پولیس نے مجھے چھوڑ دیا۔"

نجمی نے لال دین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا تم سچ کہہ رہے ہو کہ تم نے ہمارا نام نہیں لیا تھا۔؟"

لال دین بولا "بہن جی! اگر میں پولیس کے آگے بک دیتا تو پھر آپ بھی گرفتار ہو چکی ہوتیں۔ ہم یاروں کے یار ہیں اور یار کے لیے جان بھی قربان کرنا جانتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ جلدی سے اٹھا اور کھڑکی کھول کر نیچے گلی میں دیکھنے لگا۔ "آپ ابھی میرے ساتھ چلیں۔ میں آپ کو ایک محفوظ مقام پر چھوڑ آتا ہوں بہن جی!"

نجمی کا بھوک کے مارے برا حال ہو رہا تھا اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا اس نے ادھر اُدھر دیکھ کر کہا "بھائی صاحب تمھارے گھر میں کھانے کو کچھ ہو گا میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔"

لال دین فوراً باورچی خانے میں گیا اور دو روٹیاں اور اچار لے آیا۔ "اس وقت میں یہی پیش کر سکتا ہوں۔ لیکن میری گزارش ہے کہ یہاں سے نکل چلو بہن جی! یہاں تمھارا رہنا ہمیں کسی بہت بڑی مصیبت میں ڈال دے گا۔"

نجمی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ لال دین نجمی کے ساتھ ڈیوڑھی میں آ گیا اس نے دروازہ کھول کر گلی میں دیکھا پھر بولا "میرے پیچھے چلی آؤ۔"

لال دین نجمی کو کسی دوسری طرف سے نکال کر باہر لے گیا۔ یہ ایک نیا ہی بازار تھا۔ لیکن نجمی نے اس بازار کی ایک نشانی بھی ذہن میں یاد کر لی۔ یہ ایک اونچا گھنا درخت تھا جس کے چبوترے پر ہنومان کے بت کے آگے دیا جل رہا تھا۔ لال دین نے دور سے آتے ہوئے ایک رکشے کو ہاتھ دے کر روک لیا۔ پھر اسے قریب جا کر کچھ کہا۔ اور نجمی کو رکشہ میں ساتھ بٹھا لیا۔ رکشہ الٹے رخ کو بازار میں روانہ ہو گیا۔ کئی بازاروں کا چکر کاٹنے کے بعد رکشا وہیں دریا کے پل کے پاس نکل آیا۔

لال دین نے پل کی ایک جانب رکشہ رکوا لیا۔ رکشے سے باہر آ کر لال دین نے نجمی سے کہا "تم اپنے طور پر پل پار کرو گی میں تمھارے بعد آؤں گا پل کے پار دائیں جانب والی گھاٹی کے نیچے میرا انتظار کرنا۔"

نجمی کو ایک بار پھر پل عبور کرنا پڑ گیا تھا۔ لیکن اسے اطمینان تھا کیونکہ پیدل چلنے والوں سے پولیس کے سپاہی کچھ نہیں بولتے تھے نجمی چادر لپیٹے پہلے کی طرح دیہاتی عورتوں کی طرح چلتی پل پار کر گئی پل کی دوسری طرف پہنچ کر وہ دائیں جانب والی گھاٹی میں اتر گئی اور ایک طرف جھاڑیوں کے پاس اندھیرے میں بیٹھ گئی۔

نیچے ڈھلان میں دریائے توی بہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد لال دین بھی وہاں آ گیا۔ نجمی جھاڑیوں سے باہر نکل آئی۔ لال دین گھاٹی چڑھنے لگا اوپر وہی آم کے گھنے باغ تھے نجمی لال دین کے ساتھ ساتھ تھی۔ آم کے باغ میں گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

لال دین نے نجمی کو ایک درخت کے نیچے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا "بہن جی! تم یہاں بیٹھ کر روٹی کھاؤ۔ میں ایک آدمی سے بات کر کے ابھی آتا ہوں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لال دین درختوں کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔ نجمی روٹی کھانے لگی۔ لال دین آم کے گھنے باغ میں گزرتا اس ویران اور اجڑی ہوئی مغلیہ طرز کی پرانی کوٹھی کے باہر آ کر رک گیا جسے نجمی نے دور سے دن کے وقت دیکھا تھا۔ کوٹھی خالی اور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کوٹھی کے پیچھے ایک چھوٹی سی جھگی میں چراغ جل رہا تھا اور ایک بوڑھا آدمی بوریئے پر بیٹھا تسبیح پھیر رہا تھا۔

لال دین نے جاتے ہی السلام علیکم کہا۔ بوڑھے نے آنکھیں کھول کر لال دین کو چراغ کی روشنی میں پہچان لیا۔ اور پوچھا "کہو لال دین بیٹا کیسے آنا ہوا رات کے وقت؟"

لال دین بولا "شاہ جی! آپ کی مدد لینے آیا ہوں۔"

"میں حاضر ہوں بیٹا تم حکم کرو۔" شاہ جی نے بڑی شفقت سے کہا۔

تب لال دین نے نجمی اور بادل کے بارے میں سب کہانی بیان کر دی۔ یہ بزرگ آم کے باغوں اور پرانی کوٹھی کا چوکیدار تھا۔ اس کا نام شاہ ہاشم دین تھا۔ پاکستان قائم ہوا تو جموں میں ہندو سکھوں نے مسلمانوں کا بے دریغ قتل عام شروع کر دیا تھا۔ ان فسادات میں شاہ ہاشم دین کے کنبے کے سارے افراد شہید ہو گئے تھے۔ تب سے لے کر آج تک شاہ ہاشم دین نے اللہ سے لو لگائی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں اپنے کنبے کے سارے شہیدوں کو قبرستان میں دفن کیا تھا۔ جب اس کے سارے بچے جموں میں ہی شہید ہو گئے تو شاہ ہاشم دین اکیلا پاکستان کیسے جاتا؟ اس نے اپنے شہیدوں کی قبروں کے پاس ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا اب وہ ہر جمعرات کو اپنے پیاروں کی قبروں پر جا کر دیئے جلاتا تھا۔ اور فاتحہ خوانی کرتا تھا۔ آم کے باغ والی پرانی کوٹھی محکمہ اوقاف کی ملکیت تھی۔ موسم میں شاہ ہاشم آم کے باغ کی رکھوالی بھی کرتا تھا۔ اس محکمہ نے شاہ ہاشم کو کوٹھی کی چوکیداری پر لگا دیا تھا۔

لال دین کو وہ اپنے بچوں کی طرح پیار کرتا تھا۔ لال دین کو معلوم تھا کہ شاہ ہاشم کو پاکستان سے بے پناہ محبت تھی جس کو اس نے اپنے دل میں چراغ کی طرح روشن کر رکھا تھا۔ کیونکہ اسی چراغ کی روشنی کے لیے شاہ ہاشم کے بچوں نے اپنی جانیں قربان کر ڈالی تھیں۔ وہ ہر روز نماز پڑھنے کے بعد جہاں اپنے بچوں کی روحوں کو ثواب پہنچاتا وہاں پاکستان کی ترقی کے لیے دعا مانگنا

بھی نہیں بھولتا تھا یہی وجہ تھی کہ لال دین نجمی کو شاہ ہاشم کے پاس لے آیا تھا۔

شاہ جی نے لال دین کی زبانی نجمی کی ساری داستان سنی اسے یہ بھی بتا دیا کہ بادل تین خون کرنے کے بعد پولیس کی حراست میں ہے۔

شاہ جی نے نجمی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "فکر نہ کرو بیٹی اللہ مالک ہے یہاں تم بالکل محفوظ رہو گی۔" شاہ جی نے لالٹین نکال کر جلائی۔ نجمی اور لال دین کو ساتھ لیا اور پرانی مغلئی کوٹھی کے عقبی برآمدے میں آ کر ایک پرانے کمرے کو کھول کر اندر آ گئے۔ یہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جس میں سے ایک زینہ اوپر والی منزل کو جاتا تھا اوپر والی منزل میں ایک دالان تھا جس کے ساتھ ہی ایک کمرہ تھا۔ یہ کمرہ بھی چھوٹا سا تھا اور اس کا پتھر کا فرش اکھڑا ہوا تھا۔ اس کے کونے میں ایک چارپائی بچھی تھی دو کھڑکیاں نیچے ویران باغ کی طرف کھلتی تھیں۔ ان کے لکڑی کے کیواڑ بند تھے۔ لگتا تھا یہاں کبھی کبھی کوئی آ کر رہتا رہا ہے۔

شاہ جی نے کہا "بیٹی! کبھی میں اس کمرے میں رہا کرتا تھا۔ لیکن اب میں نے نیچے جھونپڑی بنا لی ہے اپنے لیے تم بے فکر ہو کر یہاں رہو۔ صرف اتنا خیال رکھنا کہ رات کو لالٹین روشن ہو تو کھڑکیوں کے پٹ بند رکھنا دن کے وقت بہت کم باہر نکلنا اور اس وقت نکلنا کہ جب تمہیں یقین ہو جائے کہ آس پاس کوئی نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آموں کے موسم سے پہلے یہاں کوئی نہیں آئے گا پھر بھی تم جب تک یہاں رہو میں چاہتا ہوں کہ احتیاط ضروری ہے۔"

شاہ جی نے لال دین کی مدد سے کمرے میں نجمی کے لیے بستر لا کر لگا دیا۔ پھر شاہ جی نے نجمی کو غسلخانہ دکھایا جو نیچے پہلی منزل میں برآمدے کے ساتھ ہی تھا "تمہیں کھانا اور چائے وغیرہ اسی جگہ پہنچ جایا کرے گی۔ بیٹی تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ جب تک تمہارے پاکستان جانے کا بندوبست نہیں ہو جاتا تم زیادہ سے زیادہ اسی کمرے میں رہو۔ اب میں جاتا ہوں تم لوگوں نے کوئی بات کرنی ہے تو کر لو۔"

شاہ جی کے جانے کے بعد نجمی نے لال دین سے کہا "صورتحال مختلف ہو گئی ہے۔ میں بادل خان کو پولیس کے تشدد میں چھوڑ کر پاکستان واپس نہیں جا سکتی۔"

لال دین کہنے لگا "بہن جی! ابھی آپ کا پاکستان جانا بھی یقینی نہیں ہے۔ بارڈر پہ دونوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرف توجہ بیٹھی ہے۔ میرا دوست تمھیں بارڈر کراس نہیں کروا سکتا۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ بادل کسی طرح سے باہر آ جائے اس کے بعد تم جو فیصلہ کرو گے مجھے منظور ہو گا۔"

نجمی نے کہا "بھائی تمھاری کوشش سے بادل کیسے باہر آ جائے گا تمھارے کہنے کے مطابق پولیس نے اس کا ریمانڈ لے لیا ہے اس کے بعد بادل کے خلاف مقدمہ چلے گا اور اسے قید ہو جائے گی یا وہ پھانسی چڑھ جائے گا اس نے تین پولیس کے سپاہیوں کو قتل کیا ہے۔"

لال دین نے سر جھکا لیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا نجمی کہہ رہی تھی "معاف کرنا بھائی صاحب آپ خود پولیس کی نظروں میں ہیں۔ آپ بادل کی کیا مدد کر سکیں گے۔ پولیس کو ذرا سا بھی شک پڑ گیا کہ آپ کا بادل سے کوئی تعلق ہے تو وہ آپ کو بھی پکڑ لے گی۔"

لال دین نے نجمی کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا "بہن جی! بادل کو میں آپ سے بہت پہلے کا جانتا ہوں۔ ہم نے زندگی کا ایک لمبا عرصہ اکٹھا گزارا ہے۔ میں نے پولیس کا ایسا ایسا تشدد برداشت کیا ہے کہ اگر میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو ایک ہزار ایک مرتبہ آپ کا نام لے دیتا لیکن میری زبان پہ چپ ہی لگی رہی۔ میں نے الٹے لٹکے ہوئے اپنے سر پہ ڈنڈوں کی مار سہتے ہوئے بھی یہی کہا کہ میرے پاس کوئی پاکستانی جاسوس کبھی نہیں آیا۔"

نجمی نے کہا "میں تمھارے اس کردار کی تعریف کرتی ہوں حقیقت یہ ہے کہ ہم سب اسی کردار کے مالک ہیں ہم ڈاکو سہی مگر ہم جو عہد کرتے ہیں جو قول دیتے ہیں اس پہ مر مٹتے ہیں تمھاری جگہ اگر بادل ہوتا یا میں ہوتی تو ایسا ہی کرتی۔ یہ کوئی عظیم بات نہیں ہے بلکہ ہمارے کردار کا تقاضا ہی یہی ہے۔ اب مجھے بتاؤ بھائی صاحب کہ تم ان حالات میں بادل کی کیا اور کیسے مدد کر سکتے ہو؟"

لال دین بولا "میں کل بتاؤں گا ابھی تم آرام کرو میں کل دن کے وقت نہیں بلکہ رات کے وقت آؤں گا ابھی تم آرام کرو۔"

لال دین کے جانے کے بعد نجمی بستر پہ بیٹھی دیر تک بادل خان کے بارے میں سوچتی رہی۔ پھر کمبل اوڑھ کر سو گئی۔

دوسرا دن اس کا پرانی کوٹھی کی دوسری منزل والے اس کمرے میں ہی گزر گیا۔ شاہ جی صبح کے

وقت اسے چائے اور بند دے گئے دوپہر کو روٹی اور ساگ لے کر آ گئے۔ شام کو بھی نجمی نے وہی ساگ روٹی کھائی۔ شاہ جی اسے رات کو لالٹین بجھا دینے کی تاکید کر کے چلے گئے۔

دس بجے رات کو لال دین آ گیا اس نے بتایا کہ بادل خان کا ریمانڈ کل ختم ہو رہا ہے کچھ پتہ نہیں پولیس نے اس سے کیا کچھ معلوم کیا ہے۔ بہرحال قتل کے الزام میں تو اس پہ مقدمہ ضرور چلے گا۔

نجمی نے تڑپ کر کہا "آخر تم کیا سوچ رہے ہو؟ اور اگر بادل پہ مقدمہ ہی چلنا ہے تو پھر مجھے یہاں کس لیے رکھا گیا ہے؟ اس سے تو بہتر ہے کہ میں خود بادل خان کو جیل سے فرار کروانے کی کوشش کروں میں ایسا کر سکتی ہوں۔"

لال دین ذرا سا مسکرایا اور ہاتھوں کو ملتے ہوئے بولا "بہن جی! ذرا صبر سے کام لیں میرے بھی کچھ بازو ہیں جب تک میں زندہ ہوں آپ کو تکلیف نہیں کرنی پڑے گی۔ بادل خان کو حوالات سے جیل میں جانے دو پھر میں اسے وہاں سے نکلوا لوں گا۔"

اتنے میں شاہ جی وہاں آ گئے۔ کہنے لگے "میری ایک منہ بولی بیٹی کے ہاں سے پیغام آیا ہے کہ وہ سخت بیمار ہے میں اس کی طرف جا رہا ہوں۔ لال دین! تم آج کی رات یہیں ٹھہر جاؤ۔"

اس پہ نجمی نے قدرے ترش روئی سے کہا "ان بھائی صاحب کے ٹھہرنے کی ضرورت نہیں ہے شاہ جی! میں اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔"

شاہ جی خاموش رہے اور چلے گئے لال دین جانتا تھا نجمی کس مزاج کی عورت ہے اس نے بھی وہاں ٹھہرنے پہ اصرار نہ کیا جاتی دفعہ صرف اتنا کہا کہ اپنا خیال رکھنا بہن جی! یہ علاقہ کچھ ویران ہے۔

نجمی نے پھنکار کی طرح سانس چھوڑتے ہوئے کہا "تم فکر نہ کرو۔"

لال دین چلا گیا نجمی کو اس آدمی پہ شروع ہی سے کوئی خاص بھروسہ نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ شخص بادل کو جیل سے فرار نہیں کروا سکے گا۔ اور وہ پھانسی چڑھ جائے گا۔ اس لیے اسے غصہ آ رہا تھا۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد نجمی نے لالٹین کی روشنی میں سرہانے کے نیچے سے پستول نکالا کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھولا۔ اس کی گولیوں کو چیک کیا۔ دوبارہ بند کر کے سرہانے کے نیچے رکھا۔ اٹھ کر دروازے کی اندر سے کنڈی لگائی اور لالٹین بجھا کر بستر پر لیٹ گئی۔

رات کا تاریک سناٹا جیسے باہر آم کے کالے باغ میں سنسنا رہا تھا۔ نجمی کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ دیر تک بستر پر پہلو بدلتی رہی۔ اس وقت آدھی رات گزر چکی تھی کہ جہاں آم کے باغ کی حد شروع ہوتی تھی وہاں ایک جیپ آ کر رکی اس میں سے تین آدمی جنھوں نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔ خاموشی سے اتر کر اندھیرے میں پرانی کوٹھی کی طرف بڑھے۔

- - ؎ - -

ایک آدمی جیپ میں ہی بیٹھا رہا۔

یہ تینوں پراسرار آدمی جنھوں نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے اور کاندھے سے رائفلیں لگی تھیں، ہاتھوں میں ریوالور لیے رات کے اندھیرے میں آم کے درختوں کے نیچے سے ہوتے، پرانی منحوس کوٹھی کی طرف بڑھ رہے تھے جس کی دوسری منزل پر نجمی نیند اور بیداری کے درمیان جھول رہی تھی۔ جیپ کی دھیمی آواز اس نے ایسے سنی تھی جیسے خواب میں یہ آواز آئی ہو۔ اس پر نیند کا غلبہ تھا۔ تینوں آدمی ایسے چل رہے تھے جیسے وہ وہاں کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ اندھیرا بھی ان کی راہ میں حائل نہیں ہو رہا تھا۔

ایک آدمی کوٹھی کے سامنے والے برآمدے میں ایک طرف ریوالور لے کر کھڑا ہو گیا۔ باقی دونوں بھی برآمدے کے پاس آ گئے۔ اوپر منزل کو جانے والی سیڑھی خالی پڑی تھی۔ اس کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ دونوں آدمی ایک دوسرے کے پیچھے دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل کے دالان میں آ گئے۔ یہاں اندھیرا تھا۔ دروازہ بند تھا اندر نجمی اب نیند کی آغوش میں تھی۔

دونوں دبے پاؤں چل کر دروازے کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے پھر انھوں نے بند دروازے کے ساتھ کان لگا کر اندر کوئی آواز سننے کی کوشش کی۔ مگر اندر خاموشی چھائی ہوئی تھی وہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے پھر ایک ساتھ پانچ قدم پیچھے ہٹے، رکے اور پھر ایک ساتھ کندھوں کے بل دوڑ کر آئے اور پوری طاقت سے بند دروازے سے ٹکرا گئے۔ دھڑام کی آواز کے ساتھ دروازے کا پرانا پٹ ٹوٹ کر گر پڑا۔

نجمی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اندھیرے میں اسے دو آدمیوں کے سائے چھلانگ لگا کر اندر آتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نظر آئے۔ اس کا ہاتھ بجلی کی تیزی کے ساتھ سرہانے کے نیچے رکھے پستول کی طرف گیا۔ مگر اتنی دیر میں دونوں آدمی اس کے اوپر چھلانگ لگا کر اسے دبوچ کر قابو میں لے چکے تھے۔ عورت چاہے دلاور ہی کیوں نہ ہو جسمانی طور پر مرد کے مقابلے میں کمزور ہوتی ہے۔ وہ دلیری اور جرأت میں مرد سے آگے نکل سکتی ہے مگر جسمانی طاقت میں وہ مرد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ دونوں مرد طاقتور اور پہلوان ٹائپ کے تھے۔ انھوں نے نجمی کو پوری طرح سے اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ نجمی نے چیخنا چاہا لیکن اس کے منہ کو سب سے پہلے ہاتھ رکھ کر بند کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ ان لوگوں کو معلوم تھا کہ شاہ جی اپنی جگہ میں نہیں ہیں پھر بھی وہ احتیاط سے کام لے رہے تھے۔ آن کی آن میں انھوں نے نجمی کے منہ میں کپڑے کا گولا ٹھونس دیا۔ دونوں ہاتھ رسی سے پیچھے باندھ دیئے اور اسے گریبان سے پکڑ کر چارپائی سے نیچے کھینچ لیا۔ پھر اسے گھسیٹتے ہوئے نیچے لے آئے جہاں ان کا تیسرا آدمی بھی ریوالور لیے ان میں شامل ہو گیا۔ نجمی نے ان کی گرفت سے نکلنے کی بہت کوشش کی لیکن بہت جلد اس نے ہتھیار پھینک دیئے۔ اب دو آدمیوں نے نجمی کو ڈولی ڈنڈا کر کے اٹھا لیا تھا۔

جیپ آم کے باغ کے باہر ستاروں کی دھندلی روشنی میں بالکل تیار کھڑی تھی۔ نجمی کو جیپ میں آلوؤں کی بوری کی طرح پھینک کر اس کے اوپر ترپال ڈال دی گئی۔ تینوں آدمی اسے دبوچ کر اوپر بیٹھ گئے اور جیپ اندھیرے میں دریائے توی کے پل کی طرف جانے کی بجائے دوسری طرف کو روانہ ہو گئی۔ ترپال کے نیچے نجمی کا دم گھٹنے لگا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا ہوا تھا۔

وہ دو تین بار تڑپی تو ایک آدمی نے دوسرے سے کہا: "اب اس کے منہ سے کپڑا نکال دو۔" دوسرے آدمی نے ترپال کے نیچے ہاتھ ڈالا اور نجمی کے منہ سے کپڑا کھینچ کر نکال دیا۔ نجمی ہانپنے لگی۔ جلدی جلدی سانس لینے لگی۔ اس کا گلا خشک ہو کر لکڑی کی طرح ہو گیا تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ کون لوگ ہیں۔ انسے کہاں لیے جا رہے ہیں اور اسے کس غرض سے اغوا کیا گیا ہے۔

ایک بات صاف ظاہر تھی کہ یہ پولیس کے آدمی نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کو خبر کس نے دی کہ پرانی کوٹھی میں ایک عورت اکیلی موجود ہے۔ نجمی کا ذہن کچھ سوچ رہا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ یہ چاروں ہندو جرائم پیشہ ڈوگرہ تھے جو علاقے کے ایک نامی گرامی بدمعاش

اور بردہ فروش ست پال کے آدمی تھے۔ ست پال ہماچل پردیش اور جموں کشمیر کے علاقے میں ناجائز منشیات کا کاروبار بھی کرتا تھا اور اس کا جنوب مشرقی ایشیا کے ایک بہت بڑے بردہ فروش گینگ سے بھی تعلق تھا۔ ست پال بے سہارا، گھر سے بھاگی ہوئی مظلوم لڑکیوں کو اغوا کر کے جموں سے اپنے خاص آدمیوں کے ذریعے جلنگ پہنچا دیتا تھا جہاں مشرق بعید کے گینگ کے ایجنٹ ڈالروں کی کرنسی میں رقم ادا کر کے عورتیں خرید کر لے جاتا تھا۔ ست پال اس سے پہلے کتنی ہی لڑکیوں کو اغوا کر کے مشرق بعید کے ممالک میں پہنچا چکا تھا جہاں وہ امیر و کبیر افیونی جاگیرداروں کے تہہ خانے میں لونڈیوں کی زندگیاں بسر کر رہی تھیں۔

نجمی کے بارے میں بھی اس کے مخبروں نے ست پال کو خبر کر دی تھی کہ ایک گھر سے بھاگی ہوئی عورت پرانی کوٹھی میں آ کر ٹھہری ہے جسے شاہ ہاشم نے مسلمان ہونے کی وجہ سے پناہ دے رکھی ہے۔ ست پال نے اسی وقت ایک اسکیم تیار کی۔ شاہ ہاشم جی کو اس کی منہ بولی بیٹی کی بیماری کی جھوٹی خبر پہنچائی۔ جب شاہ جی جھگی سے چلے گئے تو ست پال نے اپنے آدمی بھیج کر نجمی کو اغوا کروا لیا۔ اسے بالکل معلوم نہیں کہ نجمی حقیقت میں بنگال کی وہ نامی گرامی چندا ڈکیت ہے جس کی پولیس کو تلاش ہے۔ شمالی ہندوستان کے اس علاقے تک چندا کی خبریں اتنی تفصیل سے نہیں پہنچی تھیں۔

راتوں رات نجمی کو ست پال کے خفیہ اڈے پر پہنچا دیا گیا جو جموں شہر سے دور جمبہ پٹھانکوٹ والی سڑک پر پہاڑیوں کے درمیان ایک پرانی حویلی میں واقع تھا۔ ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں نجمی کو پھینک کر اور باہر سے تالا لگا کر ست پال کے آدمی چلے گئے۔ ست پال اس وقت مے نوشی میں مشغول تھا۔ اس کے آدمیوں نے جا کر اطلاع کر دی کہ "مال" کوٹھری میں ڈال دیا گیا ہے۔

ست پال نے اپنے آدمیوں کو انعام دے کر کہا: "جاؤ دوسرے ساتھیوں کے ساتھ پہرے پر کھڑے ہو جاؤ۔"

اس کے ساتھ ہی ست پال نے بھرا ہوا ریوالور صدری کی جیب میں رکھا اور اس کوٹھری کی طرف چلا گیا۔ اندھیرے میں نجمی جھلنگا سی کھاٹ پر بیٹھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی کہ یہاں سے فرار کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ اس کے ہاتھ ابھی تک پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ ست پال تالا کھول کر اندر آ گیا۔ نجمی نے ایک لحیم شحیم آدمی کے سائے کو اندر آتے دیکھا تو تیز لہجے میں پوچھا کہ اسے یہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیوں لایا گیا ہے؟ ست پال نے اس کی بات جیسے سنی ہی نہیں تھی۔ وہ کوٹھڑی کے طاق کی طرف بڑھا۔ ماچس جلا کر طاق میں رکھی لالٹین روشن کی۔ لالٹین کی دھیمی روشنی میں نجمی نے دیکھا کہ کچھ سفید اور کچھ سیاہ بالوں والا ایک اونچا، لمبا، بھاری بھرکم آدمی طاق کے پاس کھڑا آگے پیچھے جھول رہا تھا۔

نجمی کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس نے پی رکھی ہے۔ وہ ایسے کئی پُرعذاب مرحلوں سے گزر چکی تھی۔ ست پال جھومتا ہوا نجمی کے پاس آیا اور صدری اوپر اٹھا کر اس نے منہ سے ایک لفظ بولے بغیر صدری کی جیب سے نائیلوں کی رسی نکالی۔ نجمی کے منہ پر الٹے ہاتھ کا بھرپور تھپڑ مار کر اسے چارپائی پر گرا دیا اور پھر اس کا پاؤں چارپائی کی پائنتی کی طرف باندھنے لگا۔ نجمی پوری طاقت کے ساتھ چارپائی پر سے اچھلی مگر بندھے ہوئے ہاتھ اسے کچھ نہیں کرنے دے رہے تھے۔ ست پال نے ایک اور زوردار تھپڑ نجمی کو رسید کر دیا۔ ساتھ ہی نجمی کی دوسری ٹانگ بھی پائنتی کے ساتھ رسی سے باندھ دی۔

پھر اس نے ریوالور نکالا اور چارپائی کے پاس رکھے اسٹول پر بیٹھ کر جھومتے ہوئے بولا ”آج سے تیرا نام کملا ہے۔“ نجمی کا کھولتا ہوا خون اس کی آنکھوں میں آگیا مگر وہ بے بس تھی۔ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ ست پال نے آہستہ آہستہ ریوالور کا دستہ نجمی کی ناک پر مارنا شروع کر دیا۔ ”تمہاری ناک توڑ کر یہاں نئی ناک لگائی جائے گی۔“

نجمی درد کے مارے تڑپ اٹھی۔ ست پال نے قہقہہ لگا کر ریوالور اوپر اٹھا لیا اور بولا ”مگر تمہاری ناک تو خوبصورت ہے کملا! میں ست پال ہوں تمہارا پتی دیو۔ تم میری پوجا کرو۔ میری آرتی اتارو۔ میں تمہارا پتی دیو ہوں۔“

اور ست پال ہنسنے لگا۔ اس کی توند اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ نجمی نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے اس مکروہ صورت عفریت سے نفرت ہو رہی تھی۔ اگر اس کے ہاتھ کھلے ہوتے تو وہ کم از کم اس عفریت کو جہنم میں پہنچانے کی کوشش ضرور کرتی۔

رات گزر گئی۔ دوسرے دن ایک آدمی نے آکر نجمی کی ٹانگوں کی رسیاں کھول ڈالیں پھر اس کے ہاتھوں کو بھی کھول دیا اور ایک غسل خانے میں دھکا دے کر دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔

تین دن اور تین راتیں نجمی اس قید خانے کی اندھیری کوٹھڑی میں پڑی رہی۔ چوتھے دن کی آدھی رات کو ست پال کے آدمی نجمی کی کوٹھڑی میں آئے۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس کے منہ میں رومال ٹھونسا اور اسے اٹھا کر باہر لے گئے۔

باہر ایک بند ویگن کھڑی تھی جس پر شیواجی ایمبولینس انگریزی اور ہندی میں لکھا ہوا تھا۔ نجمی کو اٹھا کر ایمبولینس میں ڈال کر ویگن کا دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا گیا اور ویگن رات کے اندھیرے میں کانگڑا کی طرف روانہ ہو گئی۔

کانگڑا پہنچنے کے بعد ایمبولینس کے اندر ہی ست پال کے ایک خاص آدمی نے نجمی کو ایک ایسا انجکشن لگایا جس سے اس کا جسم سن ہو گیا۔ وہ دیکھ سکتی تھی۔ سن سکتی تھی مگر بول نہیں سکتی تھی اور اپنے ہاتھ پیر بھی نہیں ہلا سکتی تھی۔ اب اس کے منہ سے رومال نکال دیا گیا اور اس کے ہاتھ پیر بھی کھول دیئے گئے۔ اسے گلوکوز کا ڈرپ لگا دیا گیا تاکہ اس کی توانائی بحال رہے۔

ایمبولینس کانگڑا سے نکل کر منڈی کی طرف چل پڑی۔ منڈی میں نجمی کو ایک دوسری ایمبولینس میں لٹا دیا گیا۔ اب منزل شملہ تھی۔ شملے میں نجمی کو ایک ویران کوٹھی میں دن بھر رکھا۔ رات کے وقت اسے ایک بار پھر ایمبولینس میں لٹا کر چنڈی گڑھ کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ چنڈی گڑھ میں ست پال پہلے سے موجود تھا۔ یہاں بھی نجمی کو شہر سے باہر ایک گمنام سی کوٹھی میں رکھا گیا۔ یہاں پہنچتے پہنچتے انجکشن کا اثر ختم ہو گیا تھا۔ نجمی کے پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ وہ اس ناگہانی آفت سے نڈھال ہو چکی تھی۔ پہلے سے کمزور بھی ہو چکی تھی۔

چنڈی گڑھ کی اس کوٹھی میں نجمی کو پورے پندرہ دن رکھا گیا۔ اسے بہتر سے بہتر خوراک دی گئی۔ پندرہ دنوں تک ست پال اس کے سامنے نہ آیا۔ صرف اس کے جلاد صورت کارندے ہی اس کی دیکھ بھال اور نگرانی کرتے رہے۔ نجمی بھی چپ تھی اور کسی طرح سے وہاں سے بھاگنے کے متعلق مسلسل سوچ رہی تھی مگر جن لوگوں کے وہ قبضے میں تھی وہ اسے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی جگہ سے ہلنے نہیں دیتے تھے۔ ایسے سنگدل اور ظالم لوگوں سے نجمی کا پہلی بار واسطہ پڑ رہا تھا۔

یہاں سے نجمی کو ہوائی جہاز میں سوار کروا کر آسام کے دارالحکومت دارجلنگ پہنچانا تھا۔ ست پال نے اپنے چار آدمیوں کے علاوہ نجمی کا بھی ہوائی جہاز کا ٹکٹ لے لیا تھا۔ فلائیٹ رات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بارہ بجے کی تھی۔

پورے گیارہ بجے چار آدمی نجمی کے کمرے میں آئے اسے زبردستی قابو کرکے اس کو پھر وہی انجکشن لگا دیا جس کے لگاتے سے نجمی پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی مگر نہ بول سکتی تھی نہ ہاتھ پاؤں ہلا سکتی تھی۔

ست پال کے ساتھی کھدر کے لباس میں ملبوس تھے۔ ست پال نے نجمی کو دھرم پتنی ظاہر کیا جو بیمار تھی اور جس کے علاج کے لیے وہ اسے دارجلنگ لے جا رہا تھا۔

رات ٹھیک بارہ بج کر دس منٹ پر جہاز چنڈی گڑھ ائر پورٹ سے دارجلنگ کے لیے ٹیک آف کر گیا۔ نجمی سکتے کے عالم میں جہاز پر اسٹریچر پر پڑی تھی۔ کسی نے اس کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔ اس قسم کے مریض جہازوں میں سفر کرتے ہی رہتے تھے۔ دارجلنگ پہنچ کر ست پال اور اس کے آدمی نجمی کو اسٹریچر پر ڈال کر ائیر پورٹ سے باہر لے آئے۔ باہر انٹرنیشنل بردہ فروشوں کے دو ٹھگنے قد مگر مضبوط جسم کے آدمی انگریزی سوٹ پہنے پہلے سے گاڑی لیے موجود تھے۔ نجمی کو گاڑی کی پچھلی نشست پر ڈال دیا گیا اور گاڑی پچھلے پہر کی تاریکی میں ایک پہاڑی مقام کی طرف روانہ ہو گئی۔

یہ پہاڑی مقام دارجلنگ شہر سے بیس پچیس میل کے فاصلے پر بانس اور چیل کے درختوں کی ڈھلانوں والی پہاڑیوں کے درمیان واقع تھا۔ یہاں ایک ٹیلے کے پہلو میں بانس کے جھنڈوں میں گھرا ہوا ایک چھوٹا سا کاٹیج تھا۔ اس کاٹیج میں سامبا نام کا ایک چوڑے نتھنوں اور باریک آنکھوں والا آسامی اسمگلر پہلے سے "مال" وصول کرنے تیار بیٹھا تھا۔ نجمی ابھی تک سکتے کی حالت میں تھی۔ اسے کاٹیج کے ایک کمرے میں پلنگ پر لا کر ڈال دیا گیا۔ ست پال اور سامبا اس کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ ست پال نے کہا "سامبا اس بار بالکل تازہ مال لایا ہوں۔ لڑکی جوان اور خوبصورت ہے اس کا رنگ بھی گورا ہے۔"

سامبا نے نجمی کا اس طریقے سے معائنہ کیا جس طرح قصائی بکرا خریدتے وقت کرتا ہے۔ پھر ست پال کی طرف دیکھ کر بولا "لڑکی کی عمر زیادہ ہے۔"

ست پال نے فوراً کہا "اتنی زیادہ بھی نہیں ہے سامبا جی!"

سامبا ست پال کو دوسرے کمرے میں لے گیا اسے مشروب پیش کیا اور پھر دس ہزار پر سودا ہو گیا۔ روپے لے کر ست پال اپنے آدمیوں کے ساتھ دارجلنگ سے واپس جموں کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب نجمی سامبا اور اس کے بدمعاشوں کی تحویل میں تھی۔ چوبیس گھنٹے کے بعد ٹیکے کا اثر ختم ہو گیا۔ نجمی نے ہوش میں آتے ہی دیکھا کہ اس کے پاؤں میں لوہے کی ایک مضبوط زنجیر ہے جس کا سرا کمرے کے وسط میں گڑھے ہوئے لوہے کے کھمبے کے ساتھ بندھا ہے۔ زنجیر اتنی لمبی تھی کہ وہ کمرے میں چل پھر سکتی تھی۔ کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی اس کی دیواریں پتھر کی تھیں اس کے دو دروازے تھے۔ ایک دروازہ باہر برآمدے میں کھلتا تھا اور دوسرا دروازہ غسل خانے کا تھا۔ غسل خانے میں اوپر ایک چھوٹا روشندان تھا جس میں آہنی سلاخیں لگی تھیں۔ ان سلاخوں میں سے ایسی روشنی آ رہی تھی جیسے سورج غروب ہو چکا ہو۔ نجمی نے منہ ہاتھ دھویا۔ وہاں کوئی آئینہ نہیں لگا تھا۔ ایک کنگھی پڑی تھی۔ نجمی نے اپنے بالوں میں کنگھی پھیری اور زنجیر کو جھنجھناتی واپس کمرے کے وسط میں بچھی ہوئی بانس کی چارپائی پر آ کر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور تین آدمی اندر داخل ہوئے تینوں ناٹے قد کے تھے۔ ان کے چہرے آسامیوں کی طرح چپٹے تھے۔ انھوں نے رنگدار بش شرٹیں اور جینز پہن رکھی تھیں دو آدمیوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ تیسرے کے ہاتھ میں کھانے کا ٹرے تھا۔ دونوں مسلح آدمی دروازہ بند کر کے پستول لیے کھڑے ہو گئے تیسرے نے نجمی کے آگے کھانا رکھا اور پھر تینوں باہر نکل گئے۔ نجمی کو باہر تالا لگانے کی آواز آئی۔

نجمی ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گئی۔ اسے سخت بھوک لگ رہی تھی اس نے ٹرے کی طرف دیکھا۔ ٹرے میں بھنی ہوئی چھوٹی مرغی، مرغی کا سوپ، چاول اور ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا جگ پڑا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ ست پال اسے سامبا کے پاس فروخت کر کے چلا گیا ہے اور چونکہ سامبا کو اسے آگے کسی سیٹھ یا جاگیردار کے پاس فروخت کرنا ہے اس لیے اسے بہتر سے بہتر غذا دی جا رہی ہے تاکہ اس کی خوبصورتی بحال رہے اور سامبا اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کر سکے۔ نجمی نے مایوسی اور ناامیدی کے خیالات کو جھٹک دیا اور ڈٹ کر کھانا کھایا۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ جہاں سے اور جب بھی اسے فرار کا موقع ملا تو وہ واپسی کے سفر میں اپنے ان دشمنوں سے پورا پورا انتقام لے گی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رات کو اس کے لیے چارپائی پر آرام دہ بستر لگا دیا گیا۔ نجمی کو دارجلنگ کے نواح میں واقع اس کاٹیج نما قید خانے میں پندرہ روز تک رکھا گیا۔ اس دوران اسے بہترین کھانا کھلایا گیا۔ رات کو سونے سے پہلے اسے انناس کا جوس بھی بلا ناغہ پلایا جاتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پندرہ دنوں میں ہی نجمی کی صحت پہلے سے بہتر ہو گئی۔ اس کا رنگ نکھر آیا اور چہرے پر بھی چمک آ گئی۔ اسے کمرے سے باہر ایک بار بھی نہیں نکالا گیا تھا اور پاؤں میں بندھی ہوئی زنجیر کو جرائم پیشہ مرد دن میں دو بار چیک کر لیتے تھے۔ جس بردہ فروش ساما بانے نجمی کو خریدا تھا وہ اس عرصے میں صرف ایک بار نجمی کے پاس آیا۔ اس کا اچھی طرح سے معائنہ کیا اور چلا گیا۔ نجمی نے اسے کہا کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ وہ اسے اس زیادہ رقم ادا کرے گی مگر ساما با نے اس کی بات پہ دھیان نہ دیا اور نجمی کو ہر طرف سے جانچتا اور پرکھتا رہا کہ اچھی خوراک اس پر کیا اثر کر رہی ہے۔

اس طرح نجمی کو وہاں بیس روز گزر گئے۔ نجمی کی نگرانی دن کے وقت سات آدمی کرتے تھے۔ جن کے پاس رائفلیں بھی تھیں اور آسام کے تلوار نما چھرے بھی تھے جیسے وہ کرکری بھی کہتے تھے۔ رات کے وقت کاٹیج کے ارد گرد آگ کا الاؤ روشن کر کے دس آدمی پہرے پہ بیٹھ جاتے۔ ان لوگوں کو خاص طور پر رات کو شراب پینے سے منع کر دیا گیا تھا۔ نجمی نے بہت غور و فکر کیا لیکن وہاں سے فرار کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ غسل خانے کا روشندان اونچا تھا ویسے بھی اس میں لوہے کی سلاخیں لگی تھیں جنھیں نجمی بغیر کسی ہتھیار کے نہیں کاٹ سکتی تھی۔ آخر ایک روز نجمی کے لیے سرخ رنگ کی ریشمی ساڑھی اور نقلی سونے کے زیور اور پھولوں کے ہار اور گجرے لے کر ایک بوڑھی عورت اندر آئی۔ وہ سوائے آسامی زبان کے اور کوئی زبان نہیں جانتی تھی۔

نجمی سمجھ گئی کہ اسے آگے کسی کے ہاتھ بیچا جا رہا ہے۔ اس نے کوئی احتجاج نہ کیا اور خاموشی سے نئے کپڑے پہن لیے۔ اب وہ بھی اس قید خانے سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔ شاید آگے کسی نئے ماحول میں جا کر اسے فرار کا موقع مل جائے۔ یہ اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ آگے وہ کس قسم کے بھیانک ماحول میں جا رہی ہے۔ ریشمی ساڑھی پہن کر اس نے بال بنائے۔ آسامی عورت اس کی مدد کر رہی تھی۔ بالوں میں گجرے باندھے گئے۔ گلے میں نقلی سونے کے زیور پہنے، پاؤں میں موتیوں والی چپل پہنی۔ جب آسامی عورت نے نجمی کو شیشہ دکھایا تو نجمی کو اپنی شکل بڑی خوبصورت لگی۔ اسے کئی سال پہلے

لاہور والی نجمی یاد آ گئی۔ نجمی نے جلدی سے شیشہ پرے ہٹا دیا۔ وہ لاہور والی نجمی کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

تیسرے پہر ساما با ایک گول مٹول کالے رنگ کے پھولی ہوئی توند والے آدمی کو لے کر اندر آیا جس نے سلک کا کرتہ اور سلک ہی کی دھوتی پہن رکھی تھی۔ ماتھے پر لال تلک لگا تھا۔ گلے میں چھوٹا سا چمڑے کا بیگ لٹک رہا تھا اس نے آتے ہی نجمی کی طرف گھورنا شروع کر دیا۔ اس وقت کمرے میں سو واٹ کا بلب روشن تھا۔ اور نجمی شاندار ریشمی بستر پر بیٹھی تھی۔ نجمی بھی جان بوجھ کر اس کالے بھجنگ ہندو کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ وہ تو بے حد خوش ہوا۔ ساما با بھی بہت خوش ہوا۔ کیونکہ اس طرح سے نجمی کی قیمت میں اضافہ ہو سکتا تھا۔

ساما با نے نووارد ہندو سے انگریزی میں کہا "ایسا مال سارے انڈیا میں اس وقت نہیں ہے مہنگے دام دے کر اسے لکھنؤ سے خریدا ہے۔ ویسے یہ پنجاب کی رہنے والی ہے اور اس کا نام کملا ہے۔"

موٹے کالے بھجنگ ہندو نے دانت نکال کر کہا "دودھ مکھن کی پلی ہوئی معلوم ہوتی ہے" یہ کالا بھجنگ ہندو شکل صورت سے تامل لگتا تھا اس کا انگریزی بولنے کا لہجہ بھی جنوبی ہند کے لوگوں جیسا تھا۔

نجمی نے بھی انگریزی میں کہا "وہ شخص خوش قسمت ہو گا جو مجھے اپنے پاس رکھے گا۔" ہندو کالے بھجنگ کو تو حیران ہونا ہی تھا لیکن ساما با کا تو حیرت کے مارے منہ کھل گیا اس کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ جس لڑکی کو وہ ناجائز طور پر فروخت کر رہا ہے وہ اپنی فروخت پر اتنی خوش ہو گی اور انگریزی زبان بھی جانتی ہو گی۔ ساما با کو موقع مل گیا جھٹ ہندو تامل کی طرف دیکھ کر بولا "دیکھا۔ کملا پڑھی لکھی بھی ہے۔ ایم اے پاس ہے وہ خود کہتی ہے کہ مجھے جو اپنے پاس رکھے گا میں اسے خدمت کر کے خوش کر دوں گی۔"

کالے بھجنگ تامل نے ساما با کا ہاتھ پکڑا اسے باہر لے گیا۔ ان کے باہر نکلتے ہی ساما با کے آدمیوں نے دروازہ بند کر کے باہر تالا لگا دیا اور پہرہ بیٹھ گیا۔ اسی رات نجمی کو وہاں سے نکال کر اگلی منزل کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ نجمی کو کیا خبر کہ ساما با نے اسے پچاس ہزار کے عوض خلیج بنگال میں واقع

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انڈیمان کے اوپر شمال میں لینڈ فال نام کے ایک دور افتادہ جزیرے کے بہت بڑے چائے، کوکو اور کافی فارم کے ایک مرہٹہ نژاد جاگیردار کاٹل کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے۔ ہندو تامل اس مرہٹہ جاگیردار کاٹل کا ایجنٹ تھا اور ایک لاکھ روپیہ لے کر اپنے مالک کے لیے کوئی خوبصورت عورت خریدنے آیا تھا۔ اس کے ساتھ جاگیردار کاٹل کے باڈی گارڈز کا پورا دستہ آیا ہوا تھا۔ نجمی کو اس دستے کی نگرانی میں دارجلنگ سے خلیج بنگال کے دور افتادہ، عین سمندر کے بیچ میں واقع جزیرے لینڈ فال جانا تھا۔ لینڈ فال نامی جزیرہ زیادہ بڑا نہیں تھا اور سارے کا سارا کافی اور گرم مسالوں کے درختوں سے بھرا ہوا تھا۔ مرہٹے کاٹل کے دادا نے انگریزوں سے یہ جزیرہ اس زمانے میں ستر ہزار روپے میں خرید لیا تھا۔ انگریزوں کے جانے کے بعد اس جزیرے پر بھی انڈیا نے قبضہ کر لیا لیکن مرہٹہ جاگیردار کاٹل نے انڈین گورنمنٹ سے یہ جزیرہ بارہ لاکھ روپے کے عوض لیز پر لے لیا۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے صرف یہ شرط لکھوائی کہ جزیرے کی کل پیداوار کا ایک بٹہ تین حصہ اسے دیا جائے گا۔ یہ سودا مرہٹے جاگیردار کاٹل کو مہنگا نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے بھی یہ شرط لکھوائی کہ جزیرے پر اس کا اپنا حکم چلے گا اور انڈین گورنمنٹ اس میں دخل نہیں دے گی۔ ہندوستان کی حکومت نے خفیہ طور پر کاٹل سے اس ہدایت کے بعد معاہدہ کر لیا کہ جزیرے کا امن امان خراب نہیں ہوگا چنانچہ اب اس چھوٹے سے جزیرے میں کاٹل کی اپنی فوج تھی۔ اپنا جیل خانہ تھا۔ پولیس کا بھی اپنا انتظام تھا۔ جزیرے میں امن وامان بحال رکھنے کے نام پر وہ انڈیا سے خفیہ طور پر ۔ اسلحہ بھی خریدتا تھا۔

انڈین گورنمنٹ نے محض نام رکھنے کی خاطر وہاں اپنا ایک بنگالی پولیٹیکل ریجنٹ چھوڑا تھا جو جزیرے کے مالک کاٹل کے احسانات کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا اور اسے شراب وکباب ہی سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ کاٹل نے اپنی چھوٹی سی فوج اور پولیس میں زیادہ تر گورکھے بھرتی کر رکھے تھے۔ باقی مرہٹہ تھے۔ مہاراشٹر ہی سے اس نے مرہٹہ مزدوروں اور کاشتکاروں کے کنبے بھی منگوا کر جزیرے میں آباد کروا لیے تھے وہ انھیں ہر قسم کی سہولت دیتا تھا۔

خود مرہٹہ تھا اس لیے مرہٹوں کا بے حد خیال رکھتا تھا۔ جزیرے کے درمیان ایک جگہ اس نے اپنے لیے شاندار محل نما بہت خوبصورت اور بہت بڑا بنگلہ بنوا رکھا تھا۔ اس بنگلے میں ہر قسم کی جدید سہولت موجود تھی۔ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ عمر پچاس کے قریب پہنچ چکی تھی۔ وہ ایک بھینسے کی

طرح مضبوط تھا۔ اس نے اپنے محل میں بیس عورتیں ڈال رکھی تھیں جن میں آسامی، برمی، بنگالی اور سیلون کی عورتیں بھی تھیں۔ نجمی پہلی پنجابی عورت تھی جو اس کے محل میں داخل ہو رہی تھی۔ چونکہ اس جزیرے کا موسم گرم تھا اور حبس بے پناہ ہوتا تھا اس لیے کاٹل ہمیشہ سفید لٹھ شرٹ اور سفید تپلون پہنے رکھتا تھا۔

بی اے تک وہ بمبئی میں پڑھتا رہا تھا پھر باپ کے مرنے کے بعد جزیرے میں آ کر اس نے جاگیر کا نظام سنبھال لیا تھا۔

نجمی اس مرہٹہ بھینسے نما جاگیردار کاٹل کی داشتہ بن کر خلیج بنگال کے جزیرے لینڈ فال میں جا رہی تھی ابھی تک اسے صرف اتنا ہی معلوم تھا کہ اسے کسی تیسرے گاہک نے خرید لیا ہے اور ہو سکتا ہے وہ چوتھے ہاتھ مزید فروخت کر دی جائے۔

دارجلنگ سے رات کے وقت اسے ایک بند ویگن میں بٹھا کر لے جایا گیا۔ اگرچہ نجمی نے اپنے رویے سے یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ اپنی نئی زندگی سے مطمئن ہے تاہم تامل ہندو کی گورکھا گارڈ نجمی کے ساتھ ہی ویگن میں بیٹھی۔ اس ویگن میں کوئی کھڑکی نہیں تھی صرف چھت میں ہوادان تھا۔ دارجلنگ سے یہ لوگ میزورام صوبے کے ایک چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں آ گئے۔ یہاں ان کا پڑاؤ چاپا ٹونگ کا ایک پہاڑی مقام تھا جو سطح سمندر سے تقریباً پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔ اس علاقے کی ایک جانب برما کی سرحد تھی اور دوسری طرف چٹا گانگ کا پہاڑی سلسلے کا کس بازار تک پھیلا ہوا تھا۔

دو روز نجمی کو اس جگہ رکھا گیا۔ شیلانگ سے کرائے پر لیا گیا ایک ہیلی کاپٹر چوتھے روز وہاں پہنچا۔ یہ ہیلی کاپٹر جزیرے کے مرہٹہ جاگیردار کاٹل نے اپنے ذاتی استعمال کے چیزوں کی سپلائی کے لیے چارٹرڈ کروایا تھا اور اسے کہا گیا تھا کہ وہ چاپا ٹونگ سے آتی دفعہ اس کے آدمیوں کو بھی لیتا آئے۔ تامل گورکھا گارڈ نے نجمی کو بھی اپنے ساتھ اس ہیلی کاپٹر میں سوار کروایا تو نجمی کو پہلی بار تشویش ہوئی۔ اسے کہیں بہت دور لے جایا جا رہا ہے۔ کیا وہ ہندوستان سے باہر جا رہی ہے؟ ایک احساس اس کے دل میں وسوسہ بن گیا تھا کہ جوں جوں وہ دور ہوتی جا رہی ہے اس کے فرار کے راستے میں مزید دشواریاں پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کے باوجود نجمی نے ہمت نہیں ہاری تھی اس نے اپنے دل میں عہد کر لیا کہ وہ جہاں بھی جائے گی وہاں سے ایک نہ ایک دن ضرور فرار ہو گی اور ان لوگوں سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنی رسوائیوں کا بدلہ لے گی۔ جو اسے جموں سے اغوا کر کے لے جا رہے ہیں اور جن کی وجہ سے وہ ایک بار پھر ذلتوں کے دلدل میں دھکیل دی گئی ہے۔ رات کے پچھلے پہر ہیلی کاپٹر چاپا ٹونگ کی پہاڑی سے اڑا اور جنوب کی طرف پرواز کرنے لگا۔ دن کی روشنی جب ہوئی تو نجمی نے نیچے جھانک کر دیکھا وہ کالے سیاہ سمندر کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ نجمی نے انگریزی میں ہندو تامل سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اس نے گردن کھجاتے ہوئے انگریزی میں کہا "تم اپنے گھر جا رہی ہو۔"

نجمی نے دل ہی دل میں اسے ایک گالی دی اور چپکی ہو کر بیٹھ گئی۔ دوپہر کے وقت ہیلی کاپٹر جزیرہ لینڈ فال کے اوپر منڈلانے لگا۔ نجمی نے نیچے دیکھا بیضوی شکل کا ایک ہرا بھرا سرسبز و شاداب جزیرہ سمندر میں پان کے پتے کی طرح پڑا تھا۔ وہ جغرافیہ پڑھی ہوئی تھی وہ سمجھ گئی کہ یہ جزیرہ جزائر انڈیمان کا ہی کوئی جزیرہ ہے کیونکہ اسے دور سمندر میں دوسرے چھوٹے چھوٹے جزیروں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر نیچے ہو رہا تھا۔ جزیرے کے درخت اوپر آ رہے تھے نجمی کو سبزے اور ناریل کے درختوں کے درمیان ٹیلوں کے بیچ ایک محل نما بہت بڑا کاٹیج دکھائی دیا۔ جس کے لان میں ایک طرف دو سفید موٹر کاریں کھڑی تھیں۔ ہیلی کاپٹر اسی سرخ و سفید محل کے عقبی لان میں ایک جگہ اتر گیا۔ محل کے مدراسی، مرالٹی اور گورکھے نوکر جو سفید وردیوں میں ملبوس تھے آگے بڑھے۔ ہیلی کاپٹر کے پنکھے ساکت ہوئے تو نجمی کو لے کر ہندو تامل، نوکروں کی معیت میں محل کے اونچے اونچے ستونوں والے برآمدے کی طرف بڑھا۔ سامنے لکڑی کا اونچا دروازہ تھا۔ باہر دو مسلح گورکھے پہرہ دے رہے تھے۔ اس نے ہندو تامل کے اشارے پر دروازہ کھول دیا۔ اندر ایک وسیع ہال تھا جس کا فرش بیش قیمت قالینوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ گول چھت کے ساتھ چھ فانوس لٹک رہے تھے۔

دونوں طرف سے منقش ریلنگ والی گھومتی سیڑھیاں اوپر کی گیلری کی طرف جاتی تھیں۔ یہ سیڑھیاں بھی قالین سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ یہاں وردی پوش نوکر رک گئے۔ صرف ہندو تامل جس نے نجمی کو سامبا سے خریدا تھا نجمی کو ساتھ لے کر سیڑھیاں چڑھنے لگا اوپر گیلری کے آگے بھی ایک عالی شان دروازہ تھا۔ یہاں بھی ایک گورکھا پہرہ دے رہا تھا۔ اس نے ہندو تامل کو دیکھ کر دروازہ کھول دیا۔ یہ بھی ریشمی قیمتی قالینوں والا ایک عالی شان کمرہ تھا جس کی کھڑکیاں محراب دار اور بلند تھیں۔ ان کے آگے

گلابی اور سفید باریک ریشمی پردے پڑے تھے جس کی وجہ سے کمرے میں عجیب قسم کی ملی جلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

یہاں پہلی بار نجمی نے دو ادھیڑ عمر بھری چہرے والی عورتوں کو دیکھا جنھوں نے بے حد میک اپ کیا ہوا تھا۔ زریفت کی ساڑھیوں میں ملبوس تھیں کمرے کی فضا ائر کنڈیشنڈ تھی اور لطیف خوشبو فضا میں تیر رہی تھی۔ ان عورتوں نے نجمی کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ ہندو تامل یہاں سے واپس چلا گیا۔

یہ عورتیں نجمی کو ایک اور کمرے میں لے گئیں۔ جہاں آرائش کا بے شمار سامان پڑا تھا۔ یہ کوئی بیوٹی پارلر لگتا تھا۔

ایک عورت نے انگریزی میں نجمی سے پوچھا "کیا تم انگریزی سمجھ لیتی ہو؟"

نجمی نے اثبات میں جواب دیا تو عورت نے کہا "تمھیں اب تیار ہونا ہوگا۔"

دوسری بھری عورت کلوزٹ میں سے دس بارہ ساڑھیاں نکال کر لے آئی۔ دونوں نے آپس میں چند لمحے مشورہ کیا اور پھر ایک نیلی ساڑھی نجمی کے لیے پسند کر لی۔ نجمی کرسی پر چپ چاپ بیٹھی یہ سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔ نجمی کو نہلایا گیا۔ اس کے جسم پر خوشبوئیں چھڑکی گئیں۔ بال خاص انداز سے گوندھے گئے۔

ساڑھی پہن کر نجمی نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو وہ ایک راجکماری لگ رہی تھی اس کا گورا رنگ سنگ مرمر کی طرح چمک رہا تھا۔ دونوں بھری عورتیں بھی اس کے حسن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں اس کے بعد نجمی کو ساتھ والے کمرے میں لے جایا گیا۔ جو بیڈ روم تھا اس کی شان ہی نرالی تھی۔ دیواروں پر کم خواب کے نسواری پردوں کے درمیان دیواروں پر جگہ جگہ نیم عریاں عورتوں کی آئیل پینٹنگز لگی تھیں۔ بہت بڑے چاندی کے پایوں والے ڈبل بیڈ کی دونوں جانب کیوپڈ کے بت لگے تھے۔ چھت پر بھی ہیجان خیز تصویریں بنائی گئی تھیں۔ کمرے میں روشنی ہلکی تھی پلنگ کے چاروں کونوں پر ڈھکے ہوئے لیمپ روشن تھے جن کی روشنی بہت پر اسرار اور بڑی رومانی تھی۔

ایک بھری عورت نے کہا "یہ آج کی رات تمھارا بیڈ روم ہوگا۔"

نجمی کے منہ سے بے اختیار نکل گیا "اور اس کے بعد مجھے کہاں رہنا ہوگا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دونوں تجربہ کار برمی خادماؤں نے چونک کر نجمی کی طرف دیکھا۔ ایک خادمہ اپنی آنکھوں کو سکیڑ کر بولی۔ "یہ تمھیں کل صبح بتا دیا جائے گا کہ اس کے بعد تم کہاں رہو گی؟" دلہن بنی نجمی کو شاہی محل ایسے بیڈروم میں اکیلا چھوڑ کر دونوں برمی خادمائیں چلی گئیں۔ نجمی نے دوبارہ بیڈروم کا جائزہ لیا۔ پھر وہ ایرانی قالین پر آہستہ آہستہ بے آواز قدموں سے چلتی اونچی محرابی کھڑکی کے پاس آگئی اس نے کھڑکی کا سفید ریشمی پردہ ایک طرف ہٹا کر نیچے کشادہ لان میں دیکھا۔ ایک سرخ رنگ کی اسپورٹس کار وہاں آکر رکی۔ دو وردی پوش نوکروں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ اندر سے ایک گھٹے ہوئے سر اور چوڑے چکلے بن مانس ایسے شانوں والا ایک سیاہ فام آدمی باہر نکلا جس نے سلک کا سفید کرتا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہنٹر تھا۔ وہ ہنٹر کو فضا میں لہراتا محل کے دروازے کی طرف بڑھا۔ نجمی سمجھ گئی کہ یہی وہ مرہٹہ جاگیردار کاٹل ہے جس نے اسے پچاس ہزار روپے میں خریدا ہے۔ وہ جلدی سے پلنگ پر آکر بیٹھ گئی۔

٭ ٭ ٭

نجمی بیش قیمت ساڑھی پہنے دلہن بنی پلنگ پر بیٹھی تھی۔

اسے ہر حالت میں اس نئے اور خوبصورت قید خانے سے فرار ہونا تھا کچھ وقت کے لیے اس نے حالات سے سمجھوتہ کرنے اور پھر صورت حال کا جائزہ لے کر کوئی راہ فرار اختیار کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ وہاں جس قسم کا ماحول تھا اور ہندوستان سے وہ جتنی دور آگئی تھی اس کے پیش نظر اس قسم کے لائحہ عمل کے سوا دوسرا کوئی راستہ اسے بظاہر نظر نہیں آرہا تھا۔

اونچے محلاتی دروازے کا پردہ ہٹا۔ نجمی نے گردن موڑ کر دیکھا دروازے میں وہی کالا سیاہ بھینسا نما جاگیردار کاٹل ہاتھ میں ہنٹر لیے کھڑا اسے گھور رہا تھا۔

یہ کس قسم کا آدمی ہے؟ نجمی کے دل میں خیال آیا کاٹل چمڑے کے ہنٹر کو مروڑتا ہوا نجمی کے پاس آکر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ نجمی کو عجیب قسم کی بو آئی۔ یہ بو اس نے گھنے جنگلوں میں چھپھلتے پانیوں والے جوہڑوں کے قریب سے گزرتے اکثر محسوس کی تھی۔ کاٹل نے اگرچہ اپنے سلک کے کرتے پر اعلیٰ پرفیوم کی پوری بوتل انڈیل رکھی تھی اس کے باوجود چھپھلتے پانی کی ناگوار بو نمایاں تھی۔ نجمی کو اس آدمی سے شدید کراہت محسوس ہوئی اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس بھینسے سے دور رہے گی۔

مرہٹہ بھینسا کاٹل بھاری اور بیٹھی ہوئی آواز میں انگریزی میں کہنے لگا "مجھے بتایا گیا ہے کہ تم انگریزی جانتی ہو کیا یہ سچ ہے۔؟"

نجمی نے نگاہیں اٹھا کر کاٹل کو دیکھا کالے سیاہ بھاری بھرکم چہرے پر دو آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ نجمی نے اثبات میں سر ہلایا تو کاٹل نے انگریزی میں بات شروع کی۔

"میں نے تمھیں سب سے زیادہ قیمت دے کر خریدا ہے آج سے تم میری ہو اور جب تک زندہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہاں میری بن کر ہی رہو گی۔

نجمی نے دل میں نفرت کے ساتھ کہا۔۔۔ تو کیا تیرا باپ بھی مجھے یہاں نہیں رکھ سکے گا تم جانتے ہی نہیں ہو کہ تمھارا احمق دلال کس عورت کو خرید کر یہاں لایا ہے۔

کاٹل کہہ رہا تھا۔

"اٹھو میرے ساتھ آؤ۔"

نجمی نے کاٹل کی طرف دیکھا کاٹل ہنٹر کو مروڑتے ہوئے نجمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے گھور رہا تھا "اٹھو میرے ساتھ آؤ" اس نے اپنی بات کو کرخت آواز میں دہرایا۔

نجمی پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کاٹل آگے آگے چلنے لگا۔ بیڈ روم سے نکل کر وہ دوسرے کمرے میں آیا تو یہاں سے لکڑی کا ایک زینہ نیچے جاتا تھا۔ کاٹل پرے ہٹ گیا اور بولا۔

"نیچے چلو۔"

نجمی سے نہ رہا گیا اس نے پوچھا۔

"تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

کاٹل نے ہنٹر کا دستہ نجمی کی گردن سے لگا کر دبایا اور بولا۔

"تمھیں مجھ سے کوئی بات پوچھنے کا حق کس نے دیا۔؟"

نجمی کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی اس کی آنکھیں بھی دہکنے لگیں مگر اس نے انتہائی ضبط سے کام لیا مصلحت بھی اسی میں تھی وہ زینہ اترنے لگی نیچے ایک تہہ خانہ تھا جس کے فرش پر لوہے کا خالی پلنگ بچھا تھا۔ تہہ خانے میں نیم اندھیرا تھا۔ نجمی یہ دیکھ کر چونک سی گئی کہ پلنگ کے سرہانے کی جانب دیوار کے ساتھ لگ کر دو ناٹے قد کے سیاہ فام حبشی نما ہٹے کٹے آدمی ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

وہ رک گئی۔ اس نے کاٹل کی طرف دیکھا۔ کاٹل نے سیاہ فام نوکروں کو اشارہ کیا اشارہ پاتے ہی دونوں حبشی نجمی پر ٹوٹ پڑے انھوں نے اس کو پلنگ پر زبردستی لٹا کر اس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں پلنگ کی ریلنگ سے باندھ دیئے۔

نجمی نے چیخ کر کہا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے کیا تم اپنی خریدی ہوئی عورتوں سے یہ سلوک کرتے ہو؟"

کاٹل نے کوئی جواب نہ دیا۔ نوکروں کو اشارہ کیا وہ سر جھکانے کے بعد زینہ چڑھ کر تہہ خانے سے باہر نکل گئے۔ ان کے نکلتے ہی کاٹل نے نجمی پر ہنٹر برسانے شروع کر دیئے۔ نجمی کے لیے یہ ایک ناگہانی آفت تھی۔ ہنٹر کی ضربوں سے اس کا جسم تڑپ اٹھا۔ ہنٹر اس کی رانوں اور سینے پر پڑ رہے تھے۔ درد سے اس کا جسم پھٹا جا رہا تھا۔

کاٹل نے ہاتھ روک لیا اور نجمی کے قریب آ کر اس کی گال پر زور سے تھپڑ مارا اور بولا۔ "جو عورت پہلی بار یہاں آتی ہے اس کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے میں اسے ضروری سمجھتا ہوں۔"

کاٹل کا سانس پھولا ہوا تھا وہ بن مانس کی طرح سانس لے رہا تھا ہنٹر کو اس نے اپنی گردن میں ڈالا اور زینہ چڑھتے ہوئے تہہ خانے سے چلا گیا۔

نجمی پر اچانک یہ سب کچھ گزر گیا تھا اس کے جسم پر جہاں جہاں ہنٹر پڑے تھے وہاں درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں کے کنارے سے خون کی باریک لکیر بہہ رہی تھی اس نے اپنی زبان پر خون کا نمکین ذائقہ محسوس کیا اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی بجائے خون اتر آیا تھا مگر وہ جکڑ دی گئی تھی وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ کم از کم ابھی کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی اس نے پہلے جو ارادہ دل میں کر رکھا تھا اسے فوراً رد کر دیا اور اسی وقت دل میں ٹھان لی کہ وہ کاٹل سے اس ظلم کا اپنی ایسی دوسری عورتوں کے ظلم کا پورا پورا بدلہ لیے بغیر وہاں سے فرار نہیں ہوگی۔

پندرہ بیس منٹ اسی طرح گزر گئے پھر لکڑی کے زینے پر سے وہی بڑی عورت جس نے نجمی کو بنا سنوار کر پلنگ پر بٹھایا تھا اتر کر اس کے پاس آئی اور اس کے ہاتھ پاؤں کی رسیاں کھولنے لگی۔ نجمی نے اس ادھیڑ عمر بڑی عورت سے کوئی بات کرنا گوارا نہ کیا۔ بڑی عورت کے ہاتھ اس طرح چل رہے تھے جیسے وہ کسی انسان کی نہیں بلکہ کسی بکری کی رسیاں کھول رہی ہے۔ ظاہر ہے یہ منظر وہ کئی بار پہلے بھی دیکھ چکی تھی اس سے کوئی بات کرنا بیکار تھا۔ نجمی پلنگ پر بیٹھ کر اپنی کلائیاں سہلانے لگی۔ اس کا جسم درد کر رہا تھا۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ ہنٹر کی ضربوں سے نیل پڑ گئے تھے۔

بڑی عورت نے انگریزی میں کہا "میرے ساتھ اوپر آ جاؤ۔"

نجمی اوپر والے کمرے میں آ گئی اس سے ٹھیک طرح سے چلا نہیں جاتا تھا کتنا وہ بیڈ روم میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوسری ادھیڑ عمر آسامی عورت پلنگ کے پاس کھڑی تھی گول چاندی کی تپائی پر کچھ شیشیاں رکھی تھیں آسامی اور برمی عورتوں نے نجمی کو پلنگ پر لٹا کر اس کے جسم پر جہاں جہاں نیل کے نشان پڑے تھے وہاں شیشیوں میں سے مرہم نکال کر لگانا شروع کر دیا۔ ٹھنڈے مرہم سے نجمی کو سکون محسوس ہوا اس کے بعد نجمی کو گرم دودھ پلایا گیا۔

برمی عورت چلی گئی تو آسامی عورت نے کہا۔

"تم کچھ دن اسی کمرے میں رہو گی۔ تمھیں باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔"

یہ عیار آسامی عورت بھی چلی گئی نجمی نے ساڑھی پہن لی اور پلنگ پر لیٹ گئی۔ دوپہر کو ایک تیسری بوڑھی عورت اس کے لیے کھانا لے کر آ گئی۔ کھانا پر تکلف تھا شام کو اسے کافی اور بسکٹ دیئے گئے۔ رات کو بھی پر تکلف کھانا دیا گیا۔ اس دوران نجمی پلنگ سے اٹھ کر دروازے کے پاس گئی تو اس نے دیکھا کہ باہر دوسری طرف ہال کمرے میں دو گورکھا نوکر اسٹین گنیں اٹھائے پہرہ دے رہے تھے انھوں نے گھور کر نجمی کی طرف دیکھا اور واپس جانے کا اشارہ کیا۔

تین دن نجمی اسی کشادہ بیڈروم میں بند رہی بہتر غذا اور مرہم وغیرہ کی مالش سے اس کی طبیعت بحال ہو گئی تھی جسم پر نیل کے نشان بھی مدہم پڑ گئے تھے۔ درد بھی برائے نام باقی رہ گیا تھا۔ چوتھا اور پھر پانچواں دن بھی اسی کمرے میں قید کی حالت میں گزر گیا جب ایک ہفتہ گزر گیا تو برمی اور آسامی عورت اس کے لیے بیش قیمت لباس لے کر بیڈروم میں داخل ہوئیں۔ نجمی کو نہلایا گیا اس کے جسم پر مختلف عطریات کی مالش کی گئی اسے بیش قیمت لباس پہنایا گیا پھر اسے دلہن کی طرح بنا سنوار کر پلنگ پر یہ کہہ کر بٹھا دیا گیا کہ آج اس کی سہاگ رات ہے۔

نجمی نے دل میں دونوں عورتوں کو گالی دی اور ہونٹ کاٹنے لگی۔ جب رات گہری ہو گئی اور محل کے آس پاس خاموشی چھا گئی تو بن مانس مرشہر جاگیردار کاٹل نشے میں دھت اندر داخل ہوا وہ سگریٹ پی رہا تھا اور ایک ہاتھ میں چاندی کا سگریٹ کیس تھا۔ آتے ہی اس نے واہی تباہی بکنا شروع کر دی اور نجمی پر تشدد شروع کر دیا۔

شمالی انڈیمان کے اس دور افتادہ چھوٹے سے جزیرے لینڈ فال میں قید نجمی کو ایک مہینہ گزر گیا تھا۔ وہ جاگیردار کاٹل کے شاندار محل کے اندر قید تھی۔ اسے محل سے باہر نکلنے کی اجازت

نہیں تھی اس کی دوسری عورتوں کو بھی محل کی پچاس فٹ اونچی چار دیواری سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ صبح شام نجمی کو محل کے اندر عقبی باغ میں تھوڑی دیر ٹہلنے کی ضرور اجازت تھی۔ وہاں بن مانس کاٹل کی دوسری عورتوں میں سے کبھی کبھی کوئی بدقسمت عورت اس سے مل لیتی تھی۔

آسامی عورت سائے کی طرح نجمی کے ساتھ ہوتی۔ کاٹل کی دوسری عورتوں میں ایک دلی کی عورت بھی تھی۔ یہ سانولے رنگ کی جوان عورت تھی بہت خوبصورت تھی۔ اس سے کبھی کبھی عقبی باغ کے لان میں دور سے سلام دعا ہو جاتی تھی۔ برمی عورت کی زبانی اسے اتنا ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ اس عورت کا تعلق دلی سے ہے اور وہ بھی مسلمان ہے۔

نجمی نے دل میں اس عورت کی قسمت پر بھی افسوس کیا۔ وہ اس کے سوا کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ لیکن نجمی نے وہاں سے فرار کے منصوبوں پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہاں سے فرار ہونا نجمی کو کچھ ناممکن سا لگتا تھا۔ ایک تو محل کے باہر چوبیس گھنٹے مسلح گورکھوں کا پہرہ رہتا تھا۔ دوسرے یہ دور دراز سمندر میں ایک جزیرہ تھا۔ یہاں سے وہ کیسے فرار ہو کر انڈیا پہنچ سکتی تھی۔ اسے کئی بار بادل کا خیال آیا نہ جانے وہ کس حال میں ہو گا۔ جموں کی جیل میں ہو گا یا جیل سے فرار ہو کر نجمی کی تلاش میں سرگرداں ہو گا۔

دوسرا مہینہ بھی شروع ہو گیا اب بارشوں کا موسم آ گیا۔ زبردست بارشیں ہونے لگیں اب نجمی لان میں ٹہلنے کے لیے دوسرے تیسرے دن نکلتی تھی ایک روز دوپہر کے وقت جب آسمان پر گھنے بادل چھائے ہوئے تھے۔ نجمی نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے ایک ہیلی کاپٹر کو محل کے بائیں باغ میں ہیلی پیڈ پر اترتے دیکھا۔ محل کے نوکر ہیلی کاپٹر کی طرف دوڑے ہیلی کاپٹر میں سے ایک ناٹے قد مگر گٹھے ہوئے بدن کا سکھ پائلٹ باہر نکلا۔ اس نے سرخ پگڑی اور نیلی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ نوکر ہیلی کاپٹر میں سے سامان اتارنے لگے۔ سکھ پائلٹ ایک طرف کھڑا ہو گیا پھر اس نے جیکٹ کے بٹن کھولتے ہوئے محل میں دائیں بائیں دیکھا تو اس کی نظر نجمی پر پڑ گئی۔

سکھ پائلٹ کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی وہ ہر ماہ اکیاب سے جاگیردار کاٹل کے لیے خاص قسم کی اعلیٰ ترین شراب اور دوسرا ضروری سامان تعیش لاتا تھا اور محل کی کھڑکی میں اسے کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی عورت دکھائی دے جاتی تھی۔ سکھ پائلٹ کا نام گرجن سنگھ تھا اور وہ جانتا تھا کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جاگیردار کاٹل ایک عیاش شخص ہے اور اس نے محل میں کئی داشتائیں ڈال رکھی ہیں چنانچہ نجمی کو ایک نظر دیکھنے کے بعد وہ محل کے برآمدے کی طرف بڑھا جہاں اسے محل کے بڑے منشی سے سامان کی رسید لینی تھی لیکن اسی دوران نجمی کے ذہن میں ایک زبردست اسکیم پوری کی پوری تشکیل پا چکی تھی اسے معلوم تھا کہ ایک پائلٹ مہینے میں ایک بار اکیاب سے جاگیردار کا خاص سامان لے کر وہاں آتا ہے۔ اور ایک دن وہاں ٹھہر کر چلا جاتا ہے جونہی سکھ نجمی کی کھڑکی سے نیچے گزرا نجمی نے اوپر سے ٹھیٹ پنجابی میں کہا۔

"ست سری اکال! اپنی سنگھنی دا کوئی خیال نہیں؟"

گرجن سنگھ نے چونک کر اوپر دیکھا۔ نجمی نے سکھوں کی طرح ہاتھ جوڑ کر ایک بار پھر ست سری اکال کہا اور بولی۔

"اساں نوں تہاڈی اڈیک اے۔"

اتفاق سے اس وقت وہاں ان کے سوا اور کوئی نہیں تھا محل کے نوکر سامان اٹھائے دوسری طرف اسٹور کی طرف جا رہے تھے۔ گرجن سنگھ سکھ تھا اس نے ایک سکھنی کی زبان سے بے بسی کے الفاظ سنے تو چکرا سا گیا۔ انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھ کر اشارہ کیا کہ خاموش رہو پھر اپنی بندھی ہوئی داڑھی کو اوپر کھینچا اور برآمدے میں سے گزرتا ہوا ہیڈ منشی کے سائیڈ روم میں داخل ہو گیا۔

نجمی جلدی سے کھڑکی سے پرے ہٹ گئی وہ ہاتھ ملتے ہوئے قالین پر ٹہلنے لگی اسے یقین تھا کہ اس کا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا ہے یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے پہلی بار ہی اس سکھ پائلٹ تک اپنے دل کی بات بتانے کا موقع مل گیا تھا۔ سکھوں کے ذہن سے نجمی خوب واقف تھی وہ جانتی تھی کہ یہ سکھ پائلٹ اب اس کے پاس آنے کی ضرور کوشش کرے گا جبکہ جاگیردار کاٹل ایک روز کے لیے نیچے انڈیمان کے مارشل نامی جزیرے میں کسی ضروری کام سے گیا ہوا تھا۔ نجمی ٹہلتی ٹہلتی بیڈ روم کے اونچے محرابی دروازے کے پاس گئی پردہ ہٹا کر اس نے دروازے کو کھولنا چاہا مگر دروازہ باہر سے بند تھا اس نے دروازے کی چھوٹی سی دراڑ میں سے جھانک کر دیکھا باہر برآمدے میں گورکھا پہرے دار موجود تھا نجمی واپس آ کر پلنگ کے قریب آتشدان کے پاس رکھے ہوئے عالی شان صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ دیوار پر پرانا کلاک لگا تھا اس کی سوئی ٹک ٹک کرتی چل رہی تھی

کھڑکی کے باہر سے کسی درخت پر کوئل بول رہی تھی۔ دوپہر گزر گئی پھر بارش شروع ہو گئی۔ نجمی کچھ ناامید سی ہو گئی۔ شاید سکھ پائلٹ اسے ملنے نہیں آئے گا۔ شاید وہ یہ خطرہ مول نہیں لے گا آخر اس کی نوکری کا سوال ہے مگر اس کا دل کہتا تھا کہ جس انداز سے اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر نجمی کو اشارہ کیا تھا وہ ضرور آئے گا۔

رات ہو گئی۔ نوکرانی نجمی کے لیے کھانا لے کر آ گئی۔ کھانا کھانے کے بعد نجمی نے لباس تبدیل کیا اور کمرے کی تمام روشنیاں گل کر کے صرف بیڈ لیمپ جلا دیا۔ وہ پلنگ پر لیٹنے کی بجائے کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا کر نیچے پائیں باغ میں دیکھنے لگی۔ بارش ہو رہی تھی محل کے باغ میں روشنیاں بارش میں بھیگ رہی تھیں۔ باغ خالی اور ویران تھا گیٹ بند تھا باغ میں ایک جانب ہیلی بیڈ پر ہیلی کاپٹر اسی طرح کھڑا باغ میں بھیگ رہا تھا۔ نجمی نے پردہ چھوڑ دیا اور بوجھل قدم اٹھاتی پلنگ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ بارش کی وجہ سے کمرے میں خنکی ہو گئی تھی اس نے ہلکا سا کپڑا اپنے گھٹنوں پر کر لیا۔ عین اس وقت دروازہ کھلا پردہ ہٹا کر نجمی نے دیکھا کہ آسامی خادمہ آ رہی ہے۔ اس کا اس وقت آنا معنی خیز تھا۔ آسامی خادمہ نے قریب آ کر ایک نظر گردن گھما کر پیچھے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی

"میرے ساتھ آؤ۔"

اب نجمی سمجھ گئی کہ اس نے دوپہر کو جس منصوبے کا آغاز کیا تھا یہ اسی کا ردعمل ہے۔ اس نے انجان بن کر پوچھا۔

"کہاں جانا ہے؟"

آسامی خادمہ نے غصے سے کہا۔

"کیا تمہیں معلوم نہیں ہے؟ زبان بند رکھو اور میرے ساتھ آؤ۔"

جاگیردار کاٹل جزیرے میں نہیں تھا ظاہر ہے اسے کاٹل کے پاس نہیں بلکہ کسی دوسرے شخص کے پاس لے جایا جا رہا تھا اور دوسرا شخص اس وقت سکھ پائلٹ ہی ہو سکتا تھا وہ آسامی خادمہ کے پیچھے پیچھے چل دی۔ بیڈ روم کے خاص دروازے کی بجائے خادمہ اسے عقبی دروازے کی طرف لے گئی جو دوسرے کمرے میں نکلتا تھا۔ یہ دوسرا کمرہ بالکل بند تھا اور اس میں سے باہر نکلنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہاں نجمی دن کے وقت بیٹھ کر رسالے اور کتابیں وغیرہ پڑھا کرتی تھی۔ اس کمرے کی دیوار کے ساتھ کتابوں کا ایک شیلف جڑا ہوا تھا۔ آسامی خادمہ نے نجمی کو صوفے پر بیٹھنے کو کہا اور خود پردہ ہٹا کر شیلف کے پیچھے چلی گئی دوسرے لمحے چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ کتابوں کا شیلف اپنی جگہ سے کھسک گیا اور پھر پردے کے پیچھے سے سکھ پائلٹ ہاتھوں کو زور زور سے ملتا ہوا نمودار ہوا۔ آسامی خادمہ نے مشینی انداز میں انگریزی میں کہا۔

"پندرہ بیس منٹ سے زیادہ وقت مت لگانا۔"

گرجن سنگھ پائلٹ نے کہا

"او کے۔"

آسامی خادمہ شیلف کے پیچھے چلی گئی۔ شیلف چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ واپس اپنی جگہ پر آ گیا۔ نجمی نے اپنے منصوبے پر فوراً کام شروع کر دیا اس سے پہلے کہ سکھ پائلٹ کچھ کہتا نجمی نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر آنکھوں سے لگایا اور آنسو بھر کر بولی۔

سردار جی! میں سکھنی ہوں میرا نام ہرنام کور ہے میں امرتسر کے پاس وہیہ کا گاؤں کے گرنتھی سردار سنگھ کی بیٹی ہوں یہ لوگ مجھے مسلمان سمجھ کر اغوا کر کے یہاں لے آئے ہیں۔ یہ بڑی لمبی کہانی ہے پھر سناؤں گی اس وقت گورو کا واسطہ دیتی ہوں مجھے یہاں سے کسی طرح نکال دو۔ میں گورو گرنتھ صاحب کے آگے تیری ارداس کروں گی۔"

سکھ پائلٹ ہکا بکا سا ہو کر نجمی کا منہ دیکھنے لگا۔ نجمی نے اسے سوچنے کا موقع دیئے بغیر دوسرا حملہ کر دیا۔ گرجن سنگھ کا ہاتھ ایک بار پھر آنکھوں پر لگا کر بولی۔

"سردار جی! میں گرنتھی کی بیٹی ہوں سنگھنی ہوں۔ اگر تم مجھے یہاں سے نہیں نکال سکتے تو مجھے گورو کی کرپان لا دو تاکہ میں اس سے خودکشی کر سکوں۔"

اب سکھ پائلٹ گرجن سنگھ نے اپنی ڈاڑھی کو ہاتھ سے اوپر کھینچتے ہوئے کہا۔

"ہرنام کور! تمھیں کرپان سے اپنے آپ کو مارنے کی ضرورت نہیں میں یہاں کس لیے ہوں۔ تم فکر نہ کرو میں بہت جلد تمھیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔"

گرجن سنگھ ہتھیلیاں رگڑنے لگا پھر اٹھ کر کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

نجمی نے جلتی پر مزید تیل ڈالا وہ پنجابی میں بول رہی تھی۔

تجھے کلغی والے گورو جی کی قسم ہے میری خاطر اپنی جان مشکل میں نہ ڈالنا بس مجھے کرپان لا دو میں سنگھنی ہوں، شیرنی ہوں، میں مرنا جانتی ہوں۔"

سکھ آخر سکھ تھا۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ آخر نجمی نے اب تک وہاں خودکشی کیوں نہیں کی۔ وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ نجمی کے پاس ہی بیٹھ گیا اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

"ہرنام جی! میں بھی سنگھ ہوں شیر ہوں تم کو اکیلی نہیں چھوڑوں گا یہاں۔ تم تو گورو گرنتھ صاحب کے گرنتھی کی لاج ہو۔ میں کوئی ترکیب نکالتا ہوں۔"

اس نے نجمی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنی سرخ پگڑی کو سر پر دوبارہ جماتے ہوئے بولا۔

"میں تو کچھ اور ہی سمجھا ہوا تھا۔ میں نے اس عورت کو پانچ سو روپے دے کر تم سے ملاقات کے لیے راضی کیا ہے خیر کوئی بات نہیں۔ اچھا ہوا کہ تم سے ملاقات ہو گئی۔ گورو گرنتھ صاحب کے گرنتھی کے لیے تو سنگھ اپنی جان بھی قربان کر سکتے ہیں۔"

پھر کہنے لگا... "وقت تھوڑا ہے مجھے تمھیں بہت کچھ بتانا ہے۔ میں انڈیمان کے جزیرے مارشل میں رہتا ہوں میری شادی نہیں ہوئی۔ میں یہاں اکیلا رہتا ہوں۔ میرے ماتا پتا دلی میں رہتے ہیں چھ مہینے میں ایک بار ان سے جا کر مل آتا ہوں۔ یہاں مہینے میں ایک بار کاٹل کا سامان اکیاب سے لاتا ہوں۔ یہ ہیلی کاپٹر کمپنی کا ہے میں کمپنی کا ملازم ہوں مگر میں تمھیں اس پر بٹھا کر انڈیا تک نہیں لے جا سکتا۔ یہ بڑا لمبا سفر ہے میں کوئی ترکیب نکالتا ہوں ہرنام کور جی! تم فکر نہ کرو۔ میں یہاں ایک دن ٹھہرا کرتا ہوں مگر تمھاری خاطر میں کل کا دن بھی کوئی بہانہ بنا کر یہاں ٹھہر جاؤں گا۔"

پھر خود ہی اپنی تردید کرتے ہوئے بولا۔

"لیکن یہاں ٹھہرنے کی کیا ضرورت ہے میں ساتھ والے سمندر میں سندر سنگھ سے بات کروں گا۔ گھبراؤ نہیں سندر سنگھ میرا گہرا یار ہے وہ ہماری مدد کرے گا۔ یہ گوروؤں کی سیوا کا معاملہ ہے۔ گرنتھی کی بیٹی یہاں نہیں رہ سکتی سوں گورو کی نہیں رہ سکتی۔ ایسا کرنا تم اس آسامی عورت سے کوئی بات نہ کرنا پوچھے تو یہی کہنا کہ گرجن سنگھ مجھ پر عاشق ہے بس ملنے آیا تھا۔ میرا نام گرجن سنگھ ہے یاد کر لینا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اتنے میں شیلف اپنی جگہ سے کھسک گیا اور آسامی خادمہ اندر آ گئی۔

"چلو اب ختم کرو ٹائم ہو گیا ہے۔"

گرجن سنگھ پائلٹ جلدی سے اٹھا اور بولا۔

"او کے او کے۔"

پھر اس نے نجمی کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور آسامی خادمہ کے ساتھ پردے کے پیچھے چلا گیا۔ دوسرے لمحے کتابوں کا شیلف واپس اپنی جگہ پر آ گیا۔ نجمی نے اٹھ کر پردہ ہٹایا وہاں کتابوں کے شیلف کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اسی شیلف میں کسی جگہ وہ خفیہ بٹن تھا جس کو دبانے سے شیلف اپنی جگہ سے ہٹ جاتا تھا۔ لیکن اب نجمی کو وہ خفیہ بٹن تلاش کرنے کی ضرورت نہیں تھی خفیہ بٹن اسے گرجن سنگھ پائلٹ کی شکل میں مل گیا تھا۔ اگلے روز بھی نجمی کو گرجن سنگھ پائلٹ کا انتظار رہا اس روز جاگیردار کاٹل کو رات کے کھانے پر واپس آنا تھا۔ چنانچہ دوپہر کے بعد جب حسب معمول بارش ہو رہی تھی آسامی خادمہ نے نجمی کو آ کر بتایا کہ سکھ سردار تم سے ملنے آ رہا ہے۔ ساتھ ہی آسامی خادمہ نے نجمی کو سمجھا دیا کہ اس کا ذکر کسی سے مت کرنا۔ اگر کسی سے بھی بات کی تو تمہارے حق میں اچھا نہ ہو گا۔

نجمی نے کہا ..." میڈم مجھے کسی سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے تمہاری مہربانی ہے کہ تم دو محبت کرنے والوں کے ملنے کا انتظام کر دیتی ہو۔"

اس پر آسامی خادمہ نے ترش روئی سے کہا۔

"چلو اب باتیں نہ بناؤ میرے ساتھ ساتھ والے کمرے میں آؤ تمہارا دوست وہاں بیٹھا ہوا ہے۔ پندرہ بیس منٹ سے زیادہ مت لگانا۔"

دوسرے کمرے میں گرجن بیٹھا نجمی کا انتظار کر رہا تھا نجمی کو دیکھتے ہی وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ست سری اکال ہزنام جی۔!"

نجمی نے بھی ہاتھ جوڑ کر ست سری اکال کہا آسامی خادمہ پردے کے پیچھے سے ہو کر دوسری طرف جا چکی تھی گرجن سنگھ نے فوراً پردہ ہٹا کر دیکھا وہاں آسامی عورت نہیں تھی۔ کہنے لگا۔

ہزنام جی! ساتھ والے کمرے میں نہ چلیں یہاں خطرہ ہے کہ ہماری باتیں وہ آسامی بلی کہیں چھپ کر سن نہ رہی ہو۔"

اس کا اندیشہ بجا تھا وہ گرجن سنگھ کو ساتھ والے بیڈ روم میں لے آئی وہ آتشدان کے پاس قالین پر ہی بیٹھ گئے گرجن سنگھ کہنے لگا۔

"میں صبح سے ساتھ والے جزیرے میں اپنے یار سندر سنگھ کے پاس گیا ہوا تھا جب میں نے اسے بتایا کہ وبیرکا کے گرنتھی کی پوتری بیٹی کاٹل نے اپنے گھر میں ڈال رکھی ہے تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا فوراً ہماری مدد کے لیے تیار ہو گیا۔"

نجمی نے پوچھا۔" وہ ہماری کس طرح سے مدد کرے گا۔"

گرجن سنگھ نے کہا ..." اس سے ساری بات طے ہو گئی ہے ہو گا یہ کہ تم میرے ساتھ یہاں سے نکل کر سندر سنگھ کے جزیرے پر چلو گی وہاں سے ہم ایک کشتی میں بیٹھ کر رات کے اندھیرے میں شمال کی طرف انڈیمان کے آخری جزیرے میں جائیں گے۔ وہاں ہمیں ایک اسٹیمر مل جائے گا جو ہمیں اکیاب پہنچا دے گا۔ اکیاب سے میں اپنا ہیلی کاپٹر لوں گا جو وہاں پہلے سے موجود ہو گا وہاں سے ہم ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر آسام میں داخل ہو جائیں گے۔"

نجمی کو کامیابی کی روشنی سی نظر آ رہی تھی اس کا منصوبہ کامیابی کی طرف پیش قدمی کر چکا تھا مگر وہ درندہ صفت جاگیردار کاٹل سے انتقام لیے بغیر وہاں سے نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس موضوع کو ابھی اس نے اپنے پاس محفوظ ہی رکھا اور گرجن سنگھ سے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں ہمیں کب یہاں سے نکل پڑنا چاہیئے سردار جی؟" گرجن سنگھ کچھ سوچ کر بولا۔

"ہزنام جی! میں اس کام میں دیر نہیں لگانا چاہتا۔ میں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ پوتر گرنتھی کی بیٹی اس ہندو جاگیردار کے پاس ایک دن بھی رہے۔ سندر سنگھ نے تو سارا انتظام کر دیا ہے۔ میں کل ہیلی کاپٹر لے کر واپس جا رہا ہوں۔ مارشل جزیرے سے یہ ہیلی کاپٹر لے کر دوسرے پائلٹ کے پاس چلا جائے گا۔ جو شیڈول کے مطابق تین دن بعد اسے اکیاب شہر کے ہیلی پیڈ پر پہنچا دے گا۔ اس حساب سے ہمیں یہاں سے تین دن بعد نکل پڑنا ہو گا۔ میں نے سندر سنگھ کو بھی ٹائم ٹیبل بتا دیا ہے۔ میں پرسوں آدھی رات کو یہاں آؤں گا تم تیار رہنا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نجمی نے کہا... "میں یہاں سے کیسے نکلوں گی؟ یہاں تو چاروں طرف گورکھے اسٹین گنیں لیے کھڑے ہوتے ہیں۔"

گرجن سنگھ بولا... "اس کا بھی سارا انتظام کر لیا گیا ہے میں نے آسامی خادمہ کو بھاری رقم کا لالچ دے کر اس کام پر آمادہ کر لیا ہے۔"

نجمی نے کہا... "کیا وہ تیار ہو گئی ہے؟"

گرجن سنگھ نے کہا... "میں نے اسے کہا ہے کہ وہ تمھیں صرف محل کے باہر نکال دے۔ اس کے عوض میں اسے ایک لاکھ روپیہ دوں گا۔"

نجمی حیران ہو کر بولی... "سردار جی! ایک لاکھ تو بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔"

گرجن سنگھ ہنسنے لگا... "میں اسے یہ رقم تھوڑی دوں گا کیا مجھے واپس آکر جاگیردار کاٹل کی نوکری نہیں کرنی؟ کیا مجھے یہ خیال نہیں کہ آسامی خادمہ کاٹل کو بعد میں سب کچھ بتا سکتی ہے۔؟"

"تو پھر تم نے اس کا کیا علاج سوچا ہے؟" نجمی نے پوچھا۔

گرجن سنگھ بولا "میں آسامی خادمہ کو قتل کر دوں گا۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور قتل کر کے سمندر میں پھینک دوں گا۔ اس عورت نے بھی تم پر ظلم کیے ہیں۔ کئی عورتوں پر ظلم کیے ہیں۔"

تب نجمی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

"سردار جی! مجھ پر تو سب سے زیادہ ظلم اس مرتبہ جاگیردار کاٹل نے کیے ہیں ایک روز میں گوربانی کا پاٹھ کر رہی تھی کہ اس نے آتے ہی مجھے پیٹنا شروع کر دیا اور گوربانی کا گٹکا اٹھا کر پاؤں تلے مسل ڈالا۔"

گرجن سنگھ کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔

"اس ہندو کی یہ مجال؟ میں اسے کبھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

نجمی نے فوراً کہا تمھیں اسے مارنے کی ضرورت نہیں۔ اسے میں قتل کر دوں گی تم صرف مجھے ایسا زہر لادو جو میں اسے شراب میں ڈال کر پلا دوں۔ یہ کتا اپنی موت آپ مر جائے گا۔"

گرجن سنگھ ڈاڑھی کو ایک ہاتھ سے اوپر چڑھانے لگا۔

ٹھیک ہے ہرنام جی! میں تمھیں زہر کے کیپسول لا دوں گا تم خود اس حرام زادے کو ہلاک کر ڈالنا۔

اب ایسا ہے کہ میں پرسوں آدھی رات کے وقت آؤں گا تم تیار رہنا۔ لیکن زہر کا کیپسول تمھیں آسامی خادمہ کے ہاتھ ڈبی میں بند کر کے بھجوا دوں گا۔ تم رات کو اس ہندو حرامزادے کو ختم کر دینا۔ مگر جب تک ہم یہاں سے نکل نہیں جاتے کاٹل کی موت کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیئے۔"

نجمی نے گرجن سنگھ کو تسلی دلاتے ہوئے کہا۔

"کسی کو خبر ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ تو میرے پلنگ پر مردہ پڑا ہوگا۔ کسی کو کیا معلوم کہ وہ مر گیا ہے میں پرسوں رات تمھارا انتظار کروں گی۔"

گرجن سنگھ نے ہاتھ جوڑ کر ست سری اکال کہا۔ اٹھا اور فوراً ہی یہ کہہ کر بیٹھ گیا کہ میں اکیلا تو یہاں سے نکل ہی نہیں سکتا مجھے تو وہ آسامی بوڑھی بلی ہی یہاں سے نکال سکتی ہے۔"

"چلو ساتھ والے کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ وہ آ ہی رہی ہوگی۔"

نجمی اور گرجن سنگھ ساتھ والے کمرے میں آ گئے۔ تین منٹ بعد آسامی خادمہ آ گئی۔ گرجن سنگھ چلا گیا۔

اسی دن رات کو جاگیردار بن مانس کاٹل بھی واپس پہنچ گیا۔ جب اسے پتہ چلا کہ گرجن سنگھ پائلٹ ایک دن زیادہ وہاں رہا ہے تو اس نے سارے نوکروں کو فال ان کرا دیا اور باری باری سب سے پوچھا کہ گرجن سنگھ ایک دن جو فالتو جزیرے میں ٹھہرا ہے تو وہ کیا کرتا رہا ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ یہاں نہیں تھا کسی نے یوں ہی کہہ دیا کہ وہ شراب پی کر فارم میں پڑا رہا تھا۔ رات کو جب کاٹل نجمی کے بیڈروم میں آیا تو اس سے بھی نشے کی حالت میں بار بار پوچھنے لگا۔

"وہ سکھ یہاں ایک دن زیادہ کیوں ٹھہرا؟"

نجمی نے کہا "میں نے تو اسے آج تک دیکھا بھی نہیں۔ آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں۔"

کاٹل شراب پینے اور منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا۔ وہ گرجن سنگھ کو گالیاں بک رہا تھا۔

دوسرا دن بھی گزر گیا۔ تیسرا دن آ گیا۔ اس روز نجمی کو بے چینی سے شام کا انتظار تھا۔ آج رات اسے انتقام کی آگ بجھا کر اور کاٹل کو جہنم رسید کر کے وہاں سے نکل جانا تھا کسی وقت اسے خیال آتا کہ ہو سکتا ہے گرجن سنگھ کو بعد میں خیال آ گیا ہو کہ وہ خواہ مخواہ اس مصیبت میں کیوں پڑے اور اس نے اپنا ارادہ بدل دیا ہو۔ وہ کبھی کچھ سوچتی کبھی کچھ سوچتی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دن گزرتا چلا گیا پھر سورج غروب ہوگیا۔ آسمان پر بادل اس روز نہیں تھے۔ دن بھر دھوپ کی وجہ سے سخت حبس رہا تھا۔ شام کے وقت بھی شدید حبس تھا۔ دن کے وقت آسامی خادمہ ناشتے کے وقت آئی تھی۔ اس کے بعد اس نے اپنی شکل تک نہیں دکھائی تھی۔ جب شام کے بعد رات کا اندھیرا چھانے لگا تو نجمی کو پریشانیوں نے گھیر لیا۔ گرجن سنگھ نے ضرور اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔ ورنہ وہ آسامی خادمہ کے ہاتھ زہر کا کیپسول ضرور بھیجتا۔

رات کے کھانے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ جاگیردار کاٹل کا یہ معمول تھا کہ وہ رات کے دس بجے کھانا وغیرہ کھا کر نجمی کے پاس آتا تھا۔ وہ نجمی کے پاس بیٹھ کر صرف شغل مے نوشی سے جی بہلایا کرتا تھا۔ بیڈروم کے کلاک رات کے ٹھیک آٹھ بجا رہا تھا کہ آسامی خادمہ اندر داخل ہوئی اس کے رویے میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا تھا۔ حالانکہ طے شدہ پروگرام کے مطابق اسے علم ہونا چاہیے تھا کہ وہ آج آدھی رات کے وقت وہاں سے فرار کروا رہی ہے۔ مگر یہ ایسی پتھر کی بے جان جذبات والی عورت تھی کہ اس کا چہرہ ہر قسم کی صورتِ حال میں ایک جیسا ہی رہتا تھا۔ نجمی کے دل میں کھلبلی ہو رہی تھی کہ آخر یہ اسے کیوں نہیں کہتی کہ رات کو تیار رہے۔

آسامی خادمہ نے قریب آ کر اپنے بلاؤز کے اندر سے رومال میں لپٹی ہوئی ایک چھوٹی سی ڈبی نجمی کو دی اور کہا۔

"یہ تمھارے دوست سکھ نے دی ہے اور ہاں آج رات کے ساڑھے بارہ بجے تیار رہنا۔ اگر سو گئیں تو اس جگہ سے کبھی آزاد نہیں ہو سکو گی۔"

نجمی کی جان میں جان آئی اس نے ڈبی لے لی اور آسامی خادمہ کا شکریہ ادا کرنے والی تھی کہ وہ واپس پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ نجمی ڈبی لے کر ساتھ والے کمرے میں آ گئی۔ اس نے ڈبی کھولی اس میں ایک کیپسول تھا۔ کیپسول میں تھوڑا سا سفید رنگ کا سفوف تھا۔ نجمی سمجھ گئی کہ یہ کوئی بڑا ہی مہلک اور بے ذائقہ زہر ہے اس نے کیپسول اپنے بلاؤز میں چھپا لیا۔ رات کے دس بج رہے تھے کہ رندہ صفت مرہٹہ جاگیردار کاٹل جھومتا جھامتا کمرے میں داخل ہوا آج نجمی کو اس کا بے تابی سے انتظار تھا اس نے حسبِ عادت آتے ہی نجمی کو انگریزی میں گندی گالیاں دیں۔ پھر آتشدان کے پاس آلاتِ مے نوشی لے کر بیٹھ گیا۔

نجمی آج اس کی زیادہ آؤ بھگت کر رہی تھی۔ خود جام تیار کر کے اسے پیش کرتی وہ پہلے ہی نشے میں تھا۔ کچھ دیر تک وہ آتشدان کے پاس بیٹھا رہا پھر اٹھا اور پلنگ پر نیم دراز ہو گیا۔ وہ مسلسل بولے جا رہا تھا کبھی نجمی کو گندی گالیاں دینے لگتا کبھی اس کے جسم کی تعریف کرنے لگتا نجمی نے ایک گلاس میں شراب ڈال کر اس میں کیپسول کا زہر ملا دیا تھا اور گلاس میز کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کاٹل سونے سے پہلے ایک آخری جام ضرور پیتا ہے اور یہ اس کی زندگی کا واقعی آخری جام ہی تھا نجمی اس کی دلجوئی میں مصروف تھی۔

پھر نجمی نے گلاس اٹھا کر کاٹل کو انتہائی دلربائی کے ساتھ پیش کیا اور کہا "کیا آپ میری خاطر نوش نہیں کریں گے۔"

کاٹل نے قہقہہ لگا کر ہنسنے کی کوشش کی مگر آواز اس کی تو ند میں ہی پھنس کر رہ گئی۔ وہ ذرا سا اٹھ بیٹھا اس نے نجمی کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور اس کی آنکھوں میں اپنی لال لال آنکھیں ڈال کر بولا "اس میں کچھ ملا تو نہیں دیا تم نے۔"

نجمی کا جسم ایک بارگی تو سن ہو کر رہ گیا فوراً کاٹل کے بھدے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر انگریزی میں بولی۔

"خدا کے لیے ایسا پھر نہ کہنا اب تمھارے سوا میرا کون ہے میں تو یہاں شہزادیوں کی طرح عیش کر رہی ہوں۔"

بن مانس نما کاٹل نے غٹا غٹ گلاس میں جو کچھ بھی تھا اسے حلق میں انڈیل لیا خدا جانے گرجن سنگھ کس قسم کا زہر لایا تھا پیتے ہی کاٹل کا سانس بند ہو گیا اس کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں اس کے بھاری بھرکم بھینسے جیسے جسم کو ایک دھچکا لگا وہ پلنگ پر ایک فٹ اوپر کو اچھلا پلنگ کر کر اگیا نجمی پلنگ سے کود کر پرے ہو گئی کاٹل اسے خونی نظروں سے تک رہا تھا۔ ہاتھ اس کی طرف بڑھائے اسے پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا اس کی آواز بند ہو گئی تھی حلق سے خرخر کی آواز آ رہی تھی لگتا تھا اس کے پیٹ کی ہر شے کٹ رہی ہے وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں رہا تھا۔ پھر اس کے منہ سے خون ابل پڑا اور اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔

٭ ٭ ٭

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیڈروم کی روشنی پہلے ہی دھیمی تھی۔

نجمی نے چادر درندہ صفت کاٹل کی لاش پر ڈال دی وہاں کسی ملازم یا خادمہ کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا گرجن سنگھ پامکٹ نے نجمی کو ایسا مہلک زہر لاکر دیا تھا کہ اسے پیتے ہی کاٹل کا جگر وغیرہ کٹ گیا تھا اور اس کے حلق سے آواز تک نہ نکل سکی ورنہ اگر وہ شور مچا دیتا یا ایک چیخ بھی بلند کرتا تو بیڈروم کے باہر راہداری میں موجود گورکھا سپاہی دروازہ توڑ کر اندر آجاتا اور سارے کیے کرائے پہ پانی پھر جاتا۔

نجمی نے کلاک کی طرف دیکھا۔ ابھی رات کے بارہ نہیں بجے تھے پلنگ پر کاٹل کی بے حس لاش چادر میں ڈھکی ہوئی پڑی تھی۔ نجمی کو خوشی تھی کہ اس نے ایک درندے کے ظلم و ستم سے آنے والی عورتوں کو بچا لیا اور اپنے اوپر کیے گئے ظلم کا بدلہ بھی لے لیا ہے۔ کاٹل کا ہنٹر آتشدان کے پاس دیوار پر ٹنگا ہوا ہے۔ نجمی کا دل چاہا کہ وہ لاش پر اتنی دیر تک ہنٹر برساتی رہے جب تک وہ تھک کر گر نہیں پڑتی لیکن وہ خاموش رہی۔

اب اسے گرجن کا انتظار تھا اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر آہستہ سے پٹ کھول کر نیچے دیکھا بارش کی ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی لان میں جو کھمبے لگے تھے ان کے بلب روشن تھے۔ گیٹ بند تھا۔

نجمی پیچھے ہٹ گئی گرجن سنگھ کو کسی دوسرے راستے سے محل کے بیڈروم میں آنا تھا۔ وہ ساتھ والے کمرے میں آگئی۔ کتابوں کے شیلف کے پہلو میں جو ریشمی بھاری پردہ گرا ہوا تھا۔ اسے ہٹا کر دیکھا وہاں سوائے کتابوں کے شیلف کے اور کچھ نہیں تھا۔ اس شیلف کو ایک طرف ہٹنا

تھا۔ پھر گرجن سنگھ کو آنا تھا۔ وقت بڑی مشکل سے گزر رہا تھا۔

نجمی بیڈروم میں آئی تو چادر کے نیچے لاش اسی طرح ساکت تھی اس نے چادر کو ذرا سا ہٹا کر دیکھا کاٹل کا سیاہ فام چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا اس نے جلدی سے چادر ڈھک دی۔

بیڈروم کے کلوزٹ میں اس کی ایک قیمتی نیلی جینز نما پتلون پڑی تھی اس نے شب خوابی کا لباس اتار کر پتلون اور جیکٹ پہن لی۔ پاؤں میں ٹخنوں تک بند چمڑے کے جوتے پہنے اور بالوں کو گردن پر رومال سے باندھ لیا جیب میں کچھ رقم ٹھونس لی اور بے چینی سے گرجن سنگھ کا انتظار کرنے لگی۔

جب آدھی رات بھی گزر گئی تو نجمی کو فکر لاحق ہوئی اگر گرجن سنگھ کسی وجہ سے نہ آسکا تو سارا کام خراب ہو جائے گا۔ اس نے ایک بار پھر سائیڈ روم میں جا کر شیلف کو دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا اسی وقت شیلف کو حرکت ہوئی نجمی کا دل زور سے دھڑک اٹھا شیلف ایک طرف کھسک گیا پھر پردے کے پیچھے سے آسامی خادمہ نمودار ہوئی وہ نجمی کو پتلون اور جیکٹ میں دیکھ کر کچھ حیران سی ہوئی نجمی اس سے گرجن سنگھ کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی کہ آسامی خادمہ نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور آہستہ سے پوچھا" راج. جی سو گئے ہیں؟"

نجمی نے بھی آہستہ سے جواب دیا

"وہ گہری نیند سو رہے ہیں۔"

آسامی خادمہ نے نجمی کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ نجمی نے پہلی بار کتابوں کے شیلف کے پیچھے ایک زینہ نیچے اترتا دیکھا یہ زینہ عقبی لان کے برآمدے کے کونے میں بنی ہوئی ایک کوٹھڑی میں نکلتا تھا۔ کوٹھی میں آٹے چاول کی بوریاں بھری ہوئی تھیں آسامی خادمہ نے کوٹھڑی کا دروازہ.. کھول کر باہر جھانک کر دیکھا پھر نجمی کو ساتھ لے کر برآمدے سے نکلتی لان کے درختوں کے نیچے آگئی۔ بارش کی پھوار پڑ رہی تھی ہوا میں خنکی اور ناریل کے درختوں کی دھیمی مرطوب مہک رچی ہوئی تھی۔ باغ ختم ہوا تو کاٹل کے محل کی دیوار آگئی۔ یہاں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جو کھلا تھا۔ دروازے کی دوسری جانب اندھیرے میں نجمی کو گرجن سنگھ کا سایہ دکھائی دیا۔ گرجن سنگھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان دونوں کو دیکھتے ہی آگے آگے چلنے لگا۔ یہاں اندھیرے میں جھاڑیاں اور گھاس اور ناریل کے درخت بے ترتیبی سے اُگے ہوئے تھے ان جھاڑیوں میں وہ دس پندرہ منٹ تک چلتے رہے۔ اب سمندر کا کنارہ آ گیا یہاں ایک چھوٹی سی کشتی کھڑی تھی۔

گرجن سنگھ نجمی کے قریب آیا اور بولا "ہرنام جی کام ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا۔؟"

نجمی نے آہستہ سے کہا ---

"واہگورو کی کرپا سے سب ٹھیک ہو گیا ہے۔"

گرجن سنگھ نے اندھیرے میں ہی ایک ہاتھ سے اپنی بندھی ہوئی داڑھی کو اوپر چڑھایا اور نجمی کو سہارا دے کر کشتی میں سوار کرا دیا۔ آسامی خادمہ نے انگریزی میں گرجن سنگھ سے اپنی رقم کا مطالبہ کیا۔ نجمی کے کان کھڑے ہو گئے آسامی خادمہ کی موت کا وقت آن پہنچا تھا۔ نجمی کے لیے کسی دشمن کو ہلاک کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ گرجن سنگھ اس عورت کو کیسے ہلاک کرتا ہے گرجن سنگھ نے آسامی خادمہ کو انگریزی میں ہی جواب دیا۔

"میڈم تم میرے ساتھ چلو۔ سندر سنگھ کے پاس پہنچ کر تمھیں تمھاری رقم دے دوں گا۔"

آسامی خادمہ غصّے میں آ گئی۔

"تم میرے ساتھ دھوکا نہیں کر سکتے میری رقم ابھی دو نہیں تو میں شور مچا دوں گی۔"

گرجن سنگھ نے سکھوں والا کام کیا۔ اچھل کر آسامی خادمہ کی گردن دونوں ہاتھوں سے دبوچ لی وہ اس کے ساتھ ہی زمین پر گر پڑی اس کے حلق سے خرخر کی دو بار آواز نکلی۔ گرجن سنگھ بھرپور جوان تھا آسامی خادمہ ادھیڑ عمر عورت تھی جب گرجن سنگھ اس سے الگ ہوا تو وہ گھاس پر مردہ حالت میں پڑی تھی۔ گرجن سنگھ نے اس کی لاش کو بھی کشتی میں ڈال لیا اور کشتی چلاتا کھلے سمندر کی طرف چل پڑا۔ نجمی نے جھک کر آسامی خادمہ کو دیکھا اس کی آنکھیں تھوڑی تھوڑی کھلی تھیں جیسے وہ نجمی کو دیکھ رہی ہو۔ گرجن سنگھ پوری طاقت سے چپو چلا رہا تھا اب نجمی نے بھی چپو چلانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کاٹل جاگیردار کے مختصر سے جزیرے سے کافی دور نکل گئے اب گرجن سنگھ نے لاش کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا۔

"اسے مچھلیاں کھا جائیں گی۔"

نجمی نے کہا "تم گورو کے سچے سنگھ ہو۔"

گرجن سنگھ بولا "اب مجھ پر کسی کو شک و شبہ نہ ہو گا۔ ویسے میں تمھیں سندر سنگھ کے پاس چھوڑ کر صبح واپس آ جاؤں گا تاکہ معلوم کر سکوں کہ پیچھے کیا ردعمل ہوا ہے۔ اگر میں تمھارے ساتھ ہی چلا گیا جو کہ مجھے جانا ہی ہے تو یہاں سب کو یہی شبہ ہو گا کہ میں کاٹل کو قتل کر کے تمھیں اغوا کر کے بھاگ گیا ہوں۔"

اصولی طور پر گرجن سنگھ نے ٹھیک سوچا تھا۔ سندر سنگھ جس جزیرے میں رہتا تھا وہ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ سندر سنگھ ان لوگوں کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ یہ جزیرہ بھی درختوں سے بھرا ہوا رات کی تاریکی میں بڑا ڈراؤنا لگ رہا تھا اور زیادہ بڑا نہیں تھا گرجن سنگھ کشتی کو جزیرے کی پچھلی طرف سمندر پر جھکے ہوئے درختوں کے نیچے چھوٹی چھوٹی چٹانوں میں لے گیا یہاں سندر سنگھ پہلے سے موجود تھا وہ بھاری بھرکم سکھ تھا۔ اندھیرے میں اس کی شکل نجمی اچھی طرح نہ دیکھ سکی۔ اس نے نجمی کو ہاتھ جوڑ کر ست سری اکال کیا۔ نجمی نے بھی ہاتھ جوڑ کر جواب میں ست سری اکال کہا کشتی انھوں نے اوپر کھینچ کر جھاڑیوں میں چھپا دی۔ سندر سنگھ کا یہاں ناریل کا ایک باغ تھا۔ اس باغ میں اس نے اپنے لیے ایک چھوٹا سا لکڑی اور بانس کا کاٹج بنا رکھا تھا اور یہاں اکیلا رہتا تھا۔ کاٹج کے پیچھے ایک چھوٹا سا اسٹور تھا سندر سنگھ نے اسے پہلے ہی سے خالی کر دیا تھا۔ یہاں ایک چارپائی پر بچھونا اور مچھردانی لگا دی گئی تھی۔ بجلی اس جزیرے پر نہیں تھی۔ سندر سنگھ نے نجمی کو بڑے احترام سے اس اسٹور میں بٹھایا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"سری گرنتھ صاحب کے والی گرنتھی کی بیٹی کے لیے ہمارا سر بھی حاضر ہے۔ آپ جی یہاں آرام کریں۔"

گرجن سنگھ بھی بڑے احترام سے کھڑا تھا کہنے لگا۔

"ہرنام جی! تم آرام کرو صبح بات کریں گے۔"

گرجن سنگھ اور سندر سنگھ دروازے کو باہر سے تالا لگا کر چلے گئے تالا لگانے سے نجمی کو کچھ شک سا ہوا گو یہ شک زیادہ دیر اس کے دل میں نہ رہ سکا وہ مچھردانی کے اندر بچھونے پر لیٹ گئی اس کی آنکھوں کے سامنے دیدہ صفت کاٹل کا خون میں لتھڑا ہوا چہرہ آ رہا تھا اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نفرت سے منہ دوسری طرف کر لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ اسٹور میں بارش کی وجہ سے ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ مچھر دانی نے مچھروں کو روک دیا تھا جس کی وجہ سے نجمی جلدی سو گئی۔

صبح جب وہ اٹھی تو دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ سندر سنگھ دروازہ کھول کر آ گیا نجمی نے دیکھا کہ وہ بھری بھری داڑھی والا موٹا سکھ ہے جس کی داڑھی میں سفید بال آنا شروع ہو گئے تھے۔ اس نے سیاہ رنگ کی اکالیوں والی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ ہاتھ جوڑ کر اس نے نجمی کو ست سری اکال بلایا اور کہنے لگا۔

"کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ہرنام کور جی؟" نجمی بستر سے باہر نکل آئی۔

"بالکل نہیں سردار جی! آپ کا بڑا دھنواد ہے۔"

سندر سنگھ ہاتھ جوڑے جوڑے بولا۔

گورو کے پیاروں اور پیاریوں کے لیے تو ہماری جان بھی حاضر ہے گرنتھی کے خاندان پر آنچ نہیں آ سکتی آپ آ کر چائے پانی کر لیں۔ گرجن سنگھ تو واپس چلا گیا کہہ گیا ہے کہ پرسوں آ جاؤں گا اس کا جانا بڑا ضروری تھا ہرنام جی! اس طرح سے تو سب کو اسی پر شک پڑتا۔"

نجمی سندر سنگھ کے ساتھ اسٹور روم سے باہر نکلی باہر بارش رکی ہوئی تھی۔ سبزہ رات کی پھوار سے نکھر گیا تھا۔ درختوں پر کہیں کہیں کوئل بول رہی تھی سندر سنگھ کے کاٹج کے پچھلے کمرے میں میز پر ناشتہ لگا ہوا تھا سندر سنگھ کہنے لگا۔

"میرے یہاں مکان پر دو ملازم ہی ہیں میں نے ان کو بھی دو تین دنوں کے لیے دوسرے جزیرے پر اپنے اپنے گھر بھیج دیا ہے اب آپ جی میرے کاٹج کے کسی بھی کمرے میں سو سکتی ہیں"

سندر سنگھ چلا گیا نجمی نے ناشتہ کیا اور کھڑکی کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا وہ یہاں سے خیریت کے ساتھ نکل جائے گی بڑا لمبا سفر تھا۔ کاٹل کی لاش کے ملتے ہی اب تک جزیرہ مارشل کی پولیس بھی وہاں پہنچ گئی ہو گی اور اس کی تلاش بھی شروع ہو گئی ہو گی۔ نجمی سوچنے لگی کہ کیا وہ اس چھوٹے سے جزیرے میں محفوظ ہے؟ مارشل جزیرے کی پولیس اس کی کھوج میں وہاں بھی پہنچ سکتی تھی اسے سندر سنگھ پر پورا اعتماد تھا کہ وہ ایک بہادر آدمی کی طرح اس کی حفاظت کرے گا۔ معاملہ گرنتھی کی بیٹی کا بھی تھا یہ فارمولا بڑا کامیاب رہا تھا اور نجمی کی

ذات کے گرد سکھ دھرم کا ایک ہالہ سا بن گیا تھا جس کی وجہ سے سندر سنگھ اور گرجن سنگھ ہر لمحے اس پر اپنی جان نثار کرنے پر تیار تھے۔

دن گزر گیا رات بھی گزر گئی۔ دوسرے روز رات کے وقت گرجن سنگھ واپس آ گیا اس نے بتایا کہ کاٹل کی لاش دن کے آٹھ بجے ملی اسی وقت پولیس کو اطلاع کر دی گئی کہ جاگیردار کاٹل کو قتل کر دیا گیا ہے اور محل سے اس کی داشتہ اور آسامی خادمہ غائب ہیں دس بجے پولیس وہاں پہنچ گئی میں بھی مارشل جزیرے میں ہی تھا قتل کا سن کر میں نے بھی بظاہر سخت افسوس کا اظہار کیا اور پولیس کے ساتھ ہی محل میں آ گیا۔

پولیس نے آس پاس کے سارے جزیروں میں اپنے مخبروں اور جاسوسوں کو چھوڑ دیا ہے۔ ہمیں بڑی احتیاط سے کام لینا ہو گا۔"

سندر سنگھ بولا "ان کی کیا مجال کہ یہاں آ کر ہرنام جی کو لے جائیں۔ میں ایک ایک کو بھون کر رکھ دوں گا۔ یہ گورو گرنتھ صاحب کا معاملہ ہے۔"

گرجن سنگھ نے سندر سنگھ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "تمھیں ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔ پولیس یہاں آ بھی گئی تو ہم نے یہ ظاہر ہی نہیں ہونے دینا کہ ہرنام جی یہاں ہیں۔"

سندر سنگھ کا خدشہ درست نکلا۔ اگلے روز پولیس کے آدمی آ گئے ان میں ایک تامل ہیڈ کانسٹیبل اور دو جزیرے کے مقامی کانسٹیبل تھے۔ سندر سنگھ نے ان کی خوب آؤ بھگت کی۔۔ گرجن سنگھ بھی نجمی کے ساتھ ساتھ ہی ایک جھونپڑی میں چھپ گیا تھا۔ سندر سنگھ نے بڑی ڈپلومیسی سے کام لیا اور ایک گھنٹہ وہاں رہنے کے بعد پولیس کے آدمی کھا پی کر چلے گئے۔ ان کا اسٹیمر جب سمندر میں نظروں سے اوجھل ہو گیا تو سندر سنگھ جھونپڑی میں آ گیا۔

"وہ لوگ چلے گئے ہیں اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

نجمی، گرجن سنگھ اور سندر سنگھ کاٹج کے چھوٹے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے گرجن سنگھ کہنے لگا۔

"اب ہمیں یہاں زیادہ دیر نہیں رہنا ہے۔ کیونکہ پرسوں تمھارے نوکر بھی واپس آ جائیں گے"

سندر سنگھ بولا "تمھارا کیا پروگرام ہے کیا اکیاب پہنچ کر تم ہیلی کا پٹر حاصل کر سکو گے؟"

گرجن سنگھ نے کہا۔۔۔۔ "میرا ہیلی کاپٹر کل سے وہاں پہنچ گیا ہے اور جیلی کے ہینگر میں موجود ہوگا میں وہاں جاکر اسے حاصل کر سکتا ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ تمھارے اسٹیمر کی کیا پوزیشن ہے؟"

سندر سنگھ نے بتایا کہ اس کا اسٹیمر بھی تیار ہے صرف اسے بڑے اسٹیمر والے اسمگلر فرینڈو کو اطلاع کرنی ہوگی۔ وہ گرجن سنگھ کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

فرینڈو کا بڑا اسٹیمر تم لوگوں کو اکیاب کی طرح جاتے ہوئے راستے میں ہی ملے گا جیسا کہ تم جانتے ہو فرینڈو اس علاقے کا نامی گرامی سمگلر ہے اور میرا یار غار ہے میں نے اس سے پہلے ہی ساری بات سمجھا دی ہے وہ تمھارے بڑے میں کسی سے کوئی بات نہیں کرے گا۔ ہمارے راز ایک دوسرے کے پاس بالکل محفوظ ہوتے ہیں وہ تمھیں بھی جانتا ہے۔"

"پھر تمھارے خیال میں ہمیں کب یہاں سے نکلنا چاہیئے۔؟"

گرجن نے پوچھا۔

سندر سنگھ بولا۔

"آج رات پڑتے ہی تم میرا اسٹیمر لے کر یہاں سے نکل جاؤ سمندری راستے کا تمھیں علم ہی ہے۔ میں فرینڈو کو اطلاع کر دوں گا وہ تمھیں یہاں سے بچاس میل شمال کی جانب سمندر سے اٹھالے گا اب یہ خطرہ تو تمھیں مول لینا ہی پڑے گا۔"

گرجن سنگھ نے اپنی پگڑی کو ٹھیک طرح سے جماتے ہوئے کہا۔

"کوئی خطرہ نہیں سندر سنگھ کوئی خطرہ نہیں۔ ہاں ہرنام جی کو کہیں ڈر تو نہیں لگے گا۔؟"

یہ لوگ ابھی تک "ہرنام جی" یعنی نجمی کو بالکل نہیں جانتے تھے کہ وہ اصل میں کون ہے۔

نجمی نے تھوڑی گھبراہٹ کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"ڈر تو ضرور لگے گا جی سمندر سے مگر سنگھنی ہوں سنگھنی موت سے نہیں ڈرتی۔ پھر گرجن سنگھ جی میرے ساتھ ہوں گے۔"

گرجن سنگھ نے کہا

"ہرنام جی! میں تو اب آپ کو آپ کے پتا جی گرنتھی لاکھ سنگھ جی کے گھر پہنچا کر ہی دم لوں گا میں نے تو سنگھنی کی قسم کھا کر گوردوارہ جن ریو جی کی ارداسی بھی کر رکھی ہے۔"

سندر سنگھ بولا۔۔۔ "تو پھر ٹھیک ہے کل رات تم لوگ یہاں سے گورو کا نام لے کر نکل پڑنا۔ میں فرینڈو کے پاس ابھی آدمی بھجوا دیتا ہوں اس کا اسٹیمر یہاں قریب کے جزیرے میں ہوتا ہے۔"

دوسری رات سندر سنگھ نے نجمی اور گرجن سنگھ کو اپنے اسٹیمر میں سوار کرایا اور ہاتھ باندھ کر بولا۔

"گورو تمھاری رکھشا کریں گے ہرنام جی! مجھ سے کوئی بھول ہوگئی ہو تو شما کر دینا۔"

گرجن سنگھ اسٹیمر کو ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ ایک اچھا انجینئر تھا۔ بہت جلد وہ اسٹیمر کو جزیرے سے دور لے گیا اس نے نجمی کو بتایا کہ وہ ایسے سمندری علاقے میں سفر کرے گا جہاں پولیس کی گشتی پارٹی کے ملنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ رات اندھیری تھی آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا مرطوب ہوا چل رہی تھی خدا کا شکر تھا کہ سمندر میں طوفان نہیں تھا۔ پھر بھی سمندر اوپر تلے ہو رہا تھا۔ ایک گھنٹہ سمندر میں سفر کرنے کے بعد گرجن سنگھ نے اسٹیمر کی رفتار کم کر دی اور وہ اسے ایک خاص علاقے میں دائرے کی شکل میں گھمانے لگا۔

"فرینڈو کے اسٹیمر کو ہمیں اسی جگہ ملنا ہوگا۔"

آدھ گھنٹہ اسٹیمر دائرے کی شکل میں سمندر میں ایک ہی جگہ چکر لگاتا رہا پھر دور سے روشنی نظر آئی۔ گرجن سنگھ نے اپنے اسٹیمر کی بتیاں بجھا رکھی تھیں کہنے لگا۔

"یہ فرینڈو کے اسٹیمر کی بتی ہی ہو سکتی ہے مگر میں اس وقت تک اپنے اسٹیمر کی بتی نہیں جلاؤں گا جب تک مجھے سگنل نہیں ملتا۔"

دو منٹ بعد روشنی قریب آگئی اب وہاں اسٹیمر کے اوپر ایک نیلی روشنی تین بار چمک کر بجھ گئی گرجن سنگھ خوش ہو کر بولا۔

"ہرنام جی! یہ فرینڈو کا ہی اسٹیمر ہے۔"

اب گرجن سنگھ نے بھی اپنے اسٹیمر کی بتی جلا کر سگنل دیا۔ دونوں اسٹیمر کھلے سمندر میں رات کے اندھیرے میں ایک دوسرے کی طرف بڑھنے لگے۔

جب فرینڈو کا اسٹیمر قریب [illegible] کہ وہ اسٹیمر کافی بڑا تھا اور اس پر دھان اور [illegible] کے بڑے بڑے بورے لدے ہوئے تھے۔ ایک آدمی اسٹیمر کے ڈیک پر جنگلے کے پاس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھڑا تھا اس نے وہیں کھڑے کھڑے انگریزی میں پوچھا۔

"سمندر کے کون ہو تم ؟"

گرجن سنگھ کو بتا دیا گیا تھا کہ اسے کیا کہنا ہوگا۔ اس نے بھی بلند آواز میں انگریزی میں کہا

"میں سمندر کا بھائی ہوں۔"

اس پر فرینڈو بولا۔" میں فرینڈو ہوں گرجن۔ آ جاؤ۔"

فرینڈو کے اسٹیمر پر اس کے علاوہ دو آدمی تھے۔ نجمی اور گرجن سنگھ کو اوپر اسٹیمر پر اٹھا لیا گیا۔ فرینڈو نے آگے بڑھ کر گرجن سنگھ کو گلے لگایا اور نجمی کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"نمستے۔"

نجمی نے بھی ہاتھ جوڑ کر نمستے کہا ایک آدمی فرینڈو کے حکم پر سندر سنگھ کے چھوٹے اسٹیمر میں اتر گیا اور اسے واپس لے کر سمندر کی تاریکی میں غائب ہو گیا وہ اسٹیمر واپس سندر سنگھ کے جزیرے پر لے جا رہا تھا۔ فرینڈو نجمی اور گرجن سنگھ کو نیچے اپنے کیبن میں لے آیا یہاں مشروب کی بوتلیں پڑی تھیں۔

گرجن سنگھ نے بوتلوں کو دیکھتے ہی کہا۔

"فرینڈو! ان بوتلوں کو یہاں سے ہٹا دو۔ ان کی ضرورت نہیں ہے۔"

فرینڈو ایک چوڑے شانوں والا سانولا پرتگالی اسمگلر تھا ہنس کر بولا" میں سمجھ گیا۔ میں سمجھ گیا کوئی بات نہیں" اور اس نے بوتلیں میز سے اٹھا کر نیچے ایک طرف رکھ دیں کیبن میں ایک طرف دیوار کے ساتھ برتھ بنا ہوا تھا جس پر بستر لگا تھا۔ فرینڈو نے نجمی سے کہا۔

"مسٹر! تم آرام کرو۔ ہم دوسرے کیبن میں چلے جاتے ہیں۔"

نجمی نے شکریہ ادا کیا اور برتھ پر بچھے ہوئے بستر پر لیٹ گئی۔ اسٹیمر کا انجن ان کے نیچے آتے ہی اسٹارٹ ہو گیا تھا اور اس نے کھلے سمندر میں ایکاب کی طرف اپنا سفر شروع کر دیا تھا۔ گرجن سنگھ اور فرینڈو کیبن کا دروازہ بند کر کے وہاں سے چلے گئے۔ نجمی برتھ پر لیٹ گئی۔ اسٹیمر سمندری [illegible] ڈول رہا تھا مگر نجمی کو نیند آ گئی۔

اسٹیمر ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ سفر کرتا رہا۔ منہ اندھیرے اسٹیمر ایکاب

بندرگاہ سے تھوڑے فاصلے پر ایک جگہ رک گیا۔ فرینڈو اور گرجن سنگھ ڈیک پر موجود تھے۔ فوراً سمندر میں لنگر ڈال دیا گیا۔ اسٹیمر کی ساری بتیاں گل کر دی گئیں۔ اسٹیمر پر اندھیرا تھا۔ ساحل سمندر پر بھی اندھیرا تھا۔ آسمان چونکہ بادلوں سے بھرا ہوا تھا اس لیے صبح کاذب کی روشنی بھی دبی دبی سی تھی۔ گرجن سنگھ بھی جیکٹ اور پتلون میں تھا اس نے فرینڈو سے کہا۔" میں ساحل سمندر پر ہی ہیلی کاپٹر کو لاتا ہوں ہرنام جی ابھی سو رہی ہیں میں آ کر انھیں جگاؤں گا۔"

یہ کہہ کر گرجن سنگھ ایک چھوٹی ڈونگی میں بیٹھ کر ساحل پر اتر گیا اور ریت پر چلتا درختوں میں غائب ہو گیا۔ فرینڈو نے اپنے دونوں آدمیوں کو دونوں کونوں پر رائفلیں دے کر کھڑا کر دیا کہ اگر کوئی خطرہ پیش آ جائے تو اس کا مقابلہ کیا جائے۔ گرجن سنگھ جنگل کے سارے راستوں سے باخبر تھا۔ وہ وہاں سے نکل کر جیٹی کے ہینگر میں پہنچ گیا۔ کارڈ اس کے پاس تھا۔ شیڈول کے مطابق اسے صبح صبح ہیلی کاپٹر واپس مارشل جزیرے پر لے جانا تھا گارڈ کے اعتراض کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

نجمی کی اچانک آنکھ کھل گئی اس نے محسوس کیا کہ اسٹیمر کھڑا ہے اور اس کا انجن بھی بند ہے وہ کیبن سے نکل کر اوپر ڈیک پر آ گئی منہ اندھیرے کا سماں تھا صبح کاذب کے اندھیرے میں سے ساحل کے درختوں کے خاکے ابھرنے لگے تھے۔ فرینڈو جلدی سے نجمی کے پاس آیا اور انگریزی میں سلام کر کے بولا۔

"میڈم! گرجن سنگھ ہیلی کاپٹر لے کر آتا ہی ہوگا سب ٹھیک ہے۔"

نجمی نے فرینڈو کا شکریہ ادا کیا اور پٹ سن کے گٹھوں کے پاس کھڑی ہو کر ساحل سمندر کے درختوں کو تکنے لگی صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی مرطوب ہوا چل رہی تھی اتنے میں فضا میں گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی فرینڈو نے کہا۔

"گرجن آ گیا ہے۔"

نجمی کی نگاہیں مشرق کی جانب بادلوں بھرے آسمان پر لگی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد وہاں ہیلی کاپٹر کی نیلی اور سرخ روشنی دکھائی دی اس کے بعد ہیلی کاپٹر نیچے ہوتا گیا اور پھر ساحل کی ریت پر ایک جگہ اتر گیا۔ فرینڈو اور نجمی ڈیک پر خاموش کھڑے ہیلی کاپٹر کی طرف دیکھ رہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے۔ ڈونگی پہلے ہی سے ساحل پر تھی۔ گرجن سنگھ ہیلی کاپٹر میں سے نکل کر دوڑتا ہوا ڈونگی کی طرف بڑھا اور اسے جپ سے چلاتا اسٹیمر کے پاس آگیا۔ اس نے منہ اوپر کر کے فریڈو سے کہا

"ہرنام جی کو تم ہی جگا دو فریڈو۔ وقت بہت کم ہے۔"

بخمی نے نیچے جھک کر کہا۔

"میں جاگ رہی ہوں سردار جی!"

"او کے۔ نیچے آؤ۔" گرجن کی آواز بلند ہوئی۔

رسی کی سیڑھی لٹکا دی گئی بخمی بڑی احتیاط سے سیڑھی اتر کر نیچے ڈونگی میں آگئی۔ گرجن سنگھ نے فریڈو کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"تھینک یو فریڈو۔"

فریڈو نے مسکرا کر کہا.... "نو پرابلم مائی ڈیئر گرجن! گڈ لک۔"

اس کے ساتھ ہی فریڈو نے لنگر اٹھا دیا گرجن سنگھ ڈونگی چلاتا ساحل پر آگیا بخمی کو ساتھ لیا۔ ہیلی کاپٹر میں اسے اپنے ساتھ والی سیٹ پر بٹھایا۔ انجن اسٹارٹ کیا۔ ہیلی کاپٹر کے بڑے بڑے پر گردش کرنے لگے تھوڑی ہی دیر بعد ہیلی کاپٹر ایک طرف کو جھکا۔ درختوں کے اوپر پرواز کرتا ہوا شمال کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ایک گھنٹے بعد ہیلی کاپٹر انڈیا کے میزورام صوبے کے چمپا ٹاؤن نامی قصبے میں اتر گیا۔ گرجن سنگھ نے بخمی کو بتایا کہ ہیلی کاپٹر اسے یہاں اپنے ایک ساتھی کے حوالے کرنا ہوگا جو اسے لے کر واپس اکیاب اور وہاں سے مارشل جزیرے پر پہنچ جائے گا۔

بخمی نے پوچھا... "یہاں سے آگے ہم کس طرف کو جائیں گے سردار جی؟"

گرجن سنگھ کہنے لگا: "یہ میں واپس آکر بتاتا ہوں۔ تم اسی جگہ رہنا۔ میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔"

بخمی کو گرجن سنگھ نے میزورام کے چمپا ٹاؤن میں ایک جگہ ہیلی کاپٹر سے اتار دیا اور تاکید کی کہ وہ ان چٹانوں کے پاس ہی چھپ کر بیٹھ جائے۔ گرجن سنگھ ہیلی کاپٹر لے کر اڑ گیا بخمی نے ارد گرد دیکھا دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی یہاں بھی آسمان بادلوں سے بھرا ہوا تھا

ارد گرد ناریل کے درخت کم اور مہاگنی کے گھنے درخت زیادہ تھے بخمی عجیب کشمکش میں تھی اسے گرجن سنگھ سے کسی نہ کسی جگہ جلد الگ ہو جانا تھا وہ اس کے ساتھ امرتسر کے گاؤں ویرکا نہیں جا سکتی تھی کیونکہ وہاں لابھ سنگھ نام کا کوئی اس کا باپ نہیں تھا ویسے بھی انڈیا بخمی کے لیے خطرناک ایریا تھا۔ یہاں بنگال، پنجاب اور جموں کی پولیس اس کی تلاش میں تھی اسے ابھی جموں جا کر اپنے ساتھی بادل کا بھی سراغ لگانا تھا وہ اس کا پتہ کیے بغیر بارڈر کراس کر کے پاکستان داخل نہیں ہونا چاہتی تھی وہ اگر خواہش بھی کرتی تو ایسا ناممکن تھا وہ جموں کے محلہ استاداں میں جا کر لال دین کا بھی پتہ کرنا چاہتی تھی۔ اسے دریائے توی کے پار پرانی منگلی کوٹھی میں شاہ جی سے بھی ملاقات کرنی تھی۔ جہاں سے اسے اغوا کیا گیا تھا جس ہندو ڈوگرہ بدمعاش نے اسے اغوا کیا تھا۔ بخمی کو اس سے بھی اپنے اغوا کا بدلہ لینا تھا۔ یہ صورت حال ایسی تھی کہ بخمی گرجن سنگھ کے ساتھ انڈیا کے علاقے میں زیادہ دیر نہیں رہ سکتی تھی۔

آدھ گھنٹے بعد گرجن سنگھ واپس آگیا۔ وہ ایک جیپ میں سوار تھا آتے ہی اس نے بخمی کو بٹھایا اور بولا۔

"یہاں سے ہم ناگا ڈیم چلیں گے۔ وہاں سے دوپہر کے بعد ایک ٹرانسپورٹ فلائٹ آسنول جاتی ہے ہم اس کے ذریعے آسنول پہنچیں گے اور وہاں سے ٹرین پکڑ کر امرتسر کے لیے روانہ ہو جائیں گے واہے گورو کی کرپا سے سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ اب ہرنام جی تم اپنے پتا جی کے پاس بڑی جلدی پہنچ جاؤ گی۔"

بخمی نے گہرا سانس بھر اگرجن سنگھ کا شکریہ ادا کیا۔ اس کی تعریف کی۔ سکھ اپنی تعریف سن کر حیران سا ہوا جیسے بخمی کسی دوسرے آدمی کی تعریف کر رہی ہو۔ جیپ چمپا ٹاؤن کے جنگل میں سے گزرتی ناگا ڈیم کی طرف ایک چھوٹی سی نیم پہاڑی سڑک پر روانہ ہو گئی یہ ساٹھ ستر میل کا فاصلہ تھا جو دو گھنٹے میں طے ہو گیا۔ ناگا ڈیم ایک نیم فوجی اڈہ تھا گرجن سنگھ یہاں کچھ لوگوں کو جانتا تھا۔ انھوں نے اس کی بڑی مدد کی اور بھاری بھرکم ٹرانسپورٹ طیارے میں بٹھا دیا وہیں گرجن سنگھ اور بخمی نے کھانا کھایا اس ٹرانسپورٹ طیارے میں سرکاری سامان آتا جاتا تھا۔ طیارہ گرجتا ہوا فضا میں بلند ہو گیا۔ تین گھنٹے کے سفر کے بعد طیارہ آسنول کے پرانے ائیرپورٹ پر اتر رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اب نجمی کو بے حد محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ آسنول بنگال کا شہر تھا اور آسنول میں نجمی چندا ڈاکو کی حیثیت سے مشہور تھی اور یہاں اس کی تصویریں بھی اخباروں میں چھپ چکی تھیں پولیس ابھی تک اس کی تلاش میں تھی۔

گرجن سنگھ وہاں سے اسے اپنے ایک دوست کے کوارٹر میں لے گیا گرجن سنگھ کا یہ دوست پنجابی ہندو تھا اور آسنول میں ریلوے کی ملازمت کرتا تھا۔ یہاں نجمی نے عیسائی عورتوں کی طرح اپنے بالوں کی منڈلیاں کر کے انھیں کانوں کے اوپر باندھ لیا۔ اس طرح سے اس کا حلیہ تھوڑا سا بدل گیا تھا۔ رات اس نے اسی کوارٹر میں گزاری۔ گرجن سنگھ کا ہندو دوست ریلوے میں ملازم تھا اس نے اگلے روز شام کو امرتسر جانے والی جنتا ایکسپریس میں سیکنڈ کلاس کی دو سیٹیں بک کروا دیں۔ چنانچہ دوسرے روز شام کو گرجن سنگھ نے نجمی کو ساتھ لیا اور اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا اب نجمی نے اپنے سر اور منہ کو چادر سے ڈھانپ لیا تھا۔ جنتا ایکسپریس کلکتہ سے ابھی تک نہیں آئی تھی۔ گرجن سنگھ اور نجمی پلیٹ فارم پر آ گئے۔ نجمی نے ریلوے پولیس کے آدمیوں کو دیکھا تو گرجن سنگھ سے کہا۔

"میرا خیال ہے میں سیکنڈ کلاس کے زنانہ ویٹنگ روم میں آرام کرتی ہوں۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" گرجن سنگھ بولا۔ "ٹرین آئے گی تو میں تمھیں اندر سے بلا لوں گا۔"

نجمی زنانہ ویٹنگ روم میں آ گئی۔ ویٹنگ روم میں پہلے سے کچھ ساڑھیوں والی بنگالی قسم کی عورتیں بیٹھی تھیں۔ نجمی بھی ایک جانب کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گئی۔ ایک گلابی رنگ کی ساڑھی والی پختہ عمر اور بھاری بدن کی سانولی عورت نجمی کو گھورنے لگی۔ نجمی نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ جب تھوڑی دیر بعد پلٹ کر دیکھا تو وہ عورت ابھی تک نجمی کو گھور رہی تھی۔ نجمی اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی باتھ روم سے باہر نکل رہی تھی کہ گلابی ساڑھی والی عورت نے پنجابی زبان میں نجمی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمھیں پہلے کہیں دیکھا ہے بہن جی!"

نجمی نے بے نیازی سے کندھے اچکا کر اردو میں کہا۔

"دیکھا ہوگا مگر میں پنجابی نہیں ہوں۔ میں کانپور کی رہنے والی ہوں۔"

گلابی ساڑھی والی عورت مسکرائی۔

"بہن جی! میرا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوا ہاں اب مجھے یاد آ گیا میں نے تمھیں کلکتہ میں دیکھا ہے"

کلکتہ کا نام سن کر نجمی ایک بار تو کانپ گئی جلدی سے بولی۔

"میں تو کلکتے صرف ایک بار گئی ہوں اپنی بہن کے پاس۔"

گلابی ساڑھی والی عورت ہنس کر کہنے لگی۔

"شاید میں نے تمھیں کسی شادی میں دیکھا ہے مجھے لگتا ہے کہ تم پنجابی بول رہی تھی۔"

نجمی نے کوئی جواب نہ دیا اور کونے میں اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی اس عورت کی وجہ سے وہ کچھ پریشان ہو گئی تھی کیونکہ دو ایک بار کن انکھیوں سے اس عورت کو دیکھا تو وہ برابر نجمی کو تکے جا رہی تھی یا اللہ جلدی سے ٹرین آ جائے نجمی دعائیں مانگنے لگی اس گلابی ساڑھی والی عورت کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے نجمی کی کسی بات پر یقین نہیں آیا ہے نجمی نے دل میں اس عورت کو ایک گالی دی اور کہا۔

"جہنم میں جاؤ تم۔"

باہر پلیٹ فارم پر لوگوں میں کچھ ہل چل سی مچ گئی تھی۔ نجمی سمجھ گئی کہ جنتا ایکسپریس آ رہی ہے۔ پھر ایک زبردست شور کے ساتھ جنتا ایکسپریس اسٹیشن میں داخل ہو گئی۔ گرجن سنگھ نے اندر آ کر نجمی سے کہا۔

"ہرنام جی گاڑی آ گئی ہے۔"

گلابی ساڑھی والی عورت نے غور سے گرجن سنگھ کو دیکھا۔ نجمی گرجن سنگھ کے ساتھ تیزی سے باہر نکل گئی۔ پلیٹ فارم پر مسافروں کی ریل پیل تھی مسافروں نے ٹرین پر جیسے یلغار کر دی تھی۔ گرجن سنگھ اور نجمی ایک سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں گھس گئے ان کی دو سیٹیں بک تھیں یہ سیٹیں آمنے سامنے کی تھیں اور ڈبے کے کونے میں واقع تھیں۔ سامان تو ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ نجمی اپنی سیٹ پر کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔ کھڑکی کھلی تھی اور اس میں سے دوسرے پلیٹ فارم کا منظر نظر آ رہا تھا۔ گرجن سنگھ بولا۔

"ہرنام جی! میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں پہلے دلی جاؤں گا جہاں میری بڑی بہن ہرمندر کور رہتی ہے میں آپ کو اس سے ملانا چاہتا ہوں۔ دلی میں ایک دن رہیں گے پھر میں آپ کو آپ کے پتا جی کے پاس لے چلوں گا اب ہم دلی جا رہے ہیں۔ میں نے ٹکٹ دلی کے ہی لیے تھے۔"

نجمی کو اب یاد آیا کہ اسے پہلے دلی جانا ہے۔ نجمی کے لیے دلی شہر بھی اپنے اندر بے پناہ خطرات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے ہوئے تھا۔ یہاں کی پولیس کے پاس بھی اس کی اور ندیم کی فائلیں پہنچ چکی تھیں۔ یہاں کی پولیس بھی اس کی تلاش میں تھی۔ نجمی عجیب مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ وہ تو سیدھی جموں آموں کے باغ میں شاہ جی کے ڈیرے پہنچنا چاہتی تھی مگر گرجن سنگھ نے دلی کے ٹکٹ لے لیے تھے۔ امرتسر تک اسے گرجن سنگھ کا تحفظ حاصل تھا۔ اس نے سوچا کہ چلو ایک دن کی تو بات ہے دلی میں ٹھہر جاتے ہیں آتنا بڑا شہر ہے اسے کوئی کہاں پہچانے گا۔ اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے سردار جی! میں دلی ہی جاؤں گی پہلے۔"

جنتا ایکسپریس ابھی چلی نہیں تھی دو چار منٹ باقی تھے کہ اچانک نجمی کی نظر ویٹنگ روم کی گلابی ساڑھی والی عورت پر پڑی۔ وہ بریف کیس اٹھائے مسکراتی ہوئی ڈبے میں داخل ہوئی اور نجمی کے ساتھ والی سیٹ پر براجمان ہوتے ہوئے بولی۔

"اچھا ہوا تم بھی اسی ڈبے میں ہو۔ اچھا سفر کٹے گا امرتسر جا رہی ہو نا تم؟"

گرجن سنگھ نے بیچ میں بولتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں ہم دلی جا رہے ہیں۔"

سیدھا سا آدمی تھا، یہ گرجن سنگھ۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ وہ ایک آدمی کو قتل کر کے آرہے ہیں اسے رازداری سے کام لینا چاہیئے تھا مگر وہ اپنے دل کی آواز نہ چھپا سکا نجمی نے کہا۔

"ہو سکتا ہے ہم پہلے کانپور جائیں وہاں میری ننھیال ہے۔"

گرجن سنگھ نے اب چونک کر نجمی کی طرف دیکھا۔ نجمی نے اسے آنکھ کا ہلکا سا اشارہ کیا۔ اب گرجن سنگھ کی سمجھ میں آیا کہ وہ ایک خطرناک جرم کر کے آرہے ہیں۔ انھیں بے حد احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ اپنی داڑھی کو دونوں ہاتھوں سے اوپر چڑھاتے ہوئے بولا۔

"ہاں جی ہو سکتا ہے ہم پہلے کانپور ہی جائیں۔ آپ کہاں جا رہی ہیں بہن جی؟"

گلابی ساڑھی والی نے کہا۔

"جی! میں تو دلی جا رہی ہوں میرا بھائی وہاں رہتا ہے اس سے ملنے جا رہی ہوں۔ میرا نام کملا بھاٹیہ ہے اور تمھارا کیا نام ہے بہن جی؟ کملا بھاٹیہ نے نجمی کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"ہرنام کور۔"

کملا بھاٹیہ بڑے سنسنی خیز انداز میں مسکرانے لگی۔ نجمی اپنا دل مسوس کر رہ گئی۔ یہ عورت اسے ایک عذاب لگ رہی تھی یہ ضرور کوئی گل کھلانے والی ہے۔ اسے سارا علم ہے یہ اس کی خاطر دلی جا رہی ہے۔ یہ سی آئی ڈی کی عورت ہے۔ نجمی سوچنے لگی۔ انجن نے سیٹی دی اور ٹرین آہستہ آہستہ پلیٹ فارم سے کھسکنا شروع ہو گئی۔

- - ☆ - -

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جنتا ایکسپریس رات کو چلی تھی۔

کملا تیسری نشست پر بیٹھی تھی۔ نجمی اور گرجن سنگھ آمنے سامنے والی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ گرجن سنگھ اَن جان تھا۔ کملا بھاٹیہ ایک تجربہ کار عورت تھی۔ اس نے گرجن سنگھ کو ذرا نخرے دکھائے تو سکھ بھوت گیا اور اس سے گھل مل کر باتیں کرنے لگا۔

نجمی نے سر درد کا بہانہ کر کے گرجن سنگھ کو اپنے قریب بلایا اور کہا "میرا سر درد کر رہا ہے ذرا پٹی باندھ دو گے۔"

گرجن سنگھ نجمی کے سر پہ رومال باندھنے لگا تو نجمی نے سرگوشی میں کہا "یہ عورت مجھے سی آئی ڈی کی لگتی ہے۔ واہے گورو کا واسطہ ہے اس سے دور ہی رہو۔"

سی آئی ڈی کا نام سن کر گرجن سنگھ تو بھونچکا سا ہو کر رہ گیا۔ نجمی نے مزید ہدایت کی "بیحد احتیاط سے کام لو۔" گرجن سنگھ پر اس بات کا اتنا اثر ہو گیا کہ ایک بار کملا بھاٹیہ نے پانی مانگا تو گرجن سنگھ روکھے لہجے میں بولا "بی بی میرے پاس کوئی تھرمس وغیرہ تو ہے نہیں۔ اگلا.... اسٹیشن آئے گا تو منگوا لینا۔"

جنتا ایکسپریس اسٹیشن پر اسٹیشن چھوڑتی جا رہی تھی۔ کان پور آیا تو کملا بھاٹیہ نے مسکراتے ہوئے گرجن سنگھ سے کہا

"سردار جی! آپ کانپور نہیں اتریں گے۔"

نجمی نے تنگ آ کر کہا "کملا جی! آپ ہماری اتنی فکر نہ کریں ہمیں جہاں اترنا ہو گا وہیں اتریں گے۔"

کملا بھاٹیہ نے منہ دوسری طرف کر لیا اور ایسے ظاہر کیا جیسے سو گئی ہو۔ صبح ہو گئی تھی۔ دلی قریب آ رہا تھا۔ غازی آباد بھی گزر گیا۔ اگلا جنکشن دلی تھا۔ کملا بھاٹیہ باتھ روم میں گئی تو نجمی نے گرجن سنگھ سے کہا "یہ عورت بڑی خطرناک معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں دلی اسٹیشن پر اتر کر کچھ دیر ویٹنگ روم میں ٹھہرنا ہوگا۔ جب یہ عورت چلی جائے گی تب ہم اسٹیشن سے باہر نکلیں گے۔"

گرجن نے پگڑی باندھتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے ہرنام جی۔"

جنتا ایکسپریس دلی کے پلیٹ فارم پر آ کر رک گئی۔ نجمی نے چادر سے اپنا سر اور تھوڑا سا چہرہ ڈھانپ لیا تھا۔ ٹرین سے اتر کر سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم کی طرف بڑھی۔ اندر جا کر اس نے باتھ روم میں منہ ہاتھ دھویا۔ بال بنائے سر پہ رومال باندھا۔ پھر باہر آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

گرجن سنگھ مردانہ ویٹنگ روم میں تھا۔ ناشتہ دونوں نے راستے میں ہی کر لیا تھا۔ نجمی نے گرجن سنگھ سے کہا تھا کہ وہ پورے بیس منٹ تک ویٹنگ روم میں رہیں گے۔ جب بیس منٹ پورے ہو گئے تو گرجن سنگھ نے زنانہ ویٹنگ روم کے دروازے پر آ کر نجمی کو آواز دی۔ نجمی نے باہر نکلتے ہی پوچھا۔

"وہ مصیبت تو یہاں موجود نہیں ہے؟"

گرجن سنگھ ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ حالانکہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ مگر گرجن سنگھ ہر قدم پر اپنی سادگی اور سادہ دلی کا ثبوت دے رہا تھا۔ کہنے لگا "مجھے تو وہ کہیں نظر نہیں آ رہی۔"

"چلو اب نکل چلتے ہیں کدھر چلنا ہے میرا مطلب ہے۔ تمھاری بہن ہرمندر کور جی کس محلے میں رہتی ہے؟"

گرجن سنگھ نجمی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"موتی نگر جائیں گے ہرنام جی تم نے موتی نگر دیکھا ہے؟"

نجمی نے کہا "نہیں جی دلی تو ضرور دیکھا ہے مگر موتی نگر کبھی نہیں گئی۔"

اسٹیشن سے باہر آ کر انھوں نے ٹیکسی لی وہ ٹیکسی میں بیٹھ رہے تھے کہ اچانک نجمی کی نگاہ کملا بھاٹیہ پر پڑ گئی۔ وہ بھی ریلوے اسٹیشن کے باہر ایک طرف کھڑی ٹیکسی والے سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے ایسے ظاہر کیا جیسے نجمی کو اس نے بالکل نہیں دیکھا۔ لیکن نجمی سمجھ گئی تھی کہ کملا بھاٹیہ نے اسے دیکھ لیا ہے بلکہ وہ اسی کی انتظار میں اسٹیشن کے پورچ میں اتنی دیر تک کھڑی رہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نجمی نے ٹیکسی کے چلتے ہی گرجن سنگھ کو بتا دیا کہ سی آئی ڈی والی عورت نے اسے دیکھ لیا ہے۔ گرجن سنگھ کو غصہ آ گیا۔ پہلی بار نجمی نے گرجن سنگھ کے منہ سے گالی سنی۔ یہ گالی اس کے منہ سے بے اختیار نکل گئی تھی "میں اس کو ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ یاد رکھے گی۔"

ٹیکسی موتی نگر کی طرف جا رہی تھی۔ نجمی نے آہستہ سے کہا "ٹیکسی سیدھی موتی نگر مت لے جاؤ، کسی دوسری طرف لے چلو۔"

گرجن سنگھ کو غصہ آ گیا بولا "ہم اس سے ڈرتے ہیں۔ کیا ہرنام جی؟"

سامنے والے شیشے میں سے ڈرائیور نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ نجمی نے گرجن سنگھ کا ہاتھ دبایا اور خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ گرجن سنگھ نے ڈرائیور سے کہا "ذرا پہلے چاندنی چوک کی طرف چلو وہاں سے کچھ مٹھائی لینی ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی چاندنی چوک کی طرف موڑ دی۔ چاندنی چوک میں ٹل والوں کی مشہور مٹھائی کی دکان ہے جہاں سے کبھی لال قلعے میں مٹھائی جایا کرتی تھی ان کی دکان کا ماتھا بارہ دری ایسا ہے اور مٹھائی ساری دلی میں مقبول ہے۔ یہاں گاہکوں کا بڑا رش تھا۔ گرجن سنگھ نے ٹیکسی ایک طرف کھڑی کروا دی اور نجمی کو لے کر مٹھائی کی دکان کی طرف بڑھا "ہرنام جی تم ہی دیکھو کہ وہ سی آئی ڈی والی مصیبت ہمارے پیچھے پیچھے تو نہیں آئی؟"

نجمی نے گرجن سنگھ کو خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ مٹھائی کا لفافہ لیے واپس ٹیکسی کی طرف جا رہے تھے۔ نجمی نے اس دوران میں اردگرد کے ماحول کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہاں رش اور ٹریفک اتنی تھی کہ نجمی کوئی صحیح اندازہ نہ لگا سکی ویسے اسے کملا بھاٹیہ کہیں نظر نہیں آئی۔"

ٹیکسی گرجن سنگھ کی بہن ہرمندر کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ دن کی روشنی میں نجمی کو اپنے پہچانے جانے کا بھی خطرہ تھا۔ وہ ٹیکسی کی پچھلی نشست پر ایک طرف کو جھک کر بیٹھی ہوئی تھی۔ ٹیکسی دلی کی مختلف سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی موتی نگر کی نئی آبادی میں داخل ہو گئی یہاں چھوٹی چھوٹی کوٹھیاں بھی تھیں اور عالی شان بنگلے بھی۔ کوارٹر بھی تھے جن کو کوٹھیوں میں تبدیل کرنے کی ناکام کوشش کی گئی تھی۔

گرجن سنگھ کی بہن کا مکان بھی ایسا ہی ایک کوٹھی نما کوارٹر تھا۔ ہرمندر کور ایک دراز قد پختہ عمر کی عورت تھی جس کے چہرے سے شگفتگی اور خوش مزاجی ٹپکتی تھی۔ گرجن سنگھ نے ہرمندر کور کو جاتے ہی نجمی کے بارے سب کچھ بتا دیا۔ ہرمندر کور نے نجمی کو سینے سے لگا لیا اور پیار کرتے ہوئے کہا "تم پر بڑے ظلم ہوئے ہیں ہرنام بہن پر فکر نہ کرو واہے گرو کی کرپا سے تمھارے کشٹ اب دور ہو گئے ہیں اب گرجن سنگھ خود تم کو تمھارے پتا جی کے پاس ویرکے پہنچا دے گا۔"

ہرمندر کور کا خاوند دلی میں کپڑے کا کاروبار کرتا تھا دوپہر کو وہ بھی آ گیا۔ گرجن سنگھ کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ اسے گلے ملا اور پھر نجمی کی طرف دیکھ کر بولا "یہ بی بی کون ہے۔ میں نے اسے پہچانا نہیں۔"

گرجن سنگھ نے مختصر لفظوں میں اپنے بہنوئی سرجن سنگھ کو بھی نجمی کی داستانِ غم بیان کی۔ سرجن سنگھ پر بڑا اثر ہوا۔ کہنے لگا "گرجن سنگھ تم نے بڑا پن کا کام کیا ہے۔ گورو گرنتو صاحب کے گرنھتی کی بیٹی کو ظالموں کے گھر سے نکال لائے ہو۔ تو نے تو اپنا کلیان کر لیا ہے اب بی بی ہرنام کور کو اس کے گھر پہنچا دو بس۔"

نجمی سر جھکائے نیک دل ہرنام کور بنی، خاموشی سے یہ سب کچھ سن رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیئے وہ کہاں سے کس مقام سے گرجن سنگھ سے الگ ہو۔ ظاہر ہے وہ اس کے ساتھ ویرکے نہیں جا سکتی تھی کیونکہ وہاں تو اس کا کوئی نہیں تھا۔ دلی بڑا شہر تھا۔ یہاں وہ آسانی سے گرجن سنگھ سے الگ ہو کر اپنے طور پر جموں روانہ ہو سکتی تھی۔ اس کے پاس روپے موجود تھے۔ گرجن سنگھ کے بہنوئی سرجن سنگھ نے نجمی کی پتلون جیکٹ پر اعتراض کیا تو گرجن سنگھ بولا "وہاں یہی پہناوا چلتا تھا۔ جیجا جی ساڑھی شلوار تو وہاں کوئی عورت نہیں پہنتی تھی۔"

سرجن سنگھ بولا "مگر پتر تو اب اسے اپنی بہن کی ساڑھی دے دے۔ شلوار قمیض دے دے۔ اسے اپنے پتا کے گھر اپنے لباس میں جانا چاہیئے۔"

چنانچہ نجمی کو با دل نخواستہ شلوار قمیض پہننی پڑی اسے سفید چادر بھی دی گئی جو اس نے سر پر اوڑھ لی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دلی کا موسم خوشگوار تھا۔ برسات گزر چکی تھی۔ رات کو موسم خنک ہو جاتا تھا۔ رات کو ہرمندر کور نے نجمی کو اپنے کمرے میں چارپائی پر سلایا۔ کچھ دیر تک وہ اس سے باتیں کرتی رہی اور پوچھتی رہی کہ مرہٹہ جاگیردار کے پاس دوسری کون کون عورتیں تھیں۔ کیا وہ بڑا ظلم کرتا تھا؟ نجمی مختصر جواب دیتی رہی۔ پھر ہرمندر کور سو گئی۔ نجمی جاگ رہی تھی اس لیے کہ اسے آج صبح صبح منہ اندھیرے اس گھر سے ہمیشہ کے لیے نکل جانا تھا۔ نجمی نے گھر کا پچھلا دروازہ دیکھ لیا تھا۔ یہ دروازہ جس کمرے میں وہ سو رہی تھی اس کے غسل خانے سے نکلتا تھا۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بجے تھے۔ سفر کی تھکان کی وجہ سے گرجن سنگھ باہر دالان میں نو بجے ہی سو گیا تھا۔ سرجن سنگھ بھی وہیں ایک چارپائی پر کھیس اوڑھے سو رہا تھا۔ ہرمندر کور بھی سو گئی تھی صرف نجمی جاگ رہی تھی۔

رات کے پونے گیارہ بجے کے قریب کوارٹر کے باہر پولیس کی جیپ آ کر رکی اور اس میں سے چار پانچ کانسٹیبل، ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ نکل کر سرجن سنگھ کے کوارٹر کی طرف بڑھے۔ گلابی ساڑھی والی کملا بھاٹیہ پولیس کے ساتھ تھی۔ باہر سے جیپ کی آواز آتے ہی نجمی کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ جلدی سے چارپائی پر سے اٹھی۔ چھوٹی سی کھڑکی کی درز سے باہر دیکھا۔ بجلی کے کھمبے کی روشنی میں اسے پولیس اور کملا بھاٹیہ نظر آئی تو اس کے بدن میں بجلی کی لہر دوڑ گئی۔

کھڑکی سے پیچھے ہٹ کر سیدھی غسل خانے میں گھس گئی۔ اس کا عقبی دروازہ کھولا اور کوارٹر کی پچھلی چھوٹی سی گلی میں نکل آئی۔ پولیس کو اس گلی کے بارے میں علم نہیں تھا۔ ورنہ وہ پہلے اس کا محاصرہ کرتی۔ نجمی کو یقین تھا کہ ادھر گلی میں بھی پولیس کا کوئی نہ کوئی آدمی ضرور ہو گا۔ وہ اندھیرے میں بڑی محتاط ہو کر باہر نکلی تھی۔ یہ دیکھ کر کہ گلی بالکل خالی پڑی ہے۔ نجمی بھاگ کر گلی میں سے دوسری گلی کی طرف نکل گئی۔ یہ کوٹھی نما کوارٹروں کے پچھواڑے تھے اور کافی رات گزر جانے کی وجہ سے سنسان پڑے تھے۔ کہیں کہیں مکانوں کے عقبی دالانوں کی روشنی گلی میں پڑ رہی تھی۔ نجمی جتنی تیزی سے دوڑ سکتی تھی دوڑتی ہوئی ان گلیوں سے نکل کر سڑک پر آ گئی یہ موتی نگر علاقے کی چھوٹی سڑک تھی۔ یہ علاقہ نجمی کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ وہ یہاں کبھی نہیں آئی تھی۔ اس نے بھاگ کر سڑک عبور کی اور سامنے والی سڑک سے ہوتی ہوئی کوٹھیوں کے بیچ والے راستوں سے گزرتی موتی نگر سے باہر کھلی سڑک

پر آ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اب تک گرجن سنگھ کی بہن کے گھر پولیس کو اس کے فرار کا پتہ چل گیا ہو گا اور وہ اس کی تلاش میں جیپ لے کر علاقے میں نکل آئی ہو گی۔ اسے راستے کی خاموشی میں زور سے جیپ کی آواز سنائی دی۔

نجمی سڑک کی دوسری جانب آ گئی اور درختوں کے نیچے ایک طرف تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔ وہ دل میں گلابی ساڑھی والی کملا بھاٹیہ کو گالیاں دے رہی تھی۔ آخر اس کا خدشہ درست نکلا۔ وہ سی آئی ڈی ہی کی عورت تھی۔ جیپ کی آواز قریب ہوتی جا رہی تھی۔ یہ پولیس کی جیپ ہی ہو سکتی تھی۔ وہاں کوئی ٹیکسی رکشا بھی نظر نہیں آ رہا تھا جو نجمی کو اس خطرناک علاقے سے نکال کر لے جاتا۔

اس کے پیچھے دور سڑک پر جیپ کی روشنی نمودار ہوئی۔ نجمی نے پلٹ کر دیکھا۔ جیپ کی روشنی قریب آ رہی تھی۔ نجمی کو اور تو کچھ نہ سوجھا۔ وہ ایک کوٹھی کے کھلے گیٹ میں داخل ہو گئی۔ دائیں جانب کوٹھی کا باغ تھا۔ نجمی باڑھ پھلانگ کر باغ میں گھس گئی اور بھاگتی ہوئی درختوں کی طرف آ گئی۔ یہاں نوکروں کے کوارٹر تھے۔ ایک بندھا ہوا کتا اس کی بو سونگھ کر غرایا۔ نجمی وہیں بیٹھ گئی اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ اس کے کان جیپ کی آواز پر لگے تھے۔ آنکھیں جھاڑیوں میں سے دور سڑک کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ جیپ کی روشنی سڑک پر سے تیزی سے آگے نکل گئی۔ نجمی کی جان میں جان آئی۔ جیپ کی آواز بھی دور جا کر غائب ہو گئی۔ کتا اب غرا نہیں رہا تھا۔

خطرہ ٹل گیا تھا۔ نجمی آہستہ سے اٹھی اور باغ میں سے گزرتی کوٹھی کے گیٹ پر آ گئی اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ گیٹ کے آگے سڑک خالی تھی۔ وہاں کوئی چوکیدار بھی نہیں تھا۔ ورنہ اسے مشکل پیش آ سکتی تھی۔ وہ تیزی سے کوٹھی میں سے نکل کر دوبارہ سڑک پر آ گئی۔ سڑک کے کنارے چھوٹے چھوٹے درخت تھے۔ وہ ان کے درمیان چلنے لگی۔ پچاس ساٹھ قدموں کے بعد سڑک دائیں جانب مڑتی تھی۔ آدھی رات کے وقت سڑک تقریباً خالی تھی۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی گزر جاتی۔ نجمی دور سے گاڑی کی روشنی دیکھ کر درخت کے پیچھے ہو جاتی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے چوک میں دکانوں وغیرہ کی روشنیاں نظر آئیں۔ وہاں کچھ ٹیکسی رکشا بھی موجود تھے۔ نجمی اکیلی تھی اگرچہ وہ ایک دلیر عورت تھی اور اپنا بچاؤ کرنا جانتی تھی مگر وہ ایک نازک صورتِ حال سے دوچار تھی۔ وہ امن و امان کے ساتھ اس علاقے سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ کہاں جائے؟ ریلوے اسٹیشن پر جانا مناسب نہیں تھا۔ اس کے فرار کے بعد ظاہر ہے پولیس کے آدمی ریلوے اسٹیشن پر تو ضرور موجود ہوں گے۔ اچانک نجمی کے دل میں حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ کا خیال آگیا۔ درگاہ شریف میں وہ محفوظ رہ کر رات گزار سکتی ہے۔ اس کا پولیس کو شاید خیال نہ آئے۔ ٹیکسی یا رکشے والا بھی درگاہ شریف کا سن کر اسے حفاظت سے وہاں پہنچا دے گا۔

نجمی سڑک پار کرکے دکانوں کے آگے کھڑی ٹیکسی، رکشاؤں کے پاس جانے کی بجائے.. وہیں ایک طرف ہو کر کھڑی ہو گئی۔ بائیں جانب سے ایک موٹر رکشا آیا اور اس کے قریب آکر رک گیا۔ "بی بی جی! کہاں چلنا ہے؟"

ڈرائیور ادھیڑ عمر تھا۔ نجمی نے کہا "مجھے درگاہِ حضرت نظام الدین لے چلو بھائی۔"

"بیٹھو بی بی" رکشا ڈرائیور نے کہا۔

چند لمحوں کے بعد رکشا موتی نگر کے علاقے سے نکل گیا اور درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء کی طرف بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ نجمی نے ایک مصیبت سے تو چھٹکارا حاصل کر لیا تھا مگر وہ کسی بھی جگہ گرفتار ہو سکتی تھی اب تو دلی پولیس اور دلی کی خفیہ پولیس بھی اس کو گرفتار کرنے کے لیے میدان میں نکل آئی تھی۔ درگاہ حضرت نظام الدینؒ وہاں سے کافی دور تھی۔ کوئی پون گھنٹے کے بعد رکشے نے اسے درگاہ شریف کے باہر پہنچا دیا۔ کسی زمانے میں نظام الدینؒ اولیاء کا مزار دلی شہر سے باہر ہوا کرتا تھا اور شہر سے کافی دور تھا۔ لیکن اب یہ علاقہ شہر کے بیچ میں آگیا ہے اور مزار شریف تک پہنچنے کے لیے گلیوں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ درگاہ شریف پر بڑی رونق تھی۔ قوالی ہو رہی تھی۔ عقیدتمند نذرانے چڑھا رہے تھے۔ دعائے فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ نجمی نے چادر سے سر اور منہ کو اچھی طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ درگاہ شریف میں دالان میں مزارِ مبارک کے دائیں جانب سنگِ مرمر کے چبوترے سے فرش پر بیٹھ گئی۔ اس

نے آنکھیں بند کر لیں اور دعائے فاتحہ پڑھی۔ اللہ سے دعا مانگی اور درگاہ شریف کے گیٹ کی طرف دیکھا۔

عقیدت مند چلے آ رہے تھے۔ فضا میں روشنی اور خوشبوئیں تیر رہی تھیں۔ قوالی دوسرے دالان میں ہو رہی تھی۔ کچھ دوسری عورتیں بھی وہاں سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ یہاں نجمی کو دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ کہاں جائے۔ اس نے گردن موڑ کر ایک طرف دیکھا نیچے ایک دالان تھا۔ یہاں ایک باؤلی تھی۔ یہاں بھی کافی عقیدت مند مرد اور خواتین موجود تھیں۔ نجمی نے ایک بار پھر دعا مانگی اور سیڑھیاں اتر کر دالان میں آ گئی۔ آہستہ آہستہ چلتی دالان کی جنوبی دیوار کی طرف گئی۔ یہاں ایک دروازہ تھا جو پیچھے چھوٹے سے قبرستان کی طرف کھلتا تھا۔ نجمی کو اس قبرستان کا علم نہیں تھا۔ اس نے دروازے کے باہر کچھ خاموشی سی دیکھی تو ادھر چل دی۔ یہاں بجلی کے کھمبوں کی روشنی تھی مگر لوگ نہ ہونے کے برابر تھے۔ نجمی کو ایسا ہی ماحول چاہیئے تھا۔ وہ کسی محفوظ جگہ بیٹھ کر سوچنا چاہتی تھی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیئے۔ آیا وہ یہاں سے واپس صوبہ بہار کے مقام گوماہ کے جنگل میں واقع اپنی خفیہ کمین گاہ کی طرف جائے یا جموں کی جانب نکلنے کی کوشش کرے۔ اپنی خفیہ کمین گاہ کے بارے میں اسے پورا یقین نہیں تھا کہ اس کے پرانے ڈاکو ساتھی وہاں پر موجود ہوں گے۔ دوسرے اسے یہ بھی خیال تھا کہ بادل بھی وہاں موجود نہیں ہے اور اب سارے ڈاکو ہندو ہوں گے اور وہ اس کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھا سکتے ہیں۔

یہی سوچتی ہوئی نجمی درگاہ شریف کے عقبی قبرستان کے چھوٹے سے دروازے کے پاس آ کر رک گئی جہاں اردو کے عظیم شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب کی بھی قبر ہے۔ کسی زمانے میں یہ قبر خستہ حالت میں تھی لیکن اب حکومت ہند نے اس کے اوپر سنگ مرمر کی ایک چھتری سی بنوا دی تھی۔ قبرستان کا دروازہ کھلا تھا۔ نجمی نے جھانک کر دیکھا تو اسے دیوار والی بتی کی روشنی میں وہاں قبریں ہی قبریں نظر آئیں وہ قبرستان میں داخل ہو گئی اور یونہی دیوار کی اوٹ میں ایک قبر کے پاس چبوترے پر بیٹھ گئی۔ وہ یوں بیٹھی تھی کہ اگر کوئی دیکھے تو یہی سمجھے کہ یہ اس کے کسی عزیز کی قبر ہے اور وہ وہاں فاتحہ پڑھنے آئی ہے۔ اب اس نے آئندہ کے منصوبے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر غور کرنا شروع کر دیا۔

آخر وہ اسی نتیجے پر پہنچی کہ اسے یہاں سے کسی طرح جموں ہی پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اپنی خفیہ کمین گاہ میں جانا بیکار ہوگا۔ کیونکہ وہاں سے اسے پھر بادل کی تلاش میں واپس جموں شاہ جی کے پاس جانا پڑے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ دلی سے باہر کیسے نکلے۔ اسٹیشن پر جا کر گاڑی پکڑنا اپنے آپ کو خود پولیس کے حوالے کرنے کے مترادف تھا اگر وہ لاری پکڑتی ہے تو لاری کے اڈوں پر بھی پولیس کی چیکنگ کا خطرہ تھا۔ لاری کو تو راستے میں بھی روکا جا سکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ دلی سے انبالے کی طرف کسی دوسرے راستے ریلوے اسٹیشن سے ریل میں سوار ہوگی۔ اب مسئلہ رات گزارنے کا تھا۔ قبرستان میں وہ رات نہیں گزار سکتی تھی۔ اسے درگاہ شریف پر ہی رات گزار دینی چاہیئے اور یہیں کسی سے معلوم کرنا چاہیئے کہ دلی سے انبالے جاتے ہوئے دوسرا اسٹیشن کونسا ہے اور وہاں تک کوئی لاری جاتی ہے یا نہیں۔؟

نجمی اٹھنے ہی والی تھی کہ کسی نے پیچھے سے آواز دی "بیٹی حوصلہ کرو مرنے والوں کے ساتھ کوئی نہیں مرتا۔ خدا کی مرضی میں کوئی دخل بھی نہیں دے سکتا۔"

نجمی نے پلٹ کر دیکھا۔ پیچھے ایک سفید ریش بزرگ کھیس کاندھوں پر ڈالے سر پر سبز ٹوپی اوڑھے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک عصا تھا۔ نجمی نے اٹھ کر ادب سے انھیں سلام کیا بزرگ نے کہا "میں دیکھ رہا تھا کہ تم دیر سے قبر پر بیٹھی ہو۔ یہ تمھارے کس عزیز کی قبر ہے بیٹی؟ نجمی جھوٹ نہیں بولنا چاہتی تھی لیکن جھوٹ بولنے کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ اس نے اللہ سے معافی مانگی اور بزرگ کی طرف دیکھ کر کہا "یہ میری والدہ کی قبر ہے جی۔"

نجمی نے دیکھ لیا تھا کہ قبر کے سرہانے کوئی کتبہ نہیں لگا تھا۔ اس نے بزرگ کو بتایا کہ آج سے چار برس پہلے اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا اور اسے اسی قبرستان میں دفن کر دیا گیا تھا۔ بزرگ نے بڑی شفقت سے پوچھا کیا "تم درگاہ پر اکیلی آئی ہو بیٹی۔؟"

نجمی نے سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کہنا ہے۔

"باجی میرے ساتھ بڑی عجیب بات ہوئی ہے۔ میں اپنے میاں کے ساتھ درگاہ پر حاضری دینے اور والدہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آئی تھی۔ ہم شام کے وقت انبالہ سے یہاں پہنچے تھے۔

پھر ایسا ہوا کہ خدا جانے میرے میاں کہاں غائب ہو گئے اور میں یہاں اکیلی رہ گئی۔"

بزرگ نے پوچھا "کیا تمھارے میاں کو معلوم نہیں تھا کہ تم درگاہ شریف پر ہو؟"

نجمی نے کہا "بات یہ ہے حضور کہ میرے میاں کو کبھی کبھی دورہ سا پڑتا ہے اور وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہتے۔ تب وہ جہاں کہیں بھی ہوں۔ بس وہاں سے واپس انبالے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ اس وقت انھیں صرف اپنا گھر ہی یاد رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے میاں بھی واپس انبالے چل دیئے ہیں۔ میں اکیلی عورت ہوں۔ یہ سوچ کر یہیں بیٹھی ہوں کہ رات کسی نہ کسی طرح گزار دوں اور صبح انبالے چلی جاؤں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ انبالے کو یہاں سے کونسی لاری جاتی ہے۔"

بزرگ نے نجمی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "یہ خواجہ کی چوکھٹ ہے بیٹی یہاں اللہ کی رحمت کا سایہ ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ میرے ساتھ آؤ۔ وہ سامنے میرا چھوٹا سا گھر ہے وہاں میری بڑی لڑکی اپنے بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔ تم اس کے پاس رات گزارو۔ صبح میں خود تمھیں انبالے جانے والی گاڑی یا لاری میں بٹھا دوں گا۔"

نجمی درگاہ شریف کے دالان میں ہی رات بسر کر دینا چاہتی تھی لیکن اب وہ بزرگ کے سامنے انکار بھی نہیں کر سکتی تھی چپکے سے ان کے ساتھ چل پڑی۔ اس بزرگ کا مکان چھوٹا سا تھا۔ دو کوٹھڑیاں اور ایک دالان تھا۔ دالان میں ان کی بیٹی اپنے بچوں کے ساتھ سو رہی تھی۔ بزرگ نے اسے جگایا بے چاری نیک دل خاتون اسی وقت اٹھ بیٹھی۔ نجمی کے لیے اس نے کوٹھڑی سے چارپائی نکال کر دالان میں ڈال دی۔ بچھونا لگایا اور نجمی سے کہا "سو جاؤ بہن تمھیں کچھ کھانا ہو تو میں روٹی لاؤں؟"

نجمی نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "میں نے کھانا کھا لیا تھا۔"

بزرگ بولے "اب تم آرام کرو بیٹی میں صبح آ کر تمھیں لاری اڈے لے چلوں گا۔ ٹرین کا بھی پتہ کرتا آؤں گا۔ ہاں تمھارا نام کیا ہے بیٹی؟"

"عائشہ" نجمی کی زبان پر یہی نام آیا۔

بزرگ دعائیں دیتے چلے گئے۔ نجمی چارپائی پر کھیس اوپر کر کے لیٹ گئی۔ بزرگ کی بیٹی اپنی چارپائی پر لیٹ گئی اس کے بچے چھوٹی چارپائی پر سو رہے تھے۔ وہ کہنے لگی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"خدا کرے تمھارے میاں گھر پہنچ گئے ہوں۔"
نجمی نے کہا "وہ دورہ پڑنے کے بعد گھر پہنچ جایا کرتے ہیں اور تو وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں مگر گھر نہیں بھولتے۔"
عورت بولی "یہ بھی اللہ کا بڑا کرم ہے۔ تم اپنے میاں کا علاج کیوں نہیں کراتیں۔؟"
تھوڑی دیر اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ نجمی نے اس عورت سے پوچھا "دلی سے آگے کونسا اسٹیشن ہے؟ میرا مطلب ہے اگر ہم دلی سے انبالے جائیں تو دوسرا اسٹیشن کونسا آتا ہے؟"
وہ عورت بولی "دلی سے انبالے کی طرف جائیں تو پہلا اسٹیشن تو شاہدرہ ہی آتا ہے۔ کیوں تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"
نجمی نے جمائی لیتے ہوئے کہا "یونہی پوچھ رہی تھی۔"
"چھا بہن اب سو جاؤ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔"
یہ کہہ کر بزرگ کی نیک دل بیٹی چپ ہو گئی وہ سو گئی تھی۔ نجمی ابھی تک جاگ رہی تھی۔ وہ یہاں سے شاہدرہ جانا چاہتی تھی۔ صبح تک اگر وہ اس گھر میں رہتی ہے تو لازمی طور پر اسے بزرگ کے ساتھ دلی ریلوے اسٹیشن جانا ہوگا اور وہاں وہ نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ سوئے گی نہیں اور تھوڑی دیر بعد وہاں سے چپکے سے اٹھے گی اور درگاہ شریف کے باہر رکشا پکڑ کر شاہدرہ کی طرف چل دے گی۔ مگر نیند نے اس پر ایسی غفلت طاری کی کہ اسے کوئی ہوش نہ رہا اور جب اس کی آنکھ کھلی تو دالان میں دن کی روشنی پھیل چکی تھی اور نیم کے پیڑ پر چڑیاں بول رہی تھیں نجمی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ بزرگ کی بیٹی رسوئی کے باہر چولہا جلائے بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی۔ اس کے بچے نلکے کے نیچے نہا رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ نجمی نے بے اختیار پوچھا۔
"کیا وقت ہو گیا ہوگا؟"
عورت نے روٹی توے پر ڈالتے ہوئے کہا۔
"شاید سات بج گئے ہیں۔ ابا آ کر تمھارا پوچھ گئے تھے۔ تم سو رہی تھیں۔ ابھی پھر آئیں گے۔ اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو اور ناشتہ کر لو۔"
نجمی ایک بار تو سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ نیند اسے دھوکا دے

گئی تھی۔ اتنے میں بزرگ بھی تشریف لے آئے۔ آتے ہی نجمی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور دعائیں دینے کے بعد بولے "بیٹی عائشہ میں نے سب کچھ معلوم کر لیا ہے۔ لاری یہاں سے سیدھی انبالے نہیں جاتی تمھیں کرنال سے دوسری لاری پکڑنی پڑے گی۔ ٹرین سیدھی انبالے جاتی ہے۔"
نجمی نے پوچھا کہ ٹرین کس وقت دلی سے چھوٹتی ہے۔ بزرگ نے بتایا کہ "نو بجے ٹرین کا ٹائم ہے۔ تم تیار ہو جاؤ۔ میں خود تمھیں گاڑی پر چڑھا کر آؤں گا۔" نجمی یہ نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔
"آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں آپ مجھے یہاں رکشے میں بٹھا دیں آگے میں خود ٹرین پکڑ لوں گی۔"
بزرگ اصرار کرتے رہے اور بولے "تم تیار ہو جاؤ بیٹی میں آٹھ بجے آؤں گا ابھی آدھا گھنٹہ ہے آٹھ بجنے میں۔"
نجمی نے جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر بالوں میں کنگھی کی، تھوڑا بہت ناشتہ کیا۔ پورے آٹھ بجے بزرگ تشریف لے آئے۔ نجمی ان کی بیٹی سے گلے لگ کر ملی۔ اس کے بچوں کو زبردستی پچاس روپے دیئے اور بزرگ کے ساتھ درگاہ شریف میں فاتحہ پڑھنے کے بعد باہر آ گئی۔ وہ کھلی سڑک پہ نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہاں پولیس کے مخبروں کا خطرہ تھا۔ بزرگ اس کے ساتھ اسٹیشن تک جانے پر اصرار کر رہے تھے۔ لیکن نجمی نے انھیں وہیں سے واپس چلے جانے پر راضی کر لیا۔ ان کا بے حد شکریہ ادا کرنے کے بعد وہ رکشے میں بیٹھ گئی۔ بزرگ رکشے والے کو بار بار تاکید کر رہے تھے کہ بیٹی کو سیدھا ریلوے اسٹیشن جا کر چھوڑنا۔ جب رکشا نظام الدین اولیار کی بستی سے نکل کر کھلی سڑک پر آیا تو نجمی نے رکشا ڈرائیور سے کہا "شاہدرہ ریلوے اسٹیشن کی طرف چلو۔"
رکشا ڈرائیور بولا "بی بی جی شاہ جی نے تو مجھے دلی اسٹیشن پر لے جانے کے لیے کہا تھا۔"
نجمی نے فوراً کہا "میں تمھیں دس روپے زیادہ دوں گی۔ مجھے جتنی جلدی ہو سکے شاہدرہ پہنچا دو ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔"
رکشا وہیں سے شاہدرہ کی طرف مڑ گیا۔ جس وقت نجمی شاہدرہ اسٹیشن پہنچی تو ٹرین کے آنے میں صرف پندرہ منٹ باقی تھے۔ نجمی کے لیے یہ خوش آئند بات تھی۔ کیونکہ وہ اسٹیشن پہ زیادہ وقت نہیں گزارنا چاہتی تھی۔ اس نے رکشا ڈرائیور کو کرائے کے علاوہ دس روپے انعام دیا اور جلدی جلدی ٹکٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مار کر ٹکٹ گھر کی طرف آ گئی۔ شاہدرہ اسٹیشن پر کافی رونق تھی۔ یہ دلی ہی کا اسٹیشن تھا۔ نجمی نے وہیں سے جموں کا فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے لیا۔ وہ شاہدرہ سے جالندھر اور وہاں سے ہوشیار پور، کٹھوا جموں جانا چاہتی تھی۔ جالندھر سے اسے ہوشیار پور کے لیے ٹرین تبدیل کرنی تھی۔ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ اس نے اس لیے لیا تھا کہ فرسٹ کلاس میں وہ محفوظ رہ سکتی تھی اور اس کلاس کے مسافروں کی چیکنگ کرنا کوئی آسان بات نہیں ہوتی۔ نجمی ٹکٹ لے کر پلیٹ فارم پر انتظار کرنے کی بجائے فرسٹ کلاس کے زنانہ ویٹنگ روم میں آ کر بیٹھ گئی۔ اس کی ہوشیار نگاہیں چاروں طرف جائزہ لے رہی تھیں۔ اسے یہی ڈر تھا کہ کہیں وہ سی آئی ڈی والی کملا بھاٹیہ یہاں بھی کسی طرف سے نہ نکل آئے۔ مگر ایسی بات نہیں تھی۔ پندرہ بیس منٹ کی بات تھی۔

پلیٹ فارم کی گھنٹی نے ٹرین کے آنے کا اعلان کیا تو دوسری عورتیں تو باہر نکل گئیں مگر نجمی اندر ہی بیٹھی رہی۔ جب ٹرین پلیٹ فارم پر آ کر کھڑی ہو گئی تو نجمی نکل کر ٹرین کی طرف بڑھی۔ فرسٹ کلاس کا زنانہ ڈبہ انجن کے قریب ہی تھا۔ ان کی سیٹ ریزرو نہیں تھی۔ ٹکٹ بابو نے کہا تھا کہ ایک سیٹ آگے جا کر خالی ہو جائے گی۔ دن کا سفر تھا اس لیے فرسٹ کلاس کی ریزرویشن کے بغیر بھی نجمی کو ٹکٹ مل گیا تھا۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے میں کل چار لمبی نشستیں اور دو آمنے سامنے کے برتھ تھے۔ کچھ مسافر عورتیں اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھی تھرمس میں سے ٹھنڈا شربت نکال کر گلاسوں میں ڈال رہی تھیں۔ نجمی بھی ایک طرف کھڑکی کے پاس ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک نظر میں تینوں عورتوں کو دیکھ لیا۔ یہ عام گھریلو قسم کی ساڑھی پوش عورتیں تھیں۔ پھر وہ کھڑکی سے باہر تکنے لگی۔ کن انکھیوں سے وہ برابر دیکھ رہی تھی کہ کہیں کوئی پولیس والا یا پولیس والی تو اس طرف نہیں آ رہی؟ پلیٹ فارم پر کافی رش ہو گیا تھا۔ لوگ اپنا اپنا سامان ڈبوں میں پھینک رہے تھے۔

ٹرین صرف تین چار منٹ ٹھہرنے کے بعد آگے روانہ ہو گئی۔ ٹرین اسٹیشن سے باہر نکلی تو نجمی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب اس کے سامنے ایک طویل سفر تھا۔ جالندھر میں اسے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ پہچان نہ لی جائے لیکن اتنا خطرہ تو اسے مول لینا ہی تھا۔ ٹرین ایکسپریس تھی اور چھوٹے چھوٹے اسٹیشن چھوڑتی چلی جا رہی تھی۔ راج پورہ ٹھہری۔ اس کے بعد سرہند شریف اور پھر لدھیانے تک دوڑتی چلی گئی۔ سفر خیریت سے کٹ رہا تھا۔ فرسٹ کلاس ہونے کی وجہ سے کمپارٹمنٹ میں کوئی

نہیں آیا تھا۔ لدھیانہ میں لنچ تھا۔ ٹرین لنچ کے لیے چند منٹ زیادہ رکی رہی۔ نجمی نے ڈبے میں ہی لنچ کیا۔ ساتھی عورتوں نے اسی دوران نجمی سے کافی باتیں کر لی تھیں۔ نجمی کو انھیں الو بنانا آتا تھا انھیں ایک نئی کہانی سنا ڈالی۔ لدھیانہ سے آگے جالندھر آتا ہے۔ جالندھر ٹرین رکی تو نجمی نے کھڑکی کے نیم نسواری رنگ کے شیشے میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ پلیٹ فارم پر کافی رش تھا۔ کچھ سپاہی بھی نظر آئے لیکن ڈبے میں کوئی نہ آیا۔ یہاں سے نجمی نے ٹرین بدل کر ہوشیار پور جانے والی گاڑی پکڑنی تھی۔ جب ٹرین کے چلنے میں دو چار منٹ رہ گئے تو نجمی ڈبے سے اتر گئی۔

اترتے ہی اس نے سیدھا فرسٹ کلاس زنانہ ویٹنگ روم کا رخ کیا۔ وہاں جا کر منہ ہاتھ دھویا پھر اندر جو ریلوے کی بوڑھی ملازمہ تھی اس سے ہوشیار پور جانے والی گاڑی کے بارے میں پوچھا اس نے کہا کہ میں باہر جا کر بابو سے پتہ کرتی ہوں۔

نجمی نے اسے دس روپے انعام دے کر کہا۔ ”جلدی پتہ کر کے آؤ کہ ہوشیار پور جموں کو گاڑی کب چلے گی۔؟“

چھ سات منٹ بعد اس عورت نے آ کر نجمی کو بتایا کہ جموں کی گاڑی شام پانچ بجے یہاں سے چلے گی۔

نجمی نے دیوار پر لگا کلاک دیکھا۔ ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ کیا وہ ایک گھنٹہ ویٹنگ روم میں ہی گزار دے؟ نجمی ویٹنگ روم سے نکل کر فرسٹ کلاس کے ریفرشمنٹ روم میں آ گئی جو تقریباً خالی پڑا تھا۔ اس نے چائے اور کچھ سینڈوچ منگوائے اور چاروں طرف سے پوری طرح باخبر رہتے ہوئے چائے پینے اور سینڈوچز کھانے لگی۔ ہوشیار پور جانے والی ٹرین میں ابھی کافی وقت تھا۔ نجمی ریفرشمنٹ روم میں ہی بیٹھی رہنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے مزید چائے اور سینڈوچ منگوا لیے۔ یہ ریفرشمنٹ روم زنانہ نہیں تھا۔ دو ایک مسافر اندر آ کر اس دوران بیٹھے بھی تھے لیکن انھوں نے نجمی کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔

نجمی چائے کا دوسرا پیالہ بنا رہی تھی کہ یونہی اس کی نظریں دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ چائے کی کیتلی اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ دروازے میں گرجن سنگھ کھڑا نجمی کی طرف ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو گئی ہو۔ نجمی چاہتی تھی کہ بیٹھے بیٹھے اچانک غائب ہو جائے مگر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ یہ بات اس کے اختیار میں نہیں تھی۔ گرجن سنگھ آہستہ آہستہ چلتا اس کے قریب آکر رک گیا۔ دونوں ہاتھ جوڑے اور بولا "تم نے مجھے پہلے بتا دیا تھا جی۔ میں کوئی تمہارا دشمن تو نہ تھا۔"

نجمی نے کیتلی میز پر رکھ دی اور چہرہ نیچے کر کے ایک ہاتھ سے اپنے ماتھے کو دباتے ہوئے بولی "مجھے معاف کر دو۔ مگر میں مجبور تھی۔ تمھیں تو میرے بارے میں سب معلوم ہو ہی گیا ہو گا۔"

چہرہ اٹھا کر اس نے گرجن سنگھ کو دیکھا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ گرجن سنگھ ساتھ والی خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک بار اس نے پیچھے گردن گھما کر دروازے کی طرف بھی دیکھا۔ نجمی کہہ رہی تھی "کیا میں مجبور نہیں تھی۔ اگر تم میری جگہ پر ہوتے تو کیا ایسا نہ کرتے؟"

گرجن سنگھ نے ایک ہاتھ سے اپنی بندھی ہوئی داڑھی کو اوپر چڑھاتے ہوئے کہا "چندا جی تم نے جو کچھ کیا میں کچھ نہیں کہوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم چندا بھی نہیں ہو بلکہ مسلمان ہو اور تمھارا نام نجمی ہے اور پولیس تمھاری تلاش میں ہے۔"

گرجن سنگھ نے دوبارہ دروازے کی طرف دیکھا اور کسی قدر گھبراہٹ سے بولا "پولیس اسی وقت بھی ادھر ہی آ رہی ہے۔ شاید اسے تمھارا پتہ چل گیا ہے۔"

اب نجمی بھی گھبرا گئی۔ گرجن سنگھ اٹھتے ہوئے بولا۔

"نجمی جی میرے پیچھے آؤ میں تمھیں یہاں سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔ جلدی کرو۔"

نجمی اٹھی دس روپے کا نوٹ میز پر رکھ دیا اور گرجن سنگھ کے پیچھے پیچھے ریفریشمنٹ روم کے باتھ روم کی طرف چل پڑی۔

... .. ٭ .. ...

جالندھر ریلوے اسٹیشن کے اس ریفریشمنٹ روم کے باتھ روم کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جو اسٹیشن کے پوسٹ آفس کے احاطے میں کھلتا تھا۔ گرجن سنگھ کو اس راستے کا علم تھا جب نجمی گرجن سنگھ کے ساتھ ریلوے پوسٹ آفس کے نیم کے پیڑ والے احاطے میں آئی تو اسے خیال آیا کہ کہیں گرجن سنگھ کی بھی نیت تو نہیں بدل گئی۔

اس پر تو نجمی کا سارا ماضی کھل چکا ہو گا۔ دلی پولیس نے اسے نجمی کا سارا ریکارڈ بتا دیا ہو گا۔ آخر وہ سکھ ہے اور ہندوستانی ہے پولیس نے اسے یہ بھی بتا دیا ہو گا کہ نجمی عرف چندا بائی کا تعلق ندیم نام کے ایک نام نہاد پاکستانی جاسوس سے بھی رہا ہے جو بارڈر کراس کر کے فرار ہو چکا ہے اور نجمی عرف چندا ابھی انڈیا میں رہ کر پاکستان کے لیے جاسوسی کرتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ گرجن سنگھ بھی اس کی تلاش میں آیا ہو اور اب اسے اپنے بچھائے ہوئے جال میں پھنسانے لے جا رہا ہو۔

نجمی کے قدموں کی رفتار سست ہو گئی گرجن سنگھ نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور قریب آ کر بولا۔

"نجمی جی! کیا تم پولیس کے ہتھے چڑھنا چاہتی ہو؟ یقین کرو پولیس تمھارے پیچھے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئی ہے وہ ادھر بھی آ سکتی ہے جلدی کرو چلو۔"

گرجن سنگھ کے لہجے میں وہ مکاری اور عیاری نہیں تھی جو نجمی اس سے پہلے کئی ہندو نام نہاد دوستوں میں دیکھ چکی تھی۔ اس کے دل نے کہا نہیں گرجن سنگھ دھوکے باز نہیں ہے وہ نجمی کے ساتھ دھوکا نہیں کرے گا اگر اسے نجمی کو پکڑنا ہوتا تو وہیں پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیتا وہ منافقت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں کرے گا۔ نجمی کے قدم ایک بار پھر تیز ہو گئے۔

گرجن سنگھ نے ریل بازار میں آ کر ایک خالی ٹیکسی کو ہاتھ دیا اور نجمی کو اس میں بٹھا کر ڈرائیور سے کہا ”ماڈل ٹاؤن چلو۔“

جالندھر میں لاہور سے آئے ہوئے ہندوؤں سکھوں نے مل کر ایک نئی بستی ماڈل ٹاؤن کے نام سے بنائی تھی آزادی کے بعد جالندھر کی پہلی ماڈرن اور مضافاتی بستی تھی اس میں سڑکیں کشادہ تھیں اور پھل دار درخت لگائے گئے تھے۔ مکان کوٹھیوں کی طرز کے تھے اور زیادہ تر مالک مکان ہی رہائش پذیر تھے۔

ٹیکسی میں گرجن سنگھ نے نجمی سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ ماڈل ٹاؤن کی ایک چھوٹی سی کوٹھی کے احاطے میں اتر گیا۔ اس کوٹھی میں آم کے درخت تھے اور گیٹ پر صرف کوٹھی کا نمبر ہی لکھا ہوا تھا۔ گرجن سنگھ نجمی کو کوٹھی کے ایک اونچی چھت والے مختصر سے کمرے میں لے گیا جہاں دیوار کے ساتھ پلنگ اور آتشدان کے آگے صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ فرش پر پرانا قالین بچھا ہوا تھا۔ نجمی صوفے پر بیٹھ گئی۔ گرجن سنگھ نے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگائی تو نجمی نے آنکھیں ذرا سکیڑ کر گرجن سنگھ کی طرف دیکھا۔ گرجن سنگھ پر اس کا کوئی ردّعمل ظاہر نہ ہوا۔ شاید اس لیے کہ گرجن سنگھ کا دل صاف تھا وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا اس نے بیٹھنے سے پہلے چھت کا پنکھا چلا دیا تھا۔ گرجن سنگھ جیکٹ کی بجائے ٹی شرٹ اور سفید پتلون میں ملبوس تھا۔ بیٹھتے ہی دونوں ہاتھوں کو آہستہ ملتے ہوئے بولا۔

”آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ آپ ایک مسلمان ہیں۔ پاکستان سے آ کر کلکتے رہنے لگی تھیں۔ پھر جیدا ڈاکو بن گئی۔ کئی خون کیے۔ پولیس تو کہتی تھی کہ آپ پاکستان کی جاسوس بھی ہیں مگر میرا دل نہیں مانتا۔ اگر آپ جاسوس ہوتیں تو اغوا ہو کر مرہٹہ کا ٹل کے قید خانے میں نہ پہنچ جاتیں۔ جاسوسوں کے تو بڑے بازو ہوتے ہیں۔“

نجمی گرجن سنگھ کی باتیں خاموشی سے سن رہی تھی اس کا قیاس درست نکلا اسے سب کچھ معلوم ہو چکا تھا وہ کہہ رہا تھا۔

”اس رات پولیس نے میری بہن جی کے گھر چھاپہ مارا وہ گلابی ساڑھی والی ہندنی جاسوس ہی تھی۔

وہ بھی پولیس کے ساتھ آئی تھی ہم تو ہکا بکا رہ گئے تھے پولیس بولی ہمارے گھر میں پاکستانی جاسوس اور قاتل ڈاکو جیدا بائی چھپی ہوئی ہے میرا بہنوئی سرجن سنگھ بھی گھبرا گیا۔ ہرمندر کور کے کمرے میں جا کر دیکھا کہ تم وہاں نہیں تھیں ہم تو صاف مکر گئے کہ ہمارا کسی پاکستانی جاسوس سے کوئی تعلق نہیں کسی نے ہم سے دشمنی کی ہے جو ہمارا گھر بتا دیا ہے۔ سرجن سنگھ اور میں پولیس پہ چڑھ گئے۔ پولیس واپس چلی گئی لیکن سرجن سنگھ بولا کہ یہ عورت کون تھی گرجن سنگھ؟ اب میں کیا جواب دیتا۔ میں نے کہا بھا پا جی مجھے خود یقین نہیں آ رہا۔“

سوچ رہی تھی کہ اب اسے کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیئے۔ وہ اب بھی گرجن سنگھ کو یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ جموں جا رہی ہے گرجن سنگھ کہہ رہا تھا۔

میرے دل کو بڑا صدمہ ہوا۔ ڈاکو بننا کوئی بری بات نہیں۔ ڈاکو بڑے دلیر ہوتے ہیں اور عورت ڈاکو بن جائے تو مجھے بڑا اچھا لگتا ہے میری نظروں میں ایسی عورت کی عزت بڑھ جاتی ہے۔ عورت یونہی ڈاکو نہیں بنتی اس پر ہزاروں لاکھوں ظلم ہوں تب لاکھوں میں سے ایک عورت مردوں سے بدلہ لینے کے لیے بندوق اٹھاتی ہے۔ ہر کوئی عورت ایسا کہاں کرتی ہے۔ بے چاری عورتیں تو مردوں کے ظلم سہتی جاتی ہیں اور مرتی جاتی ہیں۔ افسوس مجھے اس لیے ہوا کہ تم نے مجھے اپنے راز میں شامل نہیں کیا۔ اگر تم صاف صاف اپنے دل کا حال بتا دیتیں تو میرے دل میں اور عزت بڑھ جاتی۔ اب مجھے پریشانی ہوئی کہ تم دلی میں نہ جانے کہاں بھٹک رہی ہو گی۔ میں تمھاری تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ سارا دن اور ساری رات تمھیں دلی میں جگہ جگہ ڈھونڈتا رہا پھر سوچا کہ شاید تم بارڈر کی طرف نہ نکل گئی ہو میں ٹرین میں بیٹھ کر امرتسر کی طرف چل پڑا اتفاق سے جالندھر پہنچ کر خیال آیا کہ کیوں نہ تمھیں یہاں بھی تلاش کرتا چلوں واہے گورو نے ملاقات کرانی تھی میں جالندھر اتر گیا اب واپس امرتسر جا رہا تھا کہ سوچا ریفریشمنٹ روم میں ہی ایک نظر جھانک کر دیکھ لوں۔ بس میرا دل مجھے تمھاری طرف کھینچے لیے آ رہا تھا اور تم سے ملاقات ہو گئی۔“

جب گرجن سنگھ نے اپنی بات ختم کر دی اور حسب عادت ایک ہاتھ سے اپنی بندھی ہوئی داڑھی کو اوپر چڑھانے لگا تو نجمی نے کہا۔

”سردار جی! تمھارا سلوک شروع ہی سے میرے ساتھ اتنا شریفانہ رہا کہ میں خواہش کے باوجود

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمھیں اپنے بارے میں کچھ نہ بتا سکی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں پاکستانی جاسوس نہیں ہوں۔ ندیم لاہور میں میرا کلاس فیلو تھا میں بُرے حالات میں اغواء ہو کر ہندوستان لائی گئی۔ یہاں در بدر کی ٹھوکریں کھاتی کلکتے کے بازارِ حسن میں پہنچا دی گئی۔ ندیم کو میں نے لاہور خط لکھا۔ وہ زائرین کی ایک جماعت میں شامل ہو کر دلی آ گیا ویسے اسے انڈیا کا ویزا نہیں مل سکتا تھا دلی آ کر وہ پولیس کو شک ہونے سے پہلے بغیر ہی مجھ سے ملنے کلکتے آ گیا مجھے کوٹھے پر دیکھا تو ششدر رہ گیا بولا! میں تمھیں یہاں سے لے کر ہی پاکستان جاؤں گا۔ میں نے کہا میں جب تک اپنے قاتلوں اپنے دشمنوں سے بدلہ نہیں لے لیتی یہاں سے نہیں جاؤں گی بس اس کشمکش میں وقت گزرتا چلا گیا۔ ندیم گرفتار ہو گیا۔ پولیس نے اس پر پاکستانی جاسوس ہونے کا مقدمہ درج کر لیا مجھ سے ایک بدمعاش کا خون ہو گیا پولیس میرے پیچھے بھاگی میں روپوش ہو گئی اور اتفاق سے ایک ڈاکو کے گروہ میں شامل ہو گئی اس ڈاکو کی موت کے بعد میں گروہ کی سردار چیندا ڈاکو بن گئی اور میں نے عورتوں پر ظلم کرنے والوں اور ان کی عزتوں کے سودے کرنے والوں ——————— کو قتل کرنا شروع کر دیا ندیم اس اثناء میں تنگ آ کر بارڈر کراس کر کے واپس پاکستان چلا گیا۔ جب میرے انتقام کی آگ سرد ہو گئی تو بدقسمتی سے مجھے ایسے حالات میں اغوا کر کے بردہ فروشوں کے پاس پہنچا دیا گیا کہ میں بالکل بے بس تھی مجھے بے ہوش کر دیا گیا تھا یوں میں انڈمان کے جزیرے میں کاٹل کے محل میں آ گئی جہاں تم سے ملاقات ہو گئی اور میں نے تم سے درخواست کی کہ مجھے یہاں سے نکالو اپنے آپ کو میں نے سنگھنی اس لیے ظاہر کیا کہ اس طرح سے تمھیں مجھ سے زیادہ ہمدردی ہو جائے گی۔"

گرجن سنگھ بولا... "آپ اپنے آپ کو سنگھنی نہ بھی ظاہر کرتیں تب بھی میں آپ کی ضرور مدد کرتا۔ ایک مصیبت میں پھنسی ہوئی عورت کی مدد کرنا ہر مرد کا فرض ہے" نجمی نے سر جھکا لیا اور قالین کے پھولوں کو تکتے ہوئے سوچنے لگی کہ اب یہاں سے کدھر کو اور کیسے جانا ہوگا۔ گرجن سنگھ نے بھی اس سے یہی سوال کر دیا۔

"اب آپ کا کیا ارادہ ہے آپ کدھر جا رہی تھیں ؟"

نجمی نے کہا... میں... میں تو ویسے ہی پولیس سے چھپتی پھر رہی تھی میری تو کوئی بھی منزل نہیں ہے۔ کلکتے بھی واپس نہیں جا سکتی۔"

گرجن سنگھ اپنے ہاتھوں کو ایسے مل رہا تھا جیسے پانی سے ہاتھ دھو رہا ہو۔ یہ اس کی عادت تھی کہنے لگا۔

"نجمی جی! ہندوستان میں تو آپ جہاں بھی رہیں گی پولیس آپ کو پکڑ لے گی۔ تم پر کئی قتلوں کے کیس چل پڑیں گے۔ میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ اگر تمھارے گروہ کے لوگ ہندوستان میں موجود ہیں تو ان کے پاس چلی جاؤ۔ وہاں کم از کم پولیس سے تو بچی رہو گی۔"

نجمی نے جواب میں کہا "گرجن سنگھ میرا گروہ بکھر چکا ہے۔ پتہ نہیں باقی لوگ کہاں چلے گئے ہیں۔"

گرجن سنگھ بولا... "پھر تو تمھیں پاکستان اپنے ہونے والے خاوند ندیم کے پاس ہی چلے جانا چاہیئے جی۔"

گرجن سنگھ کے منہ سے پاکستان جانے کا سُن کر نجمی کو عجیب سا لگا اس نے کہا۔

"میں پاکستان بھی تو نہیں جا سکتی۔ میں بارڈر کیسے کراس کر سکتی ہوں ؟"

گرجن سنگھ کچھ سوچنے لگا پھر اس نے نجمی کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کے ذہن میں کوئی ترکیب آ گئی ہو۔ کہنے لگا۔

"ایک طریقہ ہو سکتا ہے۔"

نجمی گرجن سنگھ کو تکنے لگی گرجن سنگھ کہہ رہا تھا۔

"دس پندرہ دن بعد امرتسر سے سکھوں کا ایک جتھہ ننکانہ صاحب کی یاترا کرنے پاکستان جا رہا ہے اگر تم چاہو تو میں تمھیں اس جتھے کے ساتھ پاکستان لے جا سکتا ہوں۔"

نجمی کے سامنے اچانک جیسے ایک بند دروازہ اپنے آپ کھل گیا اس نے دروازے کی دوسری جانب ایک باغ دیکھا جو سنہری دھوپ میں روشن تھا اور جہاں ندیم ایک درخت کے نیچے کھڑا اسے اپنے پاس بلا رہا تھا۔ سوال یہ تھا کہ کیا وہ گرجن سنگھ پر بھروسہ کر سکتی ہے؟ گرجن سنگھ قابلِ اعتبار آدمی تھا۔ لیکن یہ ہندوستان کی سرحد پار کرنے کا مسئلہ تھا راستے میں کئی مشکلیں پیدا ہو سکتی تھیں کیا گرجن سنگھ ایک ایسی عورت کو پاکستان لے جائے گا جس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بارے میں پولیس نے یہ پروپیگنڈہ کر رکھا ہے کہ وہ صرف خونی ڈاکو ہی نہیں بلکہ پاکستانی جاسوس بھی ہے اس نے گرجن سنگھ سے کہا۔

"یہ بڑا مشکل کام ہے میرا پاسپورٹ کیسے بنے گا اگر کسی کو پتہ چل گیا تو تم پر بھی مصیبت آ جائے گی پھر پولیس والے یہ تفتیش بھی کریں گے کہ میں تمھاری کون ہوں۔"

گرجن سنگھ اپنی داڑھی کو اوپر چڑھاتے ہوئے کچھ شرماتے ہوئے بولا "آپ جی اگر اجازت دیں تو میں تمھیں اپنی بیوی ظاہر کر کے اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔ پھر پولیس انکوائری بھی نہیں کرے گی۔"

نجمی کی آنکھوں کے آگے سے پردہ سا اٹھ گیا ہاں اس نے سوچا اس طریقہ سے وہ آسانی سے پاکستان جا سکے گی۔ اچانک اسے اپنے ساتھی بادل کا خیال آ گیا کیا یہ اس کے ساتھ غداری نہیں ہو گی؟ مگر وہ تو خدا جانے پولیس کی حراست سے رہا بھی ہوا ہے یا نہیں اس کے بارے میں تو نجمی کو خدا جانے کچھ ٹھیک طرح سے پتہ بھی نہیں تھا۔ بادل کو اس کے حال پر چھوڑ دو نجمی.... "یہ سنہری موقعہ شاید پھر کبھی نہیں ملے گا۔ گرجن سنگھ قابل اعتبار سکھ ہے وہ تمھیں بڑی آسانی سے سرحد پار کرا دے گا۔ نجمی نے سوچا پھر گرجن سنگھ سے کہا۔

"کیا ایسا ہو سکے گا گرجن سنگھ جی؟ میرا مطلب ہے کہیں تم پر کوئی آفت تو نہیں آ جائے گی کہیں میرے ساتھ تم بھی تو نہیں پکڑے جاؤ گے؟"

گرجن سنگھ بولا... "نجمی جی! میں نے پہلے دن سے آپ کی عزت کی ہے اور اسے مرتے دم تک نبھاؤں گا مجھے جو کچھ بھی کرنا پڑا کروں گا مگر آپ کو پاکستان ضرور پہنچا دوں گا میں پاسپورٹ بھی بنوا لوں گا تمھارا نام میں ہرنام کور ہی لکھواؤں گا۔ یہ سب کچھ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ صرف اپنی اجازت دے دو۔"

نجمی نے کہا "میری طرف سے تمھیں اجازت ہے۔"

گرجن سنگھ صوفے سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

"تو پھر ٹھیک ہے آج ہی امرتسر چلے چلتے ہیں۔ جتھا امرتسر سے روانہ ہونے والا ہے امرتسر میں میرا ایک بچپن کا دوست کرپال سنگھ پاسپورٹ آفس میں ملازم ہے ہندوستان سے سکھوں کا

جو جتھہ پاکستان کے گوردواروں کی یاترا کو جا رہا ہے۔ اس کے لیڈر گیانی جی سے اس کی رشتے داری بھی ہے۔ وہ ہمارے پاسپورٹ بھی بنوا دے گا اور جتھے میں نام بھی درج کرا دے گا۔"

نجمی نے فکرمندی سے کہا۔

"لیکن گرجن! ظاہر ہے میں پاکستان میں رہ جاؤں گی جتھہ جب واپس انڈیا کے باڈر پر پہنچے گا تو تم سے ضرور پوچھا جائے گا کہ تمھاری بیوی ہرنام کور کہاں ہے اس کا تم کیا جواب دو گے؟"

گرجن سنگھ نے بازو ہلا کر کہا۔

"یہ بعد میں دیکھ لوں گا تم تیاری کرو ہم تھوڑی دیر بعد امرتسر کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ اور ہاں یہاں سے ہی تمھیں پوری سکھنی بن کر میرے ساتھ چلنا ہو گا میں تمھارے لیے کڑا اور کرپان اور زرد دوپٹہ کہیں سے لاتا ہوں تم یہاں سے باہر مت جانا۔ یہ جگہ بالکل محفوظ ہے میں جلدی یہ چیزیں لے کر آ جاؤں گا اندر سے کنڈی لگا لینا ویسے میں باہر سے تالا بھی لگاتا جاؤں گا۔"

گرجن سنگھ چلا گیا تو نجمی کو بادل کا خیال ستانے لگا اس کے ضمیر میں کانٹا سا کھٹکنے لگا تھا۔ اسے بادل کو یوں چھوڑ کر نہیں جانا چاہیئے لیکن بادل تو ہندوستان ہی کا باشندہ ہے وہ تو یہیں رہے گا اور پھر بادل بھی تو اسے باڈر کراس کرانے کے ہی جتن کر رہا تھا۔ فرض کر لیا کہ اگر بادل ابھی تک پولیس کی حراست میں ہے تو نجمی اسے وہاں چھڑا تو نہیں سکے گی اور اگر وہ پولیس کی حراست سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے تو نجمی اسے اتنے بڑے ملک میں تلاش بھی نہیں کر سکتی یوں نجمی کے ذہن نے اپنے منطقی استدلال سے اس کے ضمیر کو مطمئن کر دیا اور وہ خوش ہو گئی کہ اب وہ جلد پاکستان پہنچ کر ندیم سے مل سکے گی اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ندیم کے ساتھ شادی کر کے کسی دوسرے ملک میں جا کر آباد ہو جائے کیونکہ اس کے رشتے دار اس کو پاکستان میں چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے کوئی پون گھنٹے بعد گرجن سنگھ واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا اس میں سے لوہے کا ایک کڑا، کالی پٹی والی کرپان اور بسنتی دوپٹہ نکال کر گرجن سنگھ نے نجمی کو دیا اور بولا "یہ کڑا اور کرپان پہن کر سر پر دوپٹہ اوڑھ لو امرتسر میں میں تمھیں اپنے دوست کرپال سنگھ کی بیوی سے اپنی پتنی.. ہرنام کور کے نام سے ملواؤں گا تم بھی ان پر یہی ظاہر کرنا کہ تم میری بیوی ہو اور ایک ماہ پہلے دلی میں ہماری شادی ہوئی تھی تم بہت کم بات کرنا۔ ساری باتیں میں کروں گا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نجمی نے اپنی کلائی میں کڑا اور گلے میں کرپان ڈال لی سر پہ دوپٹہ اوڑھ لیا اب وہ پوری سنگھنی لگ رہی تھی۔ گرجن سنگھ کہنے لگا۔

"ٹرین ایک گھنٹے بعد امرتسر جائے گی کیوں نہ ہم لاری پکڑ لیں؟"

نجمی نے کہا۔۔۔ "نہیں نہیں لاری میں خطرہ ہے ٹرین ہی ٹھیک رہے گی۔"

"جیسے تمہاری مرضی" گرجن سنگھ ہاتھوں کو رگڑتے ہوئے بولا "تو پھر میں چلتا ہوں آدھے گھنٹے بعد آؤں گا۔"

جالندھر سے تیسرے پہر جو گاڑی امرتسر کے لیے چلی وہ دلی سے آ رہی تھی اس میں کافی رش تھا لیکن گرجن سنگھ نے مسٹر اور مسز گرجن سنگھ کے نام سے سیکنڈ کلاس میں پہلے ہی سے دو۔۔۔ نشستیں ریزرو کروالی تھیں پلیٹ فارم پر کافی رش تھا۔ نجمی ہرنام کور کے روپ میں گرجن سنگھ کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ کلائی کے کڑے کرپان اور بسنتی دوپٹے کی وجہ سے وہ بالکل سنگھنی لگ رہی تھی۔ سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں ہندو سکھ عورتیں اور مرد پہلے سے بیٹھے تھے۔ گرجن سنگھ بھی نجمی کو ساتھ لے کر ڈبے میں بیٹھ گیا۔ ٹرین امرتسر کے لیے روانہ ہو گئی۔ امرتسر تک صرف چالیس میل کا فاصلہ تھا ٹرین بھی ایکسپریس قسم کی تھی۔ چار بجے یہ لوگ امرتسر پہنچ گئے۔ اسٹیشن سے دونوں ایک سائیکل رکشا پر بیٹھے اور رکشا شہر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں گرجن سنگھ نے اپنی فیملی کے بارے میں نجمی کو ضروری باتیں سمجھا دی تھیں۔

"اپنے بارے میں صرف یہی کہنا کہ تم انڈیمان میں اپنے باپ کے پاس رہتی تھیں۔ وہیں تمہاری شادی مجھ سے ہو گئی اور اب گوردواروں کی یاترا کے لیے اپنے خاوند کے ساتھ انڈیا آئی ہو۔"

نجمی نے ساری باتیں اپنے ذہن میں پکا لی تھیں ویسے بھی وہ ایک تجربہ کار اور ہوشیار عورت تھی اور ہر قسم کے بھیس کو بڑی خوش اسلوبی سے نبھا سکتی تھی خطرہ صرف اسے پولیس کی جانب سے تھا کہ کہیں پاسپورٹ آفس میں کوئی اس کی شکل کو پہچان کر پولیس کو خبر نہ کر دے۔ اس کے لیے گرجن سنگھ نے یہ کہہ کر تسلی کر دی تھی کہ وہ اس کی تصویر سر پر دوپٹہ اوڑھا کر اس طرح سے اترواۓ گا کہ کوئی بھی اسے آسانی سے پہچان نہ سکے گا۔ امرتسر میں گرجن سنگھ کے پاسپورٹ آفس والے دوست کا گھر مجیٹھہ روڈ پر تھا کمپنی باغ امرتسر میں گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول کے

سامنے ایک سڑک مال روڈ سے مشرق کی طرف جاتی ہے یہ مجیٹھہ روڈ کہلاتی ہے۔ اس سڑک کی دونوں جانب اونچے اونچے جامن کے درخت ہیں برسات کے موسم میں ان درختوں پر سے ٹپ ٹپ جامنیں گرتی رہتی ہیں آج کل یہ علاقہ کافی آباد ہو گیا ہے اور میڈیکل کالج سے بھی آگے تک آبادی چلی گئی ہے میڈیکل کالج کے پاس ہی کرپال سنگھ کا گھر تھا اس گھر میں گرجن سنگھ اور نجمی کا بڑی گرمجوشی سے استقبال ہوا کرپال سنگھ کی بیوی اور دو چھوٹے بچے تھے گھر معمولی قسم کا تھا گرجن سنگھ نے جاتے ہی ان لوگوں کو اپنی شادی اور اب بیوی کے ساتھ پاکستان کی یاترا کے بارے میں سب کچھ بتا دیا کرپال سنگھ کی بیوی نے نجمی کو تاری والا دوپٹہ تحفے میں دیا۔ کرپال سنگھ نے پچاس روپے منہ دکھائی دی جو نجمی نے ہرنام کور کی حیثیت سے لے لی۔

رات کے کھانے کے بعد گرجن سنگھ نے کرپال سنگھ سے پاسپورٹ کی بات کرتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس تو پاسپورٹ ہے مگر میری بیوی ہرنام کور کا پاسپورٹ ابھی نہیں بنایا گیا۔ جتھے کے پاکستان جانے میں تھوڑے دن رہ گئے ہیں میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے اثر ورسوخ سے کام لے کر میری بیوی کا پاسپورٹ بنوا دو اور ساتھ ہی گیانی جی سے مل کر اس جتھے میں ہم دونوں کا نام بھی درج کرا دو کیونکہ اگر یہ چانس ہاتھ سے نکل گیا تو پھر مجھے دو سال تک چھٹی نہ مل سکے گی۔"

کرپال سنگھ گلاس ہاتھ سے رکھتے ہوئے بولا۔

"گرجن سیاں! تو فکر کیوں کرتا ہے میرے یار! بھابی کا پاسپورٹ بھی بن جائے گا اور جتھے میں تم دونوں کا نام بھی شامل کرا دوں گا یہ کونسی بڑی بات ہے لو۔ اپنے گلاس میں ڈالو"

کرپال سنگھ نے دوسرے ہی دن نجمی کی پاسپورٹ سائز کی تصویریں بنوائیں اور ضروری باتیں معلوم کر کے آفس چلا گیا اس نے دو ایک دن میں نجمی کا ہرنام کور کے نام سے پاسپورٹ بنوا دیا۔ نجمی کے۔۔۔ پاسپورٹ کی تصویریں بالکل سنگھنی کی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ بڑی خوش ہوئی اب صرف پاکستان جانے والے سکھوں کی جماعت میں اس کا نام درج کروانا باقی تھا کرپال سنگھ اسی شام جتھے کے لیڈر اور اپنے قریبی رشتے دار گیانی جی سے ملنے اس کے گھر پر چلا گیا اسے بتایا کہ گرجن سنگھ اپنی پتنی کے ساتھ کالے پانی سے یاترا کی خواہش لے کر آیا ہے اس کا نام جتھے میں شامل نہ ہوا تو پھر کئی سالوں تک وہ یہ یاترا نہ کر سکے گا۔ گیانی جی نے فوراً گرجن سنگھ اور اس کی بیوی ہرنام کور کا نام لسٹ میں شامل کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیا اور کرپال سنگھ سے کہا کہ وہ کل ان کے پاسپورٹ پہنچا دے۔ نجمی اور گرجن سنگھ کو جب اس خوش خبری کا علم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ رات کو گرجن سنگھ اور نجمی کو ایک کمرے میں چارپائی ڈال دی گئی۔ گرجن سنگھ نے فرش پر بستر لگا لیا اور نجمی سے کہا۔

"میں یہاں سو جاؤں گا آپ چارپائی پر سوئیں اب صبح کرپال لے کو پاسپورٹ دینے ہوں گے میرا نہیں خیال کہ پولیس تمھاری شکل پہچانے تمھارا کیا خیال ہے نجمی جی؟"

نجمی نے بٹوے میں سے اپنا پاسپورٹ نکال کر اپنی تصویر غور سے دیکھی اور پھر گرجن سنگھ کو دکھاتے ہوئے بولی۔ دوپٹے سے سر ڈھانپنے کی وجہ سے میرا حلیہ کافی بدل گیا ہے پولیس کے پاس جو میری تصویر ہے اس میں، میں نے ساڑھی پہن رکھی ہے اور کانوں میں لمبے لمبے کانٹے بھی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ پولیس کو یہ تصویر دیکھ کر میرا خیال نہیں آئے گا۔"

گرجن سنگھ غور سے میری تصویر دیکھ رہا تھا پھر نجمی کو پاسپورٹ واپس کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"اس تصویر میں تم کافی بدلی ہوئی لگتی ہو۔"

نجمی نے پاسپورٹ لے کر اپنے پرس میں رکھ لیا۔ گرجن سنگھ چارپائی سے ایک قدم کے فاصلے پر فرش پر بستر لگائے نیم دراز تھا چھت کا پنکھا آہستہ آہستہ چل رہا تھا رات کے گیارہ بج رہے ہوں گے نجمی نے کہا۔

"مجھے یہی خیال آتا ہے کہ واپسی پر جب تم اکیلے بارڈر کراس کرنے لگو گے تو کسٹم والوں کو کیا جواب دو گے؟ کہ تمھاری بیوی کہاں ہے؟"

گرجن سنگھ لیٹے لیٹے بولا۔ "نجمی جی! یہ باتیں تم مجھ پر چھوڑ دو میں جانوں اور میرا کام۔"

پھر نجمی کی چارپائی کی طرف پہلو بدل کر کہنے لگا۔

"تم لاہور میں مجھ سے جدا ہو جاؤ گی نا؟ لاہور کی تو ساری سڑکوں کا آپ کو پتہ ہوگا وہ تمھارا اپنا شہر جو ہوا میرا خیال ہے کہ قلعے والے گوردوارے سے ہم انار کلی کی سیر کو جائیں گے بس وہاں سے تم مجھ سے الگ ہو جانا۔"

نجمی کو عجیب سا لگ رہا تھا اسے گرجن سنگھ سے محبت تو کبھی نہیں ہوئی تھی مگر وہ اس

کردار سے بڑی متاثر ہوئی تھی وہ جانتی تھی کہ جب وہ اپنی "بیوی" کے بغیر بارڈر کراس کرنے لگے گا تو اسے بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ بات کوئی معمولی نہیں ہوگی کہ آدمی بیوی کے ساتھ بارڈر کراس کرنے جاتا ہے اور واپسی پر اس کی بیوی اس کے ساتھ نہیں ہے لیکن نجمی اس ضمن میں اس کی کوئی مدد بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے گرجن سنگھ کی باتیں سننے کے بعد کہا۔

"ہاں لاہور میرا شہر ہے۔ مجھے معلوم ہے انار کلی سے نکل کر مجھے کدھر جانا ہوگا۔ ہمارا پرانا گھر رنگ محل انار کلی سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

گرجن سنگھ بولا۔ "میں صرف دو بار لاہور گیا ہوں۔ لاہور مجھے بڑا پسند ہے بڑے اچھے لوگ ہیں لاہور کے۔ اچھا زندگی رہی تو پھر کبھی تمھیں ملنے لاہور ضرور آؤں گا اب میں سو رہا ہوں مجھے نیند آ رہی ہے۔"

اور تھوڑی ہی دیر بعد گرجن سنگھ کے خراٹوں کی آواز گونجنے لگی۔

سکھوں کے جتھے کی پاکستان روانگی کا دن قریب آ رہا تھا۔ نجمی گرجن سنگھ کے ساتھ اس کے دوست کرپال سنگھ کے گھر پر ہی مقیم تھی جتھے کی روانگی میں ایک دن باقی رہ گیا تھا کہ کرپال سنگھ نے آکر بتایا کہ امرتسر کے دربار صاحب میں گیانی جی نے جتھے میں شریک ہونے والے تمام لوگوں کو بلایا ہے یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی گرجن سنگھ نے نجمی کو ساتھ لیا اور دربار صاحب کی طرف روانہ ہو گیا۔ بلیک روڈ سے دربار صاحب کافی دور تھا انھوں نے رکشا پکڑا اور ہال بازار چوک ملکہ وکٹوریہ اور جلیانوالہ باغ سے گزرتے ہوئے دربار صاحب پہنچ گئے وہاں اکال تخت کے سامنے تمبو قناتیں لگی تھیں۔ وہ سارے سکھ مرد عورتیں قناتوں کے اندر دریوں پر بیٹھے تھے جنھیں ایک دن بعد جتھے کی شکل میں یاترا کے لیے پاکستان روانہ ہونا تھا۔ گرجن سنگھ اور نجمی بھی ایک طرف ہو کر دری پر بیٹھ گئے۔ کرپال سنگھ نے جتھے کے سردار گیانی صاحب کے نام ایک پرچی لکھ کر دے دی تھی کہ یہ میرے دوست گرجن سنگھ اور اس کی پتنی ہرنام کور ہے۔ گیانی صاحب لمبی سفید ڈاڑھی والے لحیم و شحیم سکھ تھے جنھوں نے زرد چولا پہن رکھا تھا وہ باری باری ہر یاتری کو اکال تخت کے ساتھ والے چھوٹے سے کمرے میں بلاتے ان کو ضروری باتیں بتلاتے کہ پاکستان جا کر انھیں سوائے گوردواروں کے اور کسی جگہ نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جانا ہوگا اور ہندوستان کے بارے میں کوئی غیر ذمے داری کی بات زبان سے نہیں نکالنی ہوگی یہ ایک طرح کی بریفنگ تھی جو ضروری ہوتی ہے گیانی صاحب کرسی میز لگائے بیٹھے تھے ان کے ساتھ دوسری کرسی پر علاقے کا تھانیدار آتمارام بھی بیٹھا تھا جو یاتری آتا آتمارام تھانیدار اسے سر سے پاؤں تک غور سے اسے دیکھتا اور اگر کوئی سوال کرنا ہوتا تو وہ بھی کرلیتا گرجن سنگھ اور نجمی کی باری بھی آگئی۔

نجمی نے اکالی سکھوں والی نیلی شلوار قمیص پہن رکھی تھی نیلے رنگ کی چادر سر پر تھی اور کمر میں کرپان لٹک رہی تھی۔ گرجن سنگھ نجمی کو لے کر گیانی صاحب کے سامنے حاضر ہوگیا۔ دونوں نے ہاتھ جوڑ کر ست سری اکال کہا گیانی صاحب نے بھی ست سری اکال کہا اور رجسٹر پر نیل سے نشان لگاتے ہوئے بولے۔

"گرجن سنگھ ولد شیرا سنگھ۔"

"ہاں جی"، گرجن سنگھ نے جواب دیا۔

پھر گیانی صاحب نے نجمی کی طرف بے نیازی سے دیکھا اور کہا۔

"یہ تمھاری پتنی ہرنام کور ہے؟"

"ہاں جی۔"

"تم لوگ انڈیمان سے آئے ہو؟" گیانی نے پوچھا

"ہاں جی۔" گرجن سنگھ نپے تلے انداز میں جواب دے رہا تھا۔

نجمی سنگھنی کی طرح ہاتھ باندھے گرجن سنگھ کے ساتھ ہی خاموش کھڑی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ باوردی تھانیدار آتمارام اسے ضرورت سے زیادہ دلچسپی اور تجسس کے ساتھ گھور رہا ہے اس کا ماتھا ٹھنکا پھر خیال آیا کہ ممکن ہے جس طرح بعض مردوں کو عورتوں کی طرف گھور کر دیکھنے کی عادت ہوتی ہے یہ بھی ایسا ہی مرد ہو مگر وہ تھانیدار تھا اور اس کی نظروں میں تیرتا ہوا شک نجمی کو صاف دکھائی دے رہا تھا۔ گرجن سنگھ گیانی صاحب کے مختصر سوالوں کا جواب دینے میں مصروف تھا۔

اچانک تھانیدار آتمارام نے پوچھا

"آپ لوگ کلکتے میں بھی رہے ہیں؟"

کلکتے کا نام سنتے ہی نجمی کے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔

گرجن سنگھ نے کہا... "جی کلکتے ایک دو بار گیا ضرور ہوں مگر وہاں رہا کبھی نہیں۔"

تھانیدار نے اب نجمی کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"بی بی! تم شادی سے پہلے کبھی کلکتے گئی ہو؟"

نجمی نے بڑے بھولے پن سے جواب دیا۔

"جی نہیں میں کلکتے کبھی نہیں گئی۔"

اب گیانی صاحب نے تھانیدار کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کیا بات ہے آتمارام جی۔ آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"ویسے ہی گیانی جی۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔" یہ کہہ کر تھانیدار آتمارام تیز تیز قدموں سے دربار صاحب کے گھنٹہ گھر والے دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ نجمی نے گرجن سنگھ سے کہا "گرجن سنگھ مجھے یقین ہے اس ہندو تھانیدار نے مجھے پہچان لیا ہے۔"

گرجن سنگھ گھنٹہ گھر والے گیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔

"تمھیں کیسے یقین ہے؟"

نجمی نے کہا... "بس مجھے یقین ہے یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیئے۔"

گرجن سنگھ مسکرانے لگا پھر دونوں ہتھیلیوں سے اپنی بندھی ہوئی ڈاڑھی کو اوپر چڑھاتے ہوئے بولا۔

"آپ کو وہم ہوگیا ہے تھانیدار اپنے کسی کام سے گیا ہوگا اسے کیا پتہ کہ تم کون ہو اچھا میں ذرا ماتھا ٹیک آؤں تم یہیں بیٹھنا میں ابھی آتا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ نجمی گرجن کو جانے سے روکتی وہ قناتوں سے نکل کر پرا کرما والی عمارت میں داخل ہوچکا تھا نجمی کی نگاہیں بے اختیار گھنٹہ گھر والے دروازے کی طرف اٹھ گئیں یہ دروازہ اکال تخت سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ قناتوں سے باہر آ کر سامنے جو بیری کا پرانا سوکھا ہوا درخت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا اس کی اوٹ میں آکر کھڑی ہوگئی اچانک اس نے دیکھا دروازے میں سے تھانیدار آتمارام چلا آتا ہے اس کے ساتھ چار پولیس کانسٹیبل ہیں جنھوں نے سر پہ رومال باندھ رکھے ہیں نجمی خاموشی سے ان سکھ عورتوں کے ہجوم میں شامل ہوگئی جو دربار صاحب کے درشنی ڈیوڑھی والے دروازے کی طرف جا رہی تھی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا ۔ تھانیدار آتمارام چلا آتا ہے اس کے ساتھ چار پولیس کانسٹیبل چلے آتے ہیں جو تیز تیز قدموں سے قناتوں کے اندر داخل ہو گئے تھے ۔ وہ نجمی عرف چنداڈاکو کو گرفتار کرنے آئے تھے ۔ نجمی نے اپنی رفتار تیز کر دی اور عورتوں کے ہجوم کو پیچھے چھوڑتی ہوئی درشنی ڈیوڑھی والے دروازے سے نکل کر امرتسر کے گنجان بازار میں آ گئی اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ کونسا محلّہ تھا ۔ یہاں ہندوؤں اور سکھوں کی دکانیں تھیں اور اتنا رش تھا کہ نجمی کے لیے چلنا مشکل ہو رہا تھا ۔ وہ جتنی جلدی ہو سکے دربار صاحب کے علاقے سے نکل جانا چاہتی تھی اسے معلوم تھا کہ اب تک تھانیدار آتمارام اور اس کے سپاہی نجمی کی تلاش میں دربار صاحب کا چپہ چپہ چھان رہے ہوں گے اور ممکن ہے کہ وہ درشنی ڈیوڑھی کی طرف بھی آ جائیں اس دروازے کا نام نجمی نے ضرور سن رکھا تھا مگر وہ بالکل نہیں جانتی تھی کہ یہ بازار آگے امرتسر کے کونسے علاقے کی طرف نکلتا ہے ۔ تنگ پیچدار بازار ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا ۔ نجمی سکھنی کے بھیس میں چلتی چلی جا رہی تھی ۔ ہر قدم پر خطرہ تھا کسی بھی لمحے کوئی پیچھے سے اسے پکڑ سکتا تھا ۔

... ...

امرتسر شہر کے یہ بازار بڑے گنجان تھے ۔ نجمی نے اس خیال سے کہ اس پر کسی کو شک نہ ہو اپنی رفتار ماحول کے مطابق کر لی ۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ پیچھے دیکھ لیتی تھی کہ کہیں کوئی پولیس والا تو اس کے پیچھے نہیں لگا ہوا ۔ ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں تھی ۔ نجمی کے اندازے کے مطابق پولیس اس کا پیچھا نہیں کر رہی تھی ۔ اب یہ سوال اسے پریشان کر رہا تھا کہ وہ جا کہاں رہی ہے ؟ امرتسر شہر اس کے لیے ایک اجنبی شہر تھا ۔ واپس دربار صاحب وہ نہیں جا سکتی تھی ۔ اسے معلوم تھا کہ ... تھانیدار آتمارام نے اسے پہچان لیا ہے کہ وہ گرجن سنگھ کی بیوی پریتام کور نہیں بلکہ ہندوستان کی مشہور ڈکیت چندا بائی ہے جس پر پاکستان کی جاسوسی ہونے کا بھی الزام ہے ۔ ان حالات میں گرجن سنگھ بہت بڑی مصیبت میں پھنس سکتا ہے ۔ نجمی کو افسوس ہونے لگا کہ اس نے محض اپنی ذاتی غرض کے لیے اس سیدھے سادے انسان کو پریشانی میں مبتلا کر دیا ۔ لیکن اس سیدھے سادے انسان یعنی گرجن سنگھ کی مدد کے بغیر نجمی اس کالے پانی کے جزیرے والے خونی محل سے نکل بھی نہیں سکتی تھی ۔ بازار تنگ تھے اور لوگ کافی تعداد میں آ جا رہے تھے ۔ دکانیں کھلی تھیں ۔ اس ہجوم کی وجہ سے نجمی بغیر کسی کی نظروں میں آئے وہاں سے گزرتی چلی گئی ۔ بازار جلدی جلدی موڑ گھوم جاتے تھے یوں نجمی کئی بازاروں میں سے گزر گئی تھی ۔ ایک بازار سے وہ باہر نکلی تو سامنے کھلا چوک تھا اور چوک کے بیچ میں ملکہ وکٹوریہ کا مجسمہ لگا تھا ۔ ساتھ ہی ایک چھوٹا سا باغ تھا جس کا نام کمپنی باغ تھا ۔ نجمی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ انجانے میں امرتسر شہر کی پولیس کوتوالی کی طرف چلی جا رہی ہے ۔ ذرا آگے جا کر جب اسے پولیس کی بیرکیں اور اونچی چھت ہوئی کوتوالی کی ڈیوڑھی نظر آئی تو جلدی سے دوسری سڑک پر ہو گئی اور تیز تیز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چلنے لگی۔ اس نے سر اچھی طرح سے ڈھانپ رکھا تھا۔ ایک بات یقینی تھی کہ پولیس نے شہر میں اس کی تلاش شروع کر دی ہو گی اسے جلدی کسی جگہ پناہ لینے کی ضرورت تھی مگر سوال یہ تھا کہ وہ کہاں پناہ لے؟

وہ کیسری باغ والی پانی کی بڑی ٹینکیوں کے نیچے سے ہو کر بازار رنگریزاں میں آ گئی تھی۔ یہاں سے وہ مشرق کی طرف چل پڑی۔ یہ سڑک قدرے کشادہ تھی آگے شہر کا دروازہ آ گیا یہ چاٹی ونڈ دروازہ تھا۔ دروازے کے باہر آ کر اس نے فصیل شہر کے ساتھ جو گندہ بدرو تھا اس سے ذرا ہٹ کر چلنا شروع کر دیا۔ آگے دروازہ مہان سنگھ آ کر گزر گیا۔ اب نجمی کی بائیں جانب شہر کی فصیل والے مکان تھے اور دائیں جانب ہاتھی گراؤنڈ اور اس کے پیچھے شریف پورے کی آبادی تھی۔ جہاں کبھی مسلمان رہتے تھے اور اب یہاں زیادہ آبادی سکھ شرنارتھیوں کی تھی جنھوں نے اس کا نام سنگھ پورہ رکھ دیا تھا لیکن عام لوگ اب بھی اسے شریف پورہ ہی کہتے تھے۔ نجمی ان سارے علاقوں سے بے خبر تھی۔ اب آگے رام باغ کا پولیس اسٹیشن تھا۔ نجمی نے دور سے چند ایک سپاہیوں کو دیکھا تو ہاتھی گراؤنڈ سے ہوتی ہوئی ریلوے پل کی طرف چلنے لگی۔ چلتے چلتے وہ تھک بھی گئی تھی۔ ستمبر کے دن تھے اسے پسینہ بھی آ رہا تھا مگر وہ چلتی چلی جا رہی تھی۔ اس کا ذہن تیزی سے سوچ بھی رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے؟ آخر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ امرتسر شہر سے موقعہ ملتے ہی کسی طرح سے نکل کر جموں کی طرف روانہ ہو جائے گی۔ جموں اس کی منزل تھی... سکھوں کے جتھے کے ساتھ گوردواروں کی یاترا کے بہانے پاکستان میں داخل ہونے کا اس کا منصوبہ ناکام ہو گیا تھا۔ پل سے اتری تو سامنے امرتسر پٹھان کوٹ کا لاری اڈہ تھا۔ کچھ لاریاں کھڑی تھیں۔ ایک لاری مسافروں سے بھری ہوئی تھی اور ایک آدمی شور مچا رہا تھا، "چلو پٹھانکوٹ ایک سواری،" نجمی نے سوچا کہ اسے اس لاری میں بیٹھ کر پٹھانکوٹ چلے جانا چاہیئے۔ وہاں سے وہ جموں چلی جائے گی۔ وہ لاری اڈے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ اسے دو سکھ پولیس کانسٹیبل لاری کی طرف جاتے نظر آئے۔ نجمی وہیں ایک طرف ہو کر کھڑی ہو گئی۔ پولیس کے سپاہیوں نے سارے مسافروں کو لاری سے نیچے اتروا لیا اور ایک ایک کر کے ان سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔

وہ نجمی ہی کی تلاش میں تھے۔ نجمی نے ایک منٹ بھی ضائع نہ کیا اور واپس مڑ کر پل کی چڑھائی چڑھنے لگی۔ یہاں سے وہ دوسری طرف آ گئی اور پھر جو سامنے سڑک نظر آئی ادھر ہی نکل گئی۔ یہ سڑک ضلع کچہری کی طرف جاتی تھی۔ نجمی دائیں جانب مڑ گئی۔ اب وہ امرتسر کے مشہور باغ... کمپنی باغ میں داخل ہو گئی تھی۔ یہاں وہ محفوظ نہیں تھی باغ میں کسی جوان عورت کو مشکوک سمجھا جا سکتا تھا۔ نجمی ان ہی خیالات میں ڈوبی باغ کی باڑھ کے ساتھ ساتھ چلی جا رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر ایک سکھ سپاہی پر پڑی جو آگے ایک پرانی مغلیہ طرز کی بارہ دری کے سامنے کھڑا تھا۔ نجمی نے اپنی رفتار آہستہ کر دی اور باڑھ میں سے گزر کر گراؤنڈ میں آ گئی اب اس کا رخ سامنے والی سڑک کی طرف تھا۔ سڑک پر آتے ہی اسے ایک خالی رکشا مل گیا وہ لپک کر رکشے میں بیٹھ گئی اور بولی۔

"اسٹیشن چلو۔"

یہ اس نے ویسے ہی کہہ دیا تھا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اسٹیشن جانا اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کرنے کے برابر تھا کیونکہ اسٹیشن پر تو پولیس ضرور اس کی ٹوہ میں موجود ہو گی۔ یہ سائیکل رکشا تھا اور اسے ایک ادھیڑ عمر کمزور سا سکھ چلا رہا تھا۔ نجمی کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے؟ سائیکل رکشہ اسٹیشن کی طرف چلا جا رہا تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد نجمی نے رکشہ ڈرائیور سے کہا۔

"سردار جی! رکشہ ایک طرف کر لو۔"

اس نے رکشہ سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے کھڑا کر دیا۔ یہ شہر کا باہر والا علاقہ تھا اور یہاں ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ رکشہ ڈرائیور نے گردن گھما کر نجمی سے پوچھا۔

"بی بی! تمھیں جانا کہاں ہے؟"

سکھ رکشہ ڈرائیور نے نجمی کے گلے میں لٹکتی کرپان اور کلائی میں پڑے ہوئے لوہے کے کڑے سے پہچان لیا تھا کہ یہ کوئی سکھ عورت ہے۔ نجمی نے کہا "سردار جی! میں اپنے آدمی کے ساتھ دربار صاحب میں ماتھا ٹیکنے آئی تھی۔ ہم دربار صاحب سے اس باغ کی سیر کرنے آ گئے۔ وہ مجھے یہاں بٹھا کر کھانے کو کچھ لینے چلا گیا دو گھنٹے ہو گئے ہیں واپس نہیں آیا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سکھ رکشہ ڈرائیور سائیکل رکشہ کی گدی سے نیچے اتر پڑا۔ نجمی کے قریب آ کر بڑی شفقت سے کہنے لگا۔

"دھی رانی! فکر کی کوئی بات نہیں۔ تمھارا آدمی آجائے گا۔ تمھیں اسی جگہ بیٹھے رہنا چاہیئے تھا جہاں وہ تمھیں چھوڑ گیا ہے۔"

نجمی نے جلدی سے کہا "اسے آنا ہوتا تو آ گیا ہوتا۔ دو گھنٹے ہو گئے ہیں میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"رکشا ڈرائیور نے پوچھا: "دھی رانی! تم کون سے گاؤں سے آئی ہو؟"

نجمی کو امرتسر کے کسی گاؤں کا نام یاد نہیں تھا یونہی بولی "اکال گڑھ نام ہے ہمارے گاؤں کا۔ ہم پہلے پہلے بیکھے پہر لاری پر سوار ہو کر امرتسر آئے تھے۔ مجھے اپنے گھر کا راستہ بھی نہیں آتا۔"

سکھ رکشہ ڈرائیور گرتے سے اپنے منہ پر آیا ہوا پسینہ پونچھتے ہوئے بولا "میں پھر بھی یہی تمھیں یہی کہوں گا کہ جہاں تمہارا آدمی تمھیں بٹھا گیا ہے وہیں اس کا انتظار کرو۔"

نجمی اس دوران اردگرد کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ وہاں اس وقت کوئی پولیس والا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سکھ کی طرف دیکھ کر عاجزی سے کہا "سردار جی! میرے پیٹ میں کچھ درد بھی ہو رہا ہے آپ مجھے اپنے گھر لے چلیں پھر میں واپس اسی جگہ آجاؤں گی۔"

"چلو دھی رانی! میرے گھر چلو وہاں میری پتنی تمھیں چورن کھلا کر درد ٹھیک کر دے گی۔"

اور سکھ رکشہ ڈرائیور نجمی کو لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا گھر دیر کا جانے والی سڑک پر سے ہٹ کر ایک ٹیبے کے پاس تھا۔ وہاں دس بارہ ایک منزلہ بوسیدہ کوارٹر سے بنے ہوئے تھے۔ سکھ رکشہ والے کی دھرم پتنی نجمی کو اندر لے گئی۔ نجمی باتھ روم میں گئی وہاں منہ ہاتھ بھی دھویا سکھ کی بیوی نے نجمی کو چورن کھلایا "میرا سر بھی چکر کھا رہا ہے۔"

سکھ کی بیوی نے نجمی کو چارپائی پر لٹا دیا اور اس کا سر دبانے لگی۔ نجمی نے اس کا ہاتھ روک دیا اور بولی "بہن جی! آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ سر درد اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ صرف میرے لیے چائے بنا دیں۔"

سکھ رکشہ ڈرائیور باہر صحن میں بیٹھا تھا۔ اس کی بیوی نے فوراً چائے بنا کر نجمی کو پیش کی۔ نجمی نے انھیں اپنا نام جیت کور عرف جیتی بتایا اور کہا کہ اس کی شادی کو چار سال ہو گئے ہیں مگر اولاد نہیں ہوئی۔

سکھ ڈرائیور نے باہر سے آواز دی "دھی رانی چلو تمھیں باغ میں لیے چلتا ہوں ہو سکتا ہے تمھارا آدمی وہاں آ گیا ہو اور پریشان ہو؟"

نجمی وہاں ہرگز نہیں جانا چاہتی تھی اب اس نے ایک اور ڈرامہ کیا اور چہرے پہ پلو ڈال کر رونے لگی۔ سکھ اور اس کی بیوی بے چارے گھبرا گئے۔ نجمی نے روتے ہوئے کہا "کیا بتاؤں سردار جی! اصل بات یہ ہے کہ میرا خاوند مجھ سے لڑ جھگڑ کر چلا گیا ہے۔ وہ اب واپس نہیں آئے گا۔"

یوں نجمی نے وہاں ایک جھوٹ موٹ کا قصہ گھڑ کر انھیں سنا دیا۔ دونوں میاں بیوی نجمی کو سمجھانے لگے کہ خاوند سے لڑائی جھگڑا تو ہوتا ہی رہتا ہے مگر تمھیں واپس اپنے خاوند کے پاس ہی جانا چاہیئے۔ سکھ بولا "میں تمھیں خود تمھاری سسرال اکال گڑھ چھوڑ آؤں گا۔ لیکن یہ گاؤں ہے کہاں؟ ضلع امرتسر میں تو میں نے آج تک اس نام کا کوئی گاؤں نہیں سنا۔"

نجمی نے چادر کے پلو سے جھوٹ موٹ کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "یہاں سے لاری جاتی ہے مجھے خود راستے کا پتہ نہیں ہے۔ ہم دن کو چل کر دوپہر سے کچھ پہلے امرتسر پہنچے تھے۔ راستے میں بجلی والی نہر بھی آئی تھی۔"

سکھ بے چارا پریشان ہو گیا تھا کہنے لگا "دھی رانی! اب تو شام ہو رہی ہے ایسا کرتے ہیں کہ تم رات یہیں آرام کرو۔ صبح میں پہلی لاری میں تمھارے گاؤں کا پتہ کر کے وہاں چھوڑ آؤں گا۔ دھیاں اپنے سسرال میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ وہی ان کا گھر ہوتا ہے۔"

نجمی کو یہی چاہیئے تھا۔ اسے سوچنے اور کوئی نیا منصوبہ بنانے کے لیے یوں کافی وقت مل جاتا تھا۔ آنسو پونچھ کر بولی "جیسی آپ کی مرضی! آپ میرے پتا سمان ہیں۔"

یہ ساری گفتگو پنجابی میں ہوتی رہی تھی۔ رات کو کھانا کھا کر نجمی چارپائی پر لیٹ گئی سکھ اور اس کی بیوی تو باہر چھپر کے نیچے سوئے اور نجمی کی چارپائی انھوں نے کوٹھڑی میں ڈال دی۔ ستمبر کی راتیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔ نجمی بستر پر لیٹ کر سوچنے لگی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیئے۔ اس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پاس صرف یہی ایک رات تھی۔ دوسرے دن اسے وہاں سے نکل جانا تھا۔ گرجن سنگھ اور اس کے جیٹھ رُوڈ والے دوست کرپال سنگھ کے پاس وہ واپس نہیں جانا چاہتی تھی۔ اسے خطرہ تھا کہ کہیں یہ دونوں سکھ پاکستانی جاسوس ہونے کی وجہ سے قومی جذبات میں آ کر پولیس کے حوالے نہ کر دیں۔ ویسے بھی اب نجمی کو گرجن سنگھ کے پاس واپس جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ اب وہ اسے سکھوں کے جتھے کے ساتھ پاکستان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ کوٹھڑی میں بجلی کا کمزور سا بلب روشن تھا۔ نجمی نے بلب بجھا دیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ سونے سے پہلے نجمی نے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ تیار کر لیا تھا۔

صبح صبح سکھ رکشہ ڈرائیور کی دھرم پتنی نے نجمی کو جگایا "دھی رانی لاری سویرے سویرے جاتی ہے اٹھو واہے گرو کا نام جپو۔"

نجمی لاری اڈے کبھی نہیں جا سکتی تھی ابھی دن کی روشنی پوری طرح سے نہیں پھیلی تھی۔ نجمی نے سکھ رکشہ والے سے کہا "تایا جی! آپ مجھے اپنے رکشہ پر بٹھا کر جو سڑک پٹھانکوٹ کو جاتی ہے اس کے ذرا آگے کر کے چھوڑ آؤ۔ وہاں سے ایک کچا راستہ میرے گاؤں کو جاتا ہے۔ اتنا مجھے یاد ہے آگے کوئی یکہ لے کر میں چلی جاؤں گی۔"

سکھ رکشہ ڈرائیور نے کافی اصرار کیا کہ وہ اسے خود لاری پر بٹھا کر سسرال چھوڑ آتا ہوں مگر نجمی نے کہا "میں خود ہی چلی جاؤں گی تایا جی! بس تم مجھے پٹھان کوٹ جانے والی سڑک پر کچے راستے تک چھوڑ آؤ۔"

سکھ رکشہ ڈرائیور نے نجمی کو رکشے پر بٹھایا اور صبح کی پھیکی پھیکی روشنی میں پٹھان کوٹ جانے والی سڑک پر آ گیا۔ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ نجمی کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ سڑک پر کچھ آگے جا کر پٹھان کوٹ جانے والی لاری پکڑ لے گی اور اس طرح سے لاری اڈے پر پولیس کی چیکنگ سے بچ جائے گی۔ رکشہ پکی سڑک پر چلا جا رہا تھا جب رکشہ دو چار میل آگے نکل گیا تو بائیں جانب کھیتوں میں ایک کچے راستے کو نکلتے دیکھ کر نجمی نے رکشہ رکوا لیا "بس تایا جی! یہی راستہ میرے گاؤں کو جاتا ہے میں نے پہچان لیا ہے۔"

پھر نجمی نے رکشے سے اتر کر سکھ رکشہ ڈرائیور کے پاؤں چھوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔ سکھ رکشہ

والے کا سانس پھولا ہوا تھا اس نے نجمی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے شفقت سے کہا۔

"دھی رانی ہم غریب لوگ ہیں۔ تمہاری خدمت نہیں کر سکے قصور ہو گیا ہو تو معاف کر دینا۔"

نجمی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ آنسو سچے تھے۔ جس طرح اس سکھ رکشہ ڈرائیور کا جذبہ سچا تھا۔ نجمی کو اپنا باپ یاد آ گیا وہ جلدی سے اس جذباتی کیفیت سے باہر نکل آئی کیونکہ یہ جذبات کا وقت نہیں تھا اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا "ست سری اکال۔"

"ست سری اکال دھی رانی!" سکھ بوڑھا عاجزی سے بولا۔

نجمی کھیتوں میں چل پڑی۔ آگے اونچی فصل تھی۔ وہ فصل کی اوٹ میں ہو کر پیچھے دیکھنے لگی ٹاہلیوں میں گھری ہوئی پکی سڑک پر نیک دل ادھیڑ عمر سکھ کا رکشہ کافی دور چلا گیا تھا جب یہ رکشہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو نجمی کھیتوں کا چکر کاٹ کر پکی سڑک پر آگے جا کر نکل آئی وہ ٹاہلی کے ایک درخت کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے کرتے کی جیب میں سے رومال نکال کر کھولا اس کے پاس اڑھائی سو کے قریب رقم تھی۔ اس میں سے بیس روپے نکال کر اس نے الگ رکھ لیے اور رومال جیب میں سنبھال کر رکھ لیا اس کی نظریں امرتسر لاری اڈے سے آتی سڑک پر لگی تھیں۔ دو ایک بجری سے بھرے ٹرک گزرے تھے۔ لاری ابھی تک کوئی نہیں گزری تھی۔

دن کی روشنی کافی ہو گئی تھی۔ سورج کھیتوں میں سونا بکھیر رہا تھا۔ آخر ستمبر کی صبح خشک تھی۔ دور سے ایک لاری آتی دیکھ کر نجمی اٹھ کر سڑک کے کنارے آ گئی۔ اس نے سر کو چادر سے اچھی طرح ڈھانپ لیا تھا۔ لاری ابھی دور ہی تھی کہ نجمی نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ لاری قریب آ کر رک گئی۔ کلینر نے پچھلے دروازے سے آواز دی "بٹالہ گورداسپور پٹھان کوٹ۔ کتھے جانا اے بی بی؟"

نجمی نے کوئی جواب نہ دیا اور لاری میں بیٹھ گئی۔ پھر اس نے بیس روپے کلینر کی طرف بڑھا دیئے اور کہا "پٹھان کوٹ جانا اے ویرا۔"

لاری سواریوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی کچھ سواریاں بٹالے اتر گئیں۔ یہاں سے مزید سواریاں چڑھ گئیں۔ نجمی چادر سے جسم لپیٹے لاری میں ہی کھڑکی کے پاس بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھیں باہر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لاری اڈے کا برابر جائزہ لے رہی تھیں۔ پولیس کے دو ایک سپاہی اسے نظر آئے مگر وہ لاری کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ بٹالہ سے لاری چلی تو گورداسپور پہنچ کر رکی۔ یہاں بھی خیریت ہی رہی پھر پٹھان کوٹ آگیا۔ لاری اپنے اڈے میں جا کر رک گئی۔ یہ وہ لاری اڈہ نہیں تھا جہاں سے نجمی پہلی بار بادل کے ساتھ جموں کی طرف روانہ ہوئی تھی۔ یہاں سے نجمی کو جموں جانا تھا۔ اڈے میں ہی عورتوں کا ایک بوسیدہ سا ویٹنگ روم بنا ہوا تھا۔ نجمی نے معلوم کیا۔ جموں لاری شام سے ذرا پہلے چلتی تھی۔ نجمی نے ٹکٹ لے کر اپنے پاس رکھ لیا۔ ایک ڈوگرہ عورت بھی ویٹنگ روم میں اپنے بچے کو گودی میں لیے بیٹھی تھی۔ اس نے نجمی سے باتیں شروع کر دیں۔

"بہناں تم کہاں جا رہی ہو؟"

نجمی کو جموں کے محلہ استاداں کا نام یاد تھا۔ اس نے کہا "محلہ استاداں میں میری ایک بہن رہتی ہے اس کے پاس جا رہی ہوں۔"

ڈوگرہ عورت نے پوچھا "کیا تم مسلمان ہو؟ مگر تم نے تو کرپان رکھی ہوئی ہے۔"

اب نجمی کو یاد آیا کہ محلہ استاداں میں زیادہ آبادی مسلمانوں کی ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا "میں سنگھنی ہوں۔ محلہ استاداں میں سکھ بھی تو رہتے ہیں۔"

"ہاں کچھ مکان سرداروں کے ہیں۔" وہ عورت بولی۔

نجمی نے وہیں سے باہر روٹی اور دال منگوا کر اس ڈوگرہ عورت کے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ خدا خدا کر کے چار بجے اور جموں جانے والی لاری اڈے پر آ کر لگ گئی۔ نجمی اور ڈوگرہ عورت لاری میں آ کر بیٹھ گئیں۔ ساڑھے چار بجے لاری وایا کٹھوعہ جموں کی طرف روانہ ہو گئی۔ راستے میں ہی شام ہو گئی۔ نجمی جموں پہنچی تو رات ہو چکی تھی۔ نجمی کو بادل کے دوست اور رازدار لال دین کے گھر کا پتہ یاد تھا اس نے لال دین کے مکان واقع محلہ استاداں جانے کا ہی سوچ رکھا تھا۔ اڈے میں ہی نجمی نے رکشا کروا لیا اور محلہ استاداں کی طرف روانہ ہو گئی۔ اسے جموں سے نکلے کافی وقت گزر چکا تھا اور نجمی کو یقین تھا کہ اب لال دین کے مکان کی نگرانی نہیں ہو رہی ہو گی۔ رکشے والے نے اسے محلہ استاداں کے باہر سڑک پر اتار دیا۔ نجمی نے اس جگہ کو پہچان لیا تھا۔ وہ چادر لپیٹے، سر جھکائے خاموشی سے گلی میں داخل ہو گئی۔ یہ

گلیاں اسے یاد تھیں۔ وہ مکانوں کو پہچانتی آخر لال دین کے مکان کے باہر جا کر رک گئی۔ مکان کی دوسری منزل میں روشنی ہو رہی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ گلی میں دوسرا کوئی نہیں تھا۔ نجمی نے آہستہ سے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ دو تین بار کنڈی کھڑکانے پر اوپر کی کھڑکی کھلی اور لال دین نے نیچے جھانک کر پوچھا "کون ہے بھئی؟"

نجمی نے کوئی جواب نہ دیا صرف چہرہ اوپر اٹھا کر لال دین کی طرف دیکھا اس نے لال دین کو پہچان لیا تھا۔ لال دین نے ابھی تک نجمی کو نہیں پہچانا تھا وہ کھڑکی بند کر کے سیڑھیاں اتر کر نیچے آگیا۔ دروازہ کھول کر متجسسانہ نظروں سے نجمی کی طرف دیکھ کر پوچھا "کس سے ملنا ہے بہن جی؟"

نجمی نے چادر پوری طرح سے چہرے پر سے ہٹالی تھی "میں ہوں کیا جی!"

اب لال دین نے بھی نجمی کو پہچان لیا تھا۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا "اندر آجاؤ۔"

نجمی تیزی سے مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہو گئی۔ لال دین نجمی کو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا وہ اسے اوپر والی بیٹھک میں لے گیا۔ جاتے ہی اس نے نجمی سے کہا "ندیم لاہور سے واپس آگیا ہے۔"

نجمی کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا "آپ نے کیا کہا؟" اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

لال دین نے کھڑکی کے آگے پردہ گرا دیا اور چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا "تمھیں کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

نجمی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ندیم.... ندیم کے بارے میں کیا کہا تھا آپ نے؟"

لال دین بولا "وہ تمھاری تلاش میں بارڈر کراس کر کے ہندوستان پہنچ گیا ہے۔ کہتا تھا نجمی نہیں آئی تو میں گھبرا کر یہاں آگیا ہوں۔"

نجمی نے اپنا سر تھام لیا "ندیم کیوں واپس آگیا؟ نہیں نہیں۔ وہ واپس نہیں آسکتا۔ وہ ایسی حماقت نہیں کر سکتا۔" اس نے سر اٹھا کر لال دین کی طرف دیکھا "کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟"

لال دین بولا "بالکل سچ کہہ رہا ہوں ابھی چار روز پہلے وہ اسی جگہ جہاں تم بیٹھی ہو بیٹھا مجھ سے تمھارے بارے میں پوچھ رہا تھا جب میں نے اسے بتایا کہ تم کو بردہ فروش اغوا کر کے لے گئے ہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی طرف لے گئے ہیں تو وہ پریشان ہو گیا بولا میں دلی جاؤں گا۔ اس بار میں اسے اپنے ساتھ بارڈر کراس کراؤں گا۔ میں نے سخت غلطی کی جو نجمی کے بغیر بارڈر کراس کر کے چلا گیا۔“

نجمی کا چہرہ اتر گیا تھا۔ ندیم اس کی مصیبتوں اور مشکلوں میں اضافہ کرنے آ گیا تھا۔ جس جہنم سے نجمی نے اسے ہزار کوششوں سے نکال کر جنت کی طرف بھیجا تھا وہ اسی جہنم میں ایک بار پھر آ گیا تھا۔ نجمی کا جی چاہا کہ ندیم اس کے سامنے آ جائے اور وہ تھپڑ مار مار کر اس کا منہ لال کر دے۔ لال دین کہہ رہا تھا ”تم کہاں سے آ رہی ہو؟ تمہارے ساتھ کیا گزری لیکن یہ باتیں آرام سے بیٹھ کر ہوں گی پہلے یہ بتاؤ کہ تم جہاں سے بھی آ رہی ہو تمہارے پیچھے پولیس تو نہیں لگی تھی؟“

نجمی نے پوچھا ”کیا تمہاری نگرانی ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔؟“

لال دین نے کہا ”میری نگرانی تو بڑی مشکل سے ختم ہوئی ہے لیکن تمہارے پیچھے لگی ہوئی پولیس پھر سے مجھے گرفتار کروا سکتی ہے۔“

نجمی کو لال دین پر غصہ بھی آیا کہ عجیب شخص ہے کبھی بڑا بہادر بنتا تھا اور اب کسی چوہے کی طرح گھبرا رہا ہے۔ اس نے سینے پر ہاتھ مار کر جذباتی لہجے میں کہا ”چچا! اگر تمہیں کوئی پکڑنے آئے گا تو اسے میری لاش پر سے گزرنا ہو گا۔“

لال دین نے نجمی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”بیٹی! یہ معاملہ جذبات کا نہیں ہے۔ یہاں آنکھیں کھول کر اور دل کو ٹھنڈا رکھ کر سوچنا پڑتا ہے۔ جموں کشمیر میں مسلمانوں کو پہلے ہی پاکستان کا جاسوس سمجھا جاتا ہے اگر ہم پر پولیس کو ذرا سا بھی شک پڑ جائے تو پھر ہماری خیر نہیں اس سے پہلے بھی میں بڑی سزا بھگت چکا ہوں۔“

تب نجمی نے کہا ”چچا! میں تمہارے پاس نہیں ٹھہروں گی۔ میں تمہارے لیے کسی نئی مصیبت کا باعث نہیں بنوں گی تم صرف یہ بتا دو کہ بادل کس حال میں ہے؟ کیا اس کو سزا ہو گئی؟“

لال دین کہنے لگا ”بادل کا کیس ابھی تک چل رہا ہے لیکن چونکہ پولیس تمہیں پاکستانی جاسوس بھی سمجھتی ہے اس لیے بادل پر بھی یہی الزام لگا دیا گیا ہے۔ وہ پاکستانی جاسوسوں کے ساتھ ملا ہوا ہے اور ہندوستان میں انہیں اپنے ہاں پناہ دیتا ہے اسی وجہ سے پولیس نے اس کا کیس

گول کر دیا ہے اور اسے امرتسر جیل میں بند کر دیا گیا ہے جہاں اس سے صرف پاکستانی جاسوسوں کے بارے میں اور تمہارے بارے میں پوچھ گچھ ہوتی ہے۔“

نجمی نے دانت پیستے ہوئے کہا ”یہاں کی پولیس تو ہر مسلمان کو پاکستانی جاسوس سمجھتی ہے۔“

لال دین بولا ”حالات ہی ایسے ہو گئے ہیں پولیس کو مجھ پر بھی شبہ تھا مگر میں نے بڑی مشکل سے اپنا کیس کلیئر کروا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ تم زیادہ دیر یہاں ٹھہرو میرے ساتھ تم بھی پکڑی جاؤ گی۔“

نجمی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کے ذہن کا ایک حصہ مسلسل ندیم کے بارے میں فکرمند تھا کہ وہ پاکستان کی جنت چھوڑ کر اس ملک کے جہنم میں کیوں واپس آ گیا؟ یہ حماقت اس نے کیوں کی؟ اب وہ کیسے وطن واپس جائے گا۔ کہنے لگی ”چچا! ندیم نے کچھ بتایا تھا کہ وہ دلی کہاں ٹھہرے گا۔؟“

لال دین بولا ”اس بارے میں اس نے یقین سے کچھ نہیں بتایا۔ کہہ رہا تھا ہو سکتا ہے مجھے نجمی کی تلاش میں ایک بار پھر کلکتہ جانا پڑے۔“

نجمی کو ایک لمحے کے لیے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے سامنے اندھیرے کی بھاری چادر گرا دی ہے اور اس کے تمام راستے بند ہو گئے ہیں۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ شبانہ اور ندیم کو پاکستان بھیج کر نجمی کا سب سے بڑا بوجھ اس کے سر سے اتر گیا تھا لیکن ندیم کے واپس ہندوستان آ جانے سے اسے محسوس ہونے لگا کہ ناقابل برداشت بوجھ تلے اس کے کندھے جھکے جا رہے تھے ایک بار تو اس کے دل میں خیال آیا کہ جہنم میں جائے ندیم اور ندیم کی محبت۔ کیوں نہ ایک بار پھر وہ رائفل اٹھا لے اور جو سامنے آئے اسے بھونتی چلی جائے۔

لال دین نے پردہ ذرا سے ہٹایا اور کھڑکی تھوڑی سی کھول کر نیچے گلی میں جھانکا۔ پھر جلدی سے کھڑکی کا پٹ بند کر دیا۔ نجمی نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا ”چچا! میں تمہیں کسی نئی مصیبت میں نہیں پھنسانا چاہتی۔ میں جا رہی ہوں۔“

”کہاں؟ کہاں جاؤ گی تم؟“ لال دین نے بے اختیار پوچھا۔

نجمی طنزیہ انداز میں مسکرائی اور بولی ”میں ڈاکو ہوں اور ڈاکوؤں کو زمین جگہ دے دیتی ہے“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لال دین نے نجمی کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا " تم میرے جگری یار کی بھابھی ہو اور مجھ سے اتنی چھوٹی ہو کہ میں تمھیں اپنی بیٹی بھی کہہ سکتا ہوں اگر ضرورت سے زیادہ محتاط ہوں تو تم مجھے معاف کر دو۔ ہم جموں کشمیر کے مسلمانوں کی یہاں کچھ مجبوریاں ہیں۔ ہمیں یہاں زندہ رہنا ہے عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہنا ہے اس کے لیے ہمیں بڑی چیزوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ بہر حال اس وقت تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ میں تمھارے لیے روٹی ڈال کر لاتا ہوں رات کو تم یہیں آرام کرو منہ اندھیرے میں تمھیں ایک محفوظ مقام پر پہنچا دوں گا۔ "

لال دین باورچی خانے میں گیا اور روٹی اور ساگ ڈال کر لے آیا۔ نجمی کو بھوک لگ رہی تھی۔ روٹی کھانے کے بعد وہ وہیں چارپائی پر لیٹ گئی۔ لال دین نیچے بیٹھک میں جا چکا تھا۔ نجمی کو بادل کی پریشانی تو لگی ہی تھی۔ اب ندیم کی فکر بھی پڑ گئی تھی۔ بادل کو جیل سے نکالنا نجمی کا اخلاقی فرض تھا۔ بادل نے نجمی کے لیے کئی بار اپنی زندگی موت کے منہ میں ڈالی تھی اور اب صرف اسی کی وجہ سے امرتسر کی جیل میں پولیس کی سختیاں اور المناک تشدد سہہ رہا تھا۔ دوسری طرف ندیم بھی کسی وقت پولیس کے ہتھے چڑھ سکتا تھا۔ نجمی اس سے محبت کرتی تھی۔ وہ اس کی تکلیف بھی کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ یہی سوچتے سوچتے اسے نیند آ گئی۔

رات کا پچھلا پہر تھا کہ لال دین نے دروازے پر دستک دی۔ دو چار بار دستک دینے کے بعد لال دین نے نجمی کو آواز دی۔ نجمی کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں اندھیرا تھا وہ کچھ نہ سمجھ سکی کہ وہ کہاں پر ہے اور یہ آواز کس کی تھی۔ جب لال دین نے دوسری بار اپنا نام لے کر آواز دی۔ تو نجمی نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ چادر لپیٹ کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ لال دین نے اندر آتے ہی کہا " نجمی بیٹی میرے ساتھ چلو۔ "

نجمی کو معلوم تھا کہ وہ اسے کسی محفوظ جگہ لے جانا چاہتا ہے۔ اس نے آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا " چچا ہمیں کہاں جانا ہو گا؟ شاہ جی تو آم کے باغ میں نہیں ہوں گے۔ "

نجمی جوتی تلاش کرنے لگی۔ لال دین بولا " شاہ جی یہاں نہیں ہیں لیکن میں تمھیں اس بار یہاں سے قریب ہی ایک گاؤں ہے۔ وہاں ایک قابل اعتبار عورت کے پاس لے جا رہا ہوں۔ "

یہ قابل اعتبار عورت جموں شہر سے اوپر شمال کی جانب ایک چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں اکیلی

رہتی تھی۔ اس کا نام شاداں تھا عمر چالیس کے قریب تھی کسی زمانے میں لال دین سے بیاہ کرنا چاہتی تھی۔ ایسا نہ کر سکی اس کی شادی ایک شریف گوجر سے ہو گئی وہ اسے بے اولاد چھوڑ کر مر گیا تھا۔ شاداں بیوہ تھی اور ایک زمیندار کے ہاں کام کاج کر کے اپنا پیٹ پالتی تھی لال دین نے نجمی کو شاداں کے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا دیا اور آخر میں کہا۔ " وہ صرف ایک ہی ایسی عورت ہے جس پر میں آنکھ بند کر کے بھروسہ کر سکتا ہوں اور پھر تمھیں دو ایک روز ہی اس کے پاس ٹھہرنا ہو گا اس کے بعد میں تمھارا کوئی بندوبست کر دوں گا۔ "

نجمی اس کے ساتھ رات کے پچھلے پہر کے اندھیرے میں جموں کی گلیوں سے نکل کر دریا کی طرف جا رہی تھی۔ یہاں ایک باڑے میں کچھ گائے بھینس بندھی تھیں۔ کونے میں ایک موٹر رکشہ بھی تھا۔ لال دین نے نجمی کو اندھیرے میں ایک طرف ٹھہرنے کو کہا اور خود باڑے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو اس کے پاس موٹر رکشہ کی چابی تھی۔ اس نے نجمی کو رکشے میں بٹھایا اور رکشہ نکال کر ایک سڑک پر روانہ ہو گیا۔ دریا انھوں نے دوسرے پل سے پار کیا۔ اب وہ کشمیر جانے والی سڑک پر جا رہے تھے۔ آسمان پر مشرق کی جانب پہاڑیوں کی چوٹی کے اوپر صبح کاذب کی نیلی روشنی کی لکیر نمودار ہو گئی تھی۔ ہوا کافی ٹھنڈی تھی۔ رکشہ کشمیر کو جاتی سڑک پر سے ایک چھوٹی اور کچی سڑک پر بائیں جانب اتر گیا۔ یہاں دونوں جانب اونچے نیچے میدان تھے جن کے پیچھے پہاڑ ابھر ہوئے تھے۔ دور کسی گاؤں کی روشنیاں نظر آنے لگیں تو لال دین نے رکشے کی رفتار دھیمی کر دی۔ پھر ایک طرف درختوں میں رکشہ روک دیا۔ نجمی نے باہر نکل کر دیکھا۔ چند قدموں کے فاصلے پر چند ایک دیہاتی مکان اندھیرے اور صبح کاذب کے نیم اجالے میں ڈوبتے ابھرتے نظر آ رہے تھے۔ ان مکانوں سے الگ ہٹ کر کسی درخت کے پاس ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کے صحن میں بھینس بندھی ہوئی تھی۔ لال دین نے کوٹھری پر دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ اندر لالٹین روشن تھی۔ ایک عورت آنکھیں ملتی ہوئی باہر نکلی۔

" کون ہے؟ "

لال دین نے کہا " میں ہوں۔ "

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب رات کو نجمی سو گئی تھی تو لال دین اس عورت کے پاس آ کر نجمی کے بارے میں سب کچھ بتا گیا تھا۔ یہ شاداں تھی۔

"اندر آ جاؤ۔"

لال دین اور اس کے پیچھے پیچھے نجمی کوٹھڑی میں داخل ہو گئی۔ کوٹھڑی میں چنبیلی کے تیل کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں نجمی نے شاداں کو اور شاداں نے نجمی کو دیکھا۔

شاداں نے نجمی کو اپنے گلے لگا لیا اور بولی "یہ تو بڑی پیاری سی ہے لال!"

لال دین نے نجمی سے کہا "بیٹی! یہاں تمھیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی میں کل نہیں تو پرسوں تمھیں یہاں سے لے جاؤں گا۔"

شاداں بولی "اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں اس کی حفاظت کر سکتی ہوں لال!"

لال دین نے کہا "ایسی بات نہیں ہے شاداں! مگر نجمی کو ایک ضروری کام سے یہاں سے آگے بھی جانا ہے۔ اچھا اب میں جاتا ہوں۔ دن نکلنے سے پہلے پہلے مجھے جموں پہنچ کر اپنے دوست کو رکشہ واپس کرنا ہے۔"

لال دین چلا گیا شاداں نے نجمی کے سر پر پیار کیا تو نجمی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی تابوت میں بند کر دی گئی ہے۔

--- ٭ ---

دن بھر نجمی شاداں کی کوٹھڑی میں بند رہی۔

شاداں نے اس کی بڑی خاطر داری کی مگر نجمی کو دن کے وقت باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی شام کو شاداں اسے گھمانے ایک گھاٹی میں لے گئی۔ رات کو لال دین آ گیا آتے ہی کہنے لگا۔

"بیٹی نجمی! اب تمھارا جو پروگرام ہے وہ بتاؤ کیونکہ یہاں تمھارا زیادہ رہنا مناسب نہیں جموں کی سی آئی ڈی بہت خطرناک ہے۔ اگر اس کو ذرا سا بھی سراغ مل گیا تو تمھارا یہاں سے نکلنا ناممکن ہو جائے گا۔"

نجمی خود بھی اس بند کوٹھڑی میں نہیں رہ سکتی تھی اسے جنگلوں میں آزادانہ زندگی بسر کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔ ویسے بھی جموں میں اب اس کا ٹھہرے رہنا بیکار تھا۔ ندیم وہاں نہیں تھا اور بادل کو پولیس نے امرتسر جیل میں قید کر رکھا تھا۔ ندیم پر نجمی کو سخت غصہ آ رہا تھا۔ اسے کسی حالت میں بھی واپس نہیں آنا چاہیئے تھا اور پھر اس کا کچھ پتہ بھی نہیں تھا کہ وہ کہاں دربدری کرتا پھر رہا ہے۔ نجمی پر بادل کا قرض تھا۔ وہ سب سے پہلے اپنے اس جاں نثار ساتھی کو ہندوستانی پولیس کے تشدد سے نجات دلانا چاہتی تھی جو اس کی وجہ سے اتنی تکلیفیں جھیل رہا تھا۔ اس نے لال دین سے کہا۔

"میں خود بھی یہاں نہیں رہنا چاہتی کیونکہ یہاں رہ کر میں سوائے وقت ضائع کرنے کے اور کیا کروں گی۔"

لال دین نے پوچھا "تو پھر تم کہاں جاؤ گی۔"

نجمی چارپائی پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ کوٹھڑی میں لالٹین جل رہی تھی شاداں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باہر چولہے پر روٹیاں پکا رہی تھی۔ نجمی نے کہا۔

"میں امرتسر جا کر سب سے پہلے بادل کو جیل سے نکالنے کا کوئی انتظام کرنا چاہتی ہوں۔"

لال دین چپ ہو گیا پھر کہنے لگا "یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہی ہو بیٹی امرتسر کی جیل پنجاب میں سب سے زیادہ سخت اور مضبوط جیل ہے۔ یہاں بڑے خطرناک قیدی رکھے جاتے ہیں اور اتنا سخت حفاظتی انتظام ہے کہ چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔"

نجمی نے لال دین کے ادھیڑ عمر چہرے کی طرف گھورتے ہوئے کہا "میں چڑیا نہیں ہوں میں بادل کو وہاں سے ضرور نکالوں گی۔"

لال دین گردن کو ایک طرف جھٹکا کر بولا "میں تمہیں یہ مشورہ نہیں دوں گا کیونکہ مجھے یقین ہے اگر تم نے کوئی ایسا قدم اٹھایا تو مشکل میں پھنس جاؤ گی۔ امرتسر پولیس ویسے بھی تمہاری تلاش میں ہے۔ تم پہ پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام بھی ہے اور یہ وہ جرم ہے کہ انڈین پولیس ایسے شخص کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دے تو اسے پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔"

نجمی نے جھنجھلا کر کہا "آپ کی باتیں میرا حوصلہ کم نہیں کر سکتیں۔ میں آج صبح امرتسر جا رہی ہوں"

لال دین خود بھی یہی چاہتا تھا کہ نجمی جتنی جلدی ہو سکے وہاں سے چلی جائے اس کی وجہ سے وہ خود کسی مصیبت میں گرفتار ہو سکتا تھا کہنے لگا۔

"جیسے تمہاری مرضی منہ اندھیرے چار بجے ایک گاڑی امرتسر جاتی ہے۔ تمہیں کچھ پیسوں کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے لو۔"

نجمی نے کہا "مجھے پیسوں کی نہیں کچھ دوسری چیزوں کی ضرورت ہے، وہ مجھے اگر آج رات لا دو تو میں صبح یہاں سے نکل جاؤں گی۔"

"کونسی چیزیں؟" لال دین نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

نجمی چارپائی پر سنبھل کر بیٹھ گئی جب اس نے لال دین کو مطلوبہ دو چار چیزیں بتلائیں تو وہ اس کا منہ تکنے لگا "کیا تم ....؟" نجمی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "ہاں جو تم سمجھتے ہو میں وہی کرنے والی ہوں لیکن میں چاہتی ہوں کہ یہ ساری چیزیں مجھے مل جانی چاہئیں۔"

اس وقت رات کے نو بج رہے تھے جموں کے کچھ بازار ابھی تک کھلے تھے۔ لال دین بہت جلدی واپس آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ شاداں باہر روٹیاں پکا رہی تھی۔ نجمی کے منصوبے کا اسے ابھی تک کچھ علم نہیں تھا۔ دو گھنٹے بعد لال دین واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا بھی تھا۔ نجمی اور شاداں کوٹھڑی میں ہی بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ لال دین نے تھیلے میں سے چیزیں نکال کر نجمی کے سامنے رکھ دیں۔ شاداں نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ گیروی ساڑھی اور سادھوؤں ایسی مالائیں کس لیے لائے ہو لال؟"

لال دین نے نجمی کی طرف اشارہ کیا اور بولا "نجمی کے لیے لایا ہوں یہ جوگن بن کر امرتسر جائے گی۔"

شاداں اب نجمی کا منہ تکنے لگی۔ نجمی نے لال دین سے پوچھا "قینچی اور استرا لائے ہو؟"

لال دین نے یہ دو چیزیں بھی تھیلے میں سے نکال کر سامنے رکھ دیں۔ شاداں کو نجمی کے بال بڑے پسند تھے وہ اسے منع کرتی رہی مگر نجمی نے کسی قدر ڈانٹ کر کہا کہ وہ اس کے معاملے میں دخل نہ دے۔ شاداں چپ ہو کر بیٹھ گئی۔

لال دین نے قینچی سے نجمی کے سارے بال کاٹ دیئے۔ پھر پانی منگوا کر اس کے سر کو گیلا کیا اور استرے سے اس کا سر مونڈ ڈالا۔ اس کے بعد نجمی نے گیروے رنگ کی ساڑھی پہن لی کاندھے پر گیروے رنگ کی چادر رکھی اور ماتھے پر زعفران بھگو کر تلک لگا لیا۔ شیشے میں اپنی شکل دیکھی تو ایک لمحے کے لیے وہ خود بھی اپنے آپ کو نہ پہچان سکی۔ لال دین کہنے لگا "تمہاری شکل کافی بدل گئی ہے لیکن پھر بھی تمہیں امرتسر پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے بڑی احتیاط سے کام لینا ہو گا۔"

نجمی نے چادر کاندھے سے اتار کر چارپائی کے سرہانے رکھ دی اور بولی "یہ گُر مجھے خوب آتا ہے۔ تم فکر نہ کرو اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ ٹرین کا صحیح وقت کیا ہے۔"

لال دین نے کہا کہ گاڑی جموں توی اسٹیشن سے ہی تیار ہوتی ہے اور صبح سوا چار بجے منہ اندھیرے نکل جاتی ہے۔ نجمی کے پاس کچھ نوٹ تھے وہ اس نے کپڑے میں لپیٹ کر اپنی کمر کے ساتھ باندھ لیے۔ لال دین جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اچھا بیٹی اب میں چلتا ہوں۔ میں خدا سے دعا کروں گا کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ"
پھر پلٹ کر دبی زبان میں کہنے لگا "مجھے یقین ہے کہ اگر ایسی ویسی بات ہو گئی تو تم میرا نام....."
نجمی نے بات کاٹ کر کہا "تمھارا نام میری زبان پر کبھی نہیں آئے گا چاچا! اس شبہے کو ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دو۔"

لال دین خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد شاداں کہنے لگی "بہن! تم تو بالکل جوگن بن گئی ہو۔ ایک نظر دیکھنے سے تو میں بھی تمھیں نہیں پہچان سکتی۔"

نجمی نے چارپائی پر لیٹتے ہوئے شاداں سے پوچھا کہ صبح صبح یہاں سے کوئی سواری مل جائے گی۔ شاداں نے کہا "رکشے تو صبح صبح ہی چلتے ہیں۔ تم کہو گی تو میں تمھیں جا کر رکشا لا دوں گی سڑک پاس ہی تو ہے۔"

نجمی نے کہا "نہیں تمھارا شکریہ۔ اس کی ضرورت نہیں۔ میں خود رکشہ لے لوں گی تم صرف ایک کام کرنا کہ صبح اذان کے وقت سے کچھ پہلے مجھے جگا دینا کیا ایسا ممکن ہے؟"
شاداں نے کہا "میں اذان سے آدھ گھنٹہ پہلے اٹھ کر بھینس کا دودھ دھوتی ہوں۔ میں تمھیں اسی وقت جگا دوں گی۔"

اس کے بعد نجمی نے لالٹین بجھا دی اور چارپائی پر لیٹ گئی۔ بادل کو جیل سے نکالنے کا اس نے تہیہ کر رکھا تھا۔ جوگن کا بھیس بدلنے سے اسے ایک آسانی ہو گئی تھی کہ وہ امرتسر شہر میں کسی بھی مندر میں جا کر اپنا ٹھکانا بنا سکتی تھی۔ ہندوستان میں ایک طویل عرصے سے رہنے کی وجہ سے وہ ہندوؤں کے مذہب کی موٹی موٹی باتوں سے اچھی طرح واقف ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ وہ بہت کم بات کرے گی۔ زیادہ وقت یہ ظاہر کرے گی کہ وہ گیان دھیان میں رہنا زیادہ پسند کرتی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ سو گئی۔

شاداں نے حسب وعدہ اذان سے آدھ گھنٹہ پہلے نجمی کو جگا دیا۔ نجمی نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ شاداں اس کے لیے تازہ دودھ لے آئی اس نے دودھ پیا اور گیروی چادر اپنے کاندھے پر رکھ لی اور بولی "تمھارا بہت بہت شکریہ شاداں۔"
نجمی نے اسے کچھ روپے دینے چاہے جنھیں شاداں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اس نے ایک مسلمان

عورت ہونے کے ناطے اپنا فرض ادا کیا ہے وہ اس کا معاوضہ نہیں لے گی۔ نجمی نے لالٹین کی روشنی میں اپنے سراپا پر ایک نظر ڈالی۔ وہ گیروی ساڑھی میں جوگن لگ رہی تھی۔ یہ کھدر کی ساڑھی تھی۔ ماتھے پر تلک اور کاندھے پر گیروے رنگ کی چادر، سر منڈا ہوا، پاؤں میں معمولی چپل، اس کا حلیہ بالکل ہی بدل چکا تھا۔ اس نے شاداں کو بے اختیار گلے سے لگا لیا۔ شاداں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ نجمی اس کے گھر سے نکل کر کشمیر روڈ کی طرف روانہ ہو گئی۔ بال منڈوا دینے سے اس کے سر کو ٹھنڈی ہوا لگ رہی تھی۔ نجمی نے گیروے چادر کا پلو سر کے اوپر کر لیا۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا اور کسی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ نجمی نے ہاتھ اٹھا کر خدا سے اپنی کامیابی کی دعا مانگی۔ بائیں جانب اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں صبح کی پہلی نیلی روشنی میں اندھیرے میں سے ابھرنے لگی تھیں۔ نجمی کشمیر روڈ پر آ کر ایک طرف رک گئی۔ سڑک پر ہلکا ہلکا اندھیرا تھا کوئی سواری وہاں نہیں تھی۔ نجمی شہر کی طرف تیز تیز قدموں سے چل پڑی۔ کچھ دور گئی ہو گی کہ پیچھے سے ایک موٹر گاڑی آئی اس کی روشنی میں ایک طرف کھڑے ہو کر نجمی نے بے اختیار اسے ہاتھ دے دیا۔ یہ ایک پرانے ماڈل کی موٹر گاڑی تھی اور اسے ایک بوڑھا ہندو ڈوگرہ چلا رہا تھا اس نے ایک جوگن کو ہاتھ دیتے دیکھا تو گاڑی روک لی۔ نجمی نے آگے بڑھ کر بڑے باوقار انداز میں کہا۔
"جوگن کو اسٹیشن پر پہنچا دو گے بابا؟"
ہندو ڈرائیور نے ہاتھ جوڑ کر کہا "بیٹھو ماتا میں ادھر ہی جا رہا ہوں۔"
نجمی کار کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی کار اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئی۔ نجمی نے ڈرائیور سے وقت پوچھا تو اس نے کہا "چار بجنے والے ہیں ماتا۔"

شمالی ہند میں بیراگنوں اور جوگنوں کو خواہ وہ جوان ہوں احترام سے ہندو لوگ ماتا کہہ کر پکارتے ہیں۔ نجمی نے کوئی جواب نہ دیا اس نے شکریہ بھی ادا نہ کیا۔ اسے معلوم تھا کہ جوگی لوگ اپنے اوپر کیے احسانوں کا شکریہ ادا نہیں کرتے بلکہ الٹا ان پر احسان جتاتے ہیں۔
ٹرین سوا چار بجے چھوٹتی تھی نجمی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہاں سے اسٹیشن کتنی دور ہے۔ وہ ڈرائیور کو یہ تاثر نہیں دینا چاہتی تھی کہ وہ اسٹیشن پہلی بار دیکھ رہی ہے اس نے ڈرائیور سے اتنا ضرور کہا کہ گاڑی تیز چلاؤ ہمیں ٹرین پکڑنی ہے۔ ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ چند لمحوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے بعد دور سے ریلوے اسٹیشن کی ہری بتیاں نظر آنے لگیں ۔ اسٹیشن پر سواریاں اتر رہی تھیں نجمی کار سے باہر نکلی تو ہندو ڈرائیور نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا ۔

”ماتا ! میرا پتر بیمار ہے بھگوان سے پرارتھنا کرنا کہ وہ اچھا ہو جائے ۔“

نجمی نے کوئی جواب نہ دیا اور اسٹیشن کی عمارت کی طرف چل دی ۔ ہندوستان میں جوگی بنیا ریل کا ٹکٹ نہیں لیتے ۔ نجمی کے پاس پیسے تھے مگر اس نے جان بوجھ کر ٹکٹ نہ خریدا ۔ وہ اپنے آپ کو پوری جوگن ثابت کرنا چاہتی تھی ۔ امرتسر جانے والی ٹرین پلیٹ فارم پر لگ چکی تھی اور کافی رش بھی تھا نجمی تھرڈ کلاس کے ڈبے میں کچھ ہندو عورتوں کے پاس بیٹھ گئی ۔ نجمی بہر حال خوبصورت تھی اور رنگ بھی نکھرا ہوا تھا ۔ ہندو عورتیں اس کی آؤ بھگت کرنے لگیں ۔ نجمی نے سوچا کہ یہ عورتیں سفر میں اس کے لیے عذاب نہ بن جائیں چنانچہ اس نے حفظ ماتقدم کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ایک عورت کو جھڑک کر جلالی آواز میں کہا ۔

”چپ رہو ۔ ہم گیان دھیان میں ہیں کسی نے بلایا تو ہم اس کا ناش کر دیں گے جے ماتا شیراں والی کی ۔“

نجمی کو معلوم تھا کہ ہماچل پردیش اور خاص طور پر جمبہ اور جموں میں شیراں والی ماتا کی عقیدت سے پوجا ہوتی ہے ۔ ہندو عورتیں تو فوراً سہم کر پرے پرے ہٹ گئیں ۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ سارا راستہ انھوں نے پھر نجمی کو تنگ نہ کیا اور نجمی کو یہ سوچنے کا موقع مل گیا کہ امرتسر پہنچ کر اسے سب سے پہلے کہاں جانا ہوگا امرتسر کے سیتلا مندر کا نجمی نے نام سن رکھا تھا کہ یہ امرتسر میں ہندوؤں کا سب سے بڑا مندر ہے یہاں وہ پہلے کبھی نہیں گئی تھی اسے وہاں جانے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی ۔ اپنے مشن کا آغاز وہ اسی سیتلا مندر سے کرنا چاہتی تھی ۔

دن کافی نکل آیا تھا جب ٹرین امرتسر اسٹیشن پہنچی تو اسٹیشن پر بڑا رش تھا ۔ پولیس بھی تھی ریلوے پولیس کے آدمی بھی تھے مگر نجمی نے اپنا حلیہ اس حد تک تبدیل کر رکھا تھا کہ اسے ایک نظر میں پہچاننا تقریباً ناممکن تھا وہ ٹرین سے اتر کر بڑے اطمینان سے قدم قدم چلتی اسٹیشن سے باہر آ گئی ۔

باہر سائیکل رکشہ اور تانگے کھڑے تھے لوگ اس میں اپنا اپنا سامان لاد کر گھروں کو جا رہے

تھے نجمی کی طرف کسی نے کوئی دھیان نہ دیا ۔

ہندوستان میں جوگی جوگنیں عام چلتی پھرتی نظر آتی ہیں ۔ نجمی نے اپنے سر پر سے چادر ہٹا رکھی تھی تاکہ منڈا ہوا سر ہونے کی وجہ سے وہ آسانی سے پہچانی نہ جا سکے ۔ ایک سائیکل رکشا والے کے پاس جا کر اس نے کہا ” بابا ! ہم سیتلا مندر کا درشن کرنے آئے ہیں ہمیں سیتلا مندر پہنچا دو “ سائیکل رکشا والا ہندو تھا یہ لوگ جوگی اور سنیاسیوں کے عادی تھے مگر ایک خوبصورت جوگن کو دیکھ کر اس نے نجمی کو رکشے میں بٹھا لیا ۔ ویسے بھی سیتلا مندر ریلوے اسٹیشن سے زیادہ دور نہیں تھا ۔ بیچ میں صرف ریلوے کا ایک پل ہی پڑتا تھا ۔ سیتلا مندر کا اونچا دروازہ تھا جس کے اندر چھوٹی بڑی گھنٹیاں زنجیروں سے بندھی ہوئی لٹک رہی تھیں ۔ لوگ آتے جاتے ان گھنٹیوں کو ہاتھ سے ہلا کر بجاتے تھے ۔ پوجا کرنے والوں کی یہاں کثیر تعداد موجود تھی پوجا کا وقت عام طور پر صبح اور شام کو ہوتا ہے لیکن دوپہر کے وقت بھی اس مندر میں کافی لوگ پوجا کرنے اور ماتھا ٹیکنے آ رہے تھے ۔ مندر کا بہت کشادہ صحن تھا جہاں برآمدے کے پیچھے کمرے بنے ہوئے تھے ۔ ایک جگہ ریڈ کراس کا نشان بنا ہوا تھا ۔ نجمی نے بھی مندر کی وسیع ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہوئے زنجیر ہلا کر گھنٹی بجائی اور چاروں طرف سے چوکس ہو کر مندر کے دالان میں آ گئی ۔

اب اس نے دیکھا کہ یہ مندر ایک بہت بڑے تالاب میں بنا ہوا ہے جہاں تک ایک کشادہ راستہ تالاب کے اوپر سے ہو کر جاتا تھا اسی راستے کی دونوں جانب برجیاں بنی تھیں جن پر گول روشنی کے گلوب لگے تھے ۔

مندر ایک کافی بڑے چوکور کمرے کی شکل میں تھا ۔ تالاب چاروں طرف دکھائی دے رہا تھا مندر میں رام اور سیتا کے قد آدم بت رکھے تھے جو بے حد سجے ہوئے تھے ۔ ان کے پیچھے روشنی کا ایک چکر گھوم رہا تھا ۔ مورتیوں کے آگے مسند لگائے بڑا پجاری بیٹھا لوگوں سے پیسے لے کر ان کے ماتھے پر زعفران کا تلک لگاتا جاتا تھا ۔ نجمی نے مندر کا ایک چکر لگایا اور پھر باہر برآمدے میں سنگِ مرمر کی ایک برجی کے پاس آسن جما کر بیٹھ گئی ۔ اس کی ایک جانب مندر کا بڑا کمرہ تھا اور دوسری جانب تالاب تھا ۔ عورتیں اور مرد مندر میں ماتھا ٹیکنے کے بعد نکلتے تو نجمی کے بھی احترام سے پاؤں چھوتے ۔ نجمی نے بظاہر آنکھیں بند کر رکھی تھیں لیکن حقیقت میں وہ نیم وا آنکھوں سے

ایک ایک آدمی اور عورت کا جائزہ لے رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے آگے پھل اور مٹھائی کا ڈھیر لگ گیا۔ نجمی نے ان کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ آدھ گھنٹے تک وہاں آسن جمائے رکھنے کے بعد نجمی نے "جے ماتا شیراں والی"، "جے سیتا میا"، کا نعرہ لگایا اور پھل اور مٹھائی کے ڈھیر کو وہیں چھوڑ کر اٹھی اور مندر کے گرد دو چکر لگانے کے بعد تالاب کے اوپر بنے ہوئے راستے پر سے ہوتی مندر کے کشادہ دالان میں آکر پیپل کے ایک درخت کے نیچے بنے ہوئے چبوترے کی طرف آ گئی۔ یہاں قریب ہی ہنومان کی ایک مورتی کھڑی تھی۔ نجمی کو ہنومان کبھی اچھا نہیں لگا تھا لیکن اب مجبوری تھی اس نے ہاتھ جوڑ کر ہنومان کی مورتی کو پرنام کیا اور پیپل کے نیچے چبوترے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ دو چار جٹا دھاری سادھو لوگ ادھر اُدھر دھونی رمائے اپنے عقیدت مندوں کے ... درمیان بیٹھے بظاہر جاپ میں مشغول تھے۔

نجمی آلتی پالتی مارے، گردن بالکل سیدھی کیے سادھوؤں کی طرح پیپل کے درخت تلے بیٹھی تھی آتے جاتے ہندو پجاری یہاں بھی اس کے پاس پھل اور مٹھائی کے دونے رکھنے لگے نجمی کو بھوک تو لگ رہی تھی مگر انھیں ہاتھ نہ لگانا اس کے منصوبے کا اہم حصّہ تھا۔ اس کی تیز نگاہیں کن انکھیوں سے ماحول کا برابر جائزہ لے رہی تھیں اپنے منصوبے کے مطابق اسے کسی سپاہی کی تلاش تھی۔ اچانک اس کی نظر ایک لیڈی کانسٹیبل پر پڑی۔ یہ عورت اس کے کام کے لیے نہایت موزوں تھی۔ نجمی نے دیکھا کہ بھاری بدن والی لیڈی کانسٹیبل عورتوں کو قطار بنا کر مندر میں جانے کی تلقین کر رہی تھی۔ وہ اپنی ڈیوٹی پر تھی اور نجمی کو یقین تھا کہ وہ اتنی جلدی وہاں سے نہیں جائے گی۔ نجمی کچھ دیر خاموشی سے پیپل تلے بیٹھی رہی وہ برابر کن انکھیوں سے لیڈی کانسٹیبل کا جائزہ لے رہی تھی۔ جب نجمی نے دیکھا کہ لیڈی کانسٹیبل پیچھے ہٹ کر برآمدے میں اسٹول پر ذرا سستانے کے لیے بیٹھ گئی ہے تو وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور "سیتا رام سیتا رام"، کا جاپ کرتی دالان کی طرف جانے کی بجائے برآمدے میں چلنے لگی۔

لیڈی کانسٹیبل کے قریب سے گزرتے ہوئے نجمی نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ برآمدہ جہاں ختم ہوتا تھا وہاں بھی ہنومان کی ایک مورتی نصب تھی۔ نجمی نے ہاتھ جوڑ کر اسے بھی پرنام کیا اور اسی طرح بلند آواز میں سیتا رام سیتا رام کا جاپ کرتی ہاتھ میں پکڑی ہوئی مالا کے منکے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھیرتی برآمدے میں واپس چلنے لگی۔ لیڈی کانسٹیبل اسی طرح اسٹول پر بیٹھی تھی۔ اس کا بدن بھاری ضرور تھا مگر عمر زیادہ نہیں تھی۔ کھلتا ہوا رنگ تھا اور ماتھے پر تلک لگا تھا جس سے نجمی کو معلوم ہو گیا کہ یہ سکھنی نہیں ہے ہندو ہے۔ کیونکہ سکھ عورتیں عام طور پر ماتھے پر تلک نہیں لگاتیں۔ نوجوان لڑکیاں اب فیشن کے طور پر بندیا ضرور لگانے لگی ہیں۔ نجمی عین لیڈی کانسٹیبل کے آگے آکر رک گئی اور اس کی طرف تیز نظروں سے تکنے لگی۔ نجمی کو یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں یہ اسے پہچان کر گرفتار نہ کر لے لیکن نجمی نے اپنے اندر غضب کی خود اعتمادی پیدا کر لی تھی۔ لیڈی کانسٹیبل نے ایک جوان سر منڈی جوگن کو اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھا تو ضعیف الاعتقاد ہونے کی وجہ سے فوراً اسٹول چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ہاتھ جوڑ لیے۔

نجمی نے گہری پراعتماد آواز میں کہا "تیرے پچھلے جنم کے کرم ایسے ہیں کہ تجھ کو افسر ہونا چاہیئے تھا تو یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے۔"

لیڈی کانسٹیبل نے چند روز پہلے لیڈی ہیڈ کانسٹیبل کے عہدے پر اپنی ترقی کی درخواست دے رکھی تھی اس نے جب ایک جوگن کی زبان سے اپنی افسری کی بات سنی تو فوراً نجمی کے پاؤں چھوئے اور ہاتھ باندھ کر بولی "ماتا! میری رکھشا کرنا میں نے ترقی کی عرضی دے دی ہے۔"

نجمی کے لیے یہ تصوّر کرنا کوئی عجیب یا انوکھی بات نہیں تھی کہ پولیس کے ایک کانسٹیبل یا لیڈی کانسٹیبل کو اپنی ترقی کی ضرور خواہش ہوتی ہے اور اس کے لیے وہ تگ و دو کرتا ہی رہتا ہے۔ اس کا چلایا ہوا تیر ٹھیک نشانے پر جا لگا تھا۔ نجمی نے لیڈی کانسٹیبل کی طرف جلالی نظروں سے پہلے سے زیادہ گھور کر دیکھا اور کہا "بچی! تیرا ایک دشمن ہے جس نے تیرے گھر میں راکھ پھنکوائی ہے۔ کس کا دشمن نہیں ہوتا اور پھر پولیس کے محکمے میں تو یہ دشمنیاں چلتی ہی رہتی ہیں" لیڈی کانسٹیبل نے ہاتھ باندھ کر کہا "ماتا! تم انتر یامی ہو میرا ایک ہی دشمن ہے وہ میری جگہ خود ہیڈ کانسٹیبل بننا چاہتا ہے۔"

پھر ادھر ادھر دیکھ کر بولی "ماتا! میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ مجھے اپنی سیوا کرنے کا موقع دو تم تو دلوں کا حال جانتی ہو مجھ پر کرپا کرو۔"

نجمی خود یہی چاہتی تھی۔ اس نے پہلے تو صاف انکار کر دیا کہ سنیاسی لوگ کسی کے گھر نہیں جاتے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن جب لیڈی کانسٹیبل اس کے آگے جھک گئی تو نجمی نے سر اٹھا کر کہا: "اچھا بچی! ہم تیرے گھر چلیں گے۔ تیرے پچھلے جنم کے کرموں کا پھل تمھیں ضرور دلوائیں گے تیرے دشمنوں کا ناش کر دیں گے۔"

ضعیف الاعتقاد ہندو لیڈی کانسٹیبل کو اور کیا چاہیئے تھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ نجمی کو اپنے ساتھ رکشے میں بٹھائے اپنے گھر لیے جا رہی تھی۔ لیڈی کانسٹیبل اپنی ماں کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی اور وہ اپنی ماں کے ساتھ سیتلا مندر کے قریب ہی ایک گلی میں رہتی تھی ایک جوان اور خوبصورت جوگن کو اپنے گھر میں رام نام کا جاپ کرتے آتا دیکھ کر لیڈی کانسٹیبل کی ماتا نے جلدی سے دالان میں چادر بچھا دی۔ لیڈی کانسٹیبل نے اپنی ماں کو ایک طرف لے جا کر بتا دیا کہ جوگن ماتا بڑی پہنچی ہوئی ہے اور دلوں کے بھید جانتی ہے۔ اب نجمی کی آؤبھگت شروع ہو گئی۔ نجمی نے بھی بہت جلد ان ماں بیٹی کے دل پر اپنا سکہ جما دیا۔ یونہی پانی سے بھری ہوئی کٹوری پر دم کر کے مکان کی دہلیزوں پر چھڑکوایا۔ کچھ اوٹ پٹانگ اشلوک پڑھ کر فضا میں پھونکیں ماریں اور کہا: "کوشلیا بچی! ہم نے تیرے دشمن کا کیا ہوا جادو بھنگ کر دیا ہے اب تجھے ہیڈ کانسٹیبل بننے سے کوئی نہیں روک سکتا لیکن اس کے لیے ہمیں تیرے گھر میں کچھ روز ٹھہر کر شیراں والی ماتا کا چلہ کاٹنا ہو گا۔"

کوشلیا اس لیڈی کانسٹیبل کا نام تھا ان کو اور کیا چاہیئے تھا۔ ہاتھ باندھ کر ماں بیٹی یک زبان ہو کر بولیں: "ماتا یہ ہمارے دھن بھاگ ہیں کہ آپ ہماری کٹیا میں پدھاریں اور ہمیں سیوا کرنے کا موقع دیا۔"

دوپہر کا کھانا بڑا پر تکلف تھا رات کو بھی کھانے میں پوریاں کچوریاں اور مٹھائی تھی نجمی نے خوب مزے لے کر کھایا اور کہا "ہم شیراں والی ماتا کے چیلے ہیں ہمیں شیروں کی طرح کھانے کی آگیا دی گئی ہے۔"

رات کو جب کوشلیا کی ماتا اپنی کوٹھڑی میں جا کر سوگئیں تو نجمی نے کوشلیا سے کہا: "ہم آج رات شیراں والی ماتا کا چلہ کریں گی ہمارے سرہانے ایک دیا جلا کر رکھ دو۔"

کوشلیا نے فوراً مٹی کا دیا جلا کر نجمی کی چارپائی کے سرہانے رکھ دیا اور خود اس کے پاؤں چھو کر دوسری کوٹھڑی میں چلی گئی۔ کچھ دیر تو نجمی چارپائی پر آلتی پالتی مارے بیٹھی رہی لیکن پھر مرغن غذا نے

اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا اور نجمی اونگھنے لگی اس نے "جے ماتا شیراں والی" کا ایک ہلکا سا نعرہ لگایا اور چارپائی پر لیٹ کر گہری نیند سو گئی۔

صبح اس نے کوشلیا کو اپنے پاس بٹھا لیا اس کی ماں رسوئی میں جلیبی کچوریاں تیار کر رہی تھی نجمی نے اپنے سوچے سمجھے منصوبے کے دوسرے مرحلے پر عمل کرتے ہوئے کوشلیا کی طرف جلالی انداز میں دیکھتے ہوئے کہا: "تمھارے دھن بھاگ ہوں کوشلیا! رات ماتا شیراں والی نے ہمیں درشن دیئے ہیں۔"

"سچ ماتا جی؟" یہ کہہ کر کوشلیا نے نجمی کے پاؤں چوم لیے۔

نجمی نے کہا "شیراں والی ماتا نے کہا ہے کہ تیرے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے پر تو چنتا نہ کر ہم وہ رکاوٹ دور کر دیں گے یہ بتا کہ اس شہر میں کوئی بڑی جیل بھی ہے؟"

"ہاں ماتا! امرتسر میں ہمارے پنجاب پرانت کی سب سے بڑی جیل ہے۔"

نجمی جیسے گہری سوچ میں ڈوب گئی پھر سر اٹھا کر کہنے لگی: "کوشلیا! اس جیل میں کس کا حکم چلتا ہے؟"

کوشلیا نے ہاتھ باندھ رکھے تھے کہنے لگی۔

"ماتا! جیل کے جیلر کا حکم چلتا ہے اس کا نام ملک راج بھاکھڑی ہے۔"

نجمی نے پوچھا: "یہ بتا اس کی پتنی تیرے خلاف کیوں ہے؟"

کوشلیا نے عرض کی: "ماتا! میں نے اسے صرف ایک بار ہی دیکھا ہے۔ بھگوان جانے وہ میرے خلاف کیوں ہے؟"

نجمی نے کہا: "رات مجھے شیراں والی ماتا نے بتایا ہے کہ اس شہر کے جیل خانے پر جس کا حکم چلتا ہے اس کی پتنی کوشلیا کے خلاف اپنے پتی کے کان بھرتی ہے۔"

کوشلیا بولی: "مگر ماتا! اسے میرے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے وہ ایک بڑے افسر کی پتنی ہے۔ میں ایک معمولی کانسٹیبل ہوں۔"

نجمی نے گرج کر کہا: "دشمنی پچھلے جنم سے چلی آ رہی ہے۔ وہ تیری جگہ اپنی ایک رشتے دار عورت کو ترقی دلانا چاہتی ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوشلیا لیڈی کانسٹیبل نے نجمی کے پاؤں پکڑ لیے "ماتا! مجھ پر کرپا کیجئے کوئی ایسا چلہ کریں کہ مجھے ترقی مل جائے ہم غریب ہیں۔ ابھی مجھے اپنے بیاہ کے لیے جہیز بھی اکٹھا کرنا ہے۔"

نجمی نے مزید کریدتے ہوئے پوچھا: "تو چنتا نہ کر شیراں والی ماتا تیری مدد کرے گی یہ بتا کہ جیل کے بڑے افسر کی پتنی چھپ چھپ کر کسی سے ملتی ہے کیا؟"

یہ بھی نجمی نے اندھیرے میں ایک تیر چلا دیا تھا کہ اگر جیلر کی بیوی کا کوئی اسکینڈل ہوگا تو کوشلیا تک یہ بات ضرور پہنچی ہو گی اور آگے چل کر نجمی کے لیے یہ بات بڑی فائدہ بخش ثابت ہو گی۔

"ماتا! آپ تو دلوں کے بھید جانتی ہیں پھر میرا منہ کیوں کھلواتی ہیں۔"

نجمی نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا: "ہم تیری زبان سے سننا چاہتے ہیں۔"

کوشلیا نے فوراً ہاتھ باندھ لیے اور کہا: "ماتا! میں نے سنا ہے کہ جیلر صاحب کی پتنی کملا جیل کے وارڈن روپ کمار سے راتوں کو چھپ چھپ کر ملتی ہے۔ جیلر صاحب تو اپنی پتنی کملا پر جان چھڑکتے ہیں ان کی شادی کو تین سال ہوئے ہیں کوئی اولاد نہیں ہوئی جیلر صاحب کئی مندروں کی یاترا کر آئے ہیں کہ اولاد ہو۔ کملا اپنے پتی کو کچھ نہیں سمجھتی۔ وہ تو سنا ہے وارڈن روپ کمار سے بیاہ بھی کرنا چاہتی ہے۔"

اتنی معلومات نجمی کے لیے کافی تھیں اس نے تلخ لہجے میں کہا: "بس بس کوشلیا! کسی کے عیب بڑھ چڑھ کر بیان نہ کر تیری زبان سے ہمیں جو سننا تھا سن لیا اب ہماری بات غور سے سن یہ جیلر صاحب کی پتنی کملا تیرے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ بن کر کھڑی ہے۔"

کوشلیا نے گڑگڑا کر کہا۔

"ماتا کسی طرح یہ رکاوٹ ہٹا دو میں تمھارے چرن دھو دھو کر پیوؤں گی۔"

نجمی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا: "خبردار آئندہ بیچ میں مت بولنا سن! اس لیے ہمیں کملا کے گھر میں جا کر پورے سات دن چلہ کرنا ہوگا۔ شیراں والی ماتا کا بھی یہی حکم ہے۔"

کوشلیا تو خوشی سے نہال ہو رہی تھی کہ یہ جوگن ماتا اس کی خاطر اتنی تکلیف کرنے والی ہے وہ ہاتھ باندھے خاموش بیٹھی تھی نجمی نے کہا: "اب ہم تجھ سے جو جو پوچھیں بتاتی جا۔"

نجمی نے بڑے طریقے سے اس لیڈی کانسٹیبل کوشلیا سے امرتسر جیل کے جیلر ملک راج بھاکڑی اس کے خاندان، کملا اور کملا کے خاندان کے بارے میں مزید ضروری باتیں معلوم کر لیں ان میں جیلر ملک راج بھاکڑی اور اس کی بیوی کملا کا حلیہ وغیرہ بھی شامل تھا تب نجمی نے کہا۔

"کوشلیا! ہمیں شیراں والی ماتا کے حکم پر آج ہی کملا کے گھر جا کر رات کو چلہ شروع کر دینا ہوگا۔ اگر دیر کر دی تو تیرے دشمنوں کا جادو چل جائے گا۔ شیراں والی ماتا تجھ پر بڑی مہربان ہے۔"

ساتھ ہی نجمی نے کوشلیا کو خاص طور پر تاکید کر دی کہ وہ یہ بات کسی کو نہ بتائے کہ وہ جیلر کی کوٹھی پر چلہ کرنے جا رہی ہے: "اپنی ماتا سے بھی اس بات کو چھپانا ورنہ تیری موت ہو جائے گی۔"

کوشلیا بھلا کیسے کسی کو بتا سکتی تھی۔ کہنے لگی: "ماتا! میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ پرنتو تم واپس میرے پاس ضرور آنا۔"

نجمی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "کوشلیا! ہم سات دن کے بعد سیدھا تیرے پاس ہی آئیں گے اور تجھے یہ اچھی خبر سنائیں گے کہ تیرے دشمنوں کو شکست ہو گئی ہے۔ سات دن کے بعد ہی تیری ترقی ہو جائے گی۔"

کوشلیا خوشی سے پھول گئی اتنے میں اس کی ماتا کچوریاں اور چائے لے آئی۔ نجمی نے ڈٹ کر ناشتا کیا اور کوشلیا کی ماتا سے کہا: "ہم کچھ دنوں کے لیے ہردوار جا رہے ہیں۔ سات دن بعد واپس آ کر درشن دیں گے۔"

کوشلیا کی ماتا بالکل گائے تھی ہاتھ جوڑے دوزانو بیٹھی تھی بولی: "جو حکم ماتا دیوی کا ہمارے دھن بھاگ کہ آپ پھر ہمارے گھر پدھاریں گی۔"

تھوڑی دیر بعد نجمی کوشلیا کی گلی سے نکل کر سائیکل رکشے میں سوار امرتسر کی سب سے بڑی جیل کی طرف جا رہی تھی اس نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ جیلر ملک راج بھاکڑی کی کوٹھی جیل کے احاطے کے اندر ہی ایک طرف بنی ہوئی ہے۔ دور سے سنٹرل جیل امرتسر کا دروازہ نظر آیا تو نجمی رکشے سے اتر گئی۔ اور پیدل ہی ہاتھ میں مالا لیے "رام نام" کا جاپ کرتی جیل کی طرف چل پڑی۔ دل میں ایک ہلکا سا دھڑکا ضرور تھا کہ کہیں کوئی سپاہی یا وہاں آیا ہوا تھانیدار اسے پہچان نہ لے۔ کہیں آتما رام تھانیدار ہی سے مڈبھیڑ نہ ہو جائے لیکن نجمی کو یقین تھا کہ سر منڈے ہوئے جوگن کے حلیے میں وہ پہچانی نہیں جا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سکے گی۔ جیل کا بہت بڑا آہنی دروازہ بند تھا۔ باہر ایک سکھ کانسٹیبل بندوق کاندھے پر رکھے پہرہ دے رہا تھا اس نے ایک جوگن کو اپنی طرف آتے دیکھا تو ہاتھ کے اشارے سے اسے واپس جانے کو کہا مگر نجمی واپس جانے کے لیے وہاں نہیں آئی تھی اس نے اپنا مالا والا ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے کہا "ہمیں جیلر صاحب کی پتنی کملا دیوی نے بلایا ہے۔"

جیلر کی بیوی کا نام سنتے ہی سکھ سپاہی اٹن شن ہو گیا نجمی کو اندازہ تھا کہ اس وقت جیلر دفتر میں ہو گا اور کملا کوٹھی میں اکیلی ہو گی وہ اسے تنہائی میں ہی ملنا چاہتی تھی۔ سکھ سپاہی کے لیے ایک جوگن بے ضرر سی ہستی تھی اس نے چھوٹا دروازہ کھول دیا اور نجمی اس میں سے گزر کر دوسری طرف چلی گئی۔ دوسری طرف ایک بہت کشادہ صحن تھا جس کے سامنے کی جیل کا ایک اور آہنی دروازہ تھا پہلو کی جانب قیدیوں سے ملاقات کے لیے برآمدے میں سلاخدار جنگلے لگے تھے۔ بائیں جانب ایک خوشنما باغ تھا جس کے بیچ میں ایک چھوٹی سی کوٹھی تھی۔ باغ کے لان میں کچھ قیدی.. گھاس وغیرہ صاف کر رہے تھے نجمی کوٹھی کی طرف بڑھی کوٹھی کے باہر چوکور ستون پر انگریزی اور ہندی میں جیلر ملک راج بھاکڑی کا نام اور پورا عہدہ ایک تختی پر لکھا تھا۔ جامن کے درخت کے نیچے سوکھے پتوں کو ایک قیدی مالی سمیٹ رہا تھا اس نے ایک سر منڈی جوگن کو کوٹھی کے برآمدے کی طرف بڑھتے دیکھا تو جلدی سے نجمی کے پاس آ کر پوچھنے لگا "سنیاسنی جی کس سے ملنا ہے تمھیں؟ کہاں جا رہی ہو منہ اٹھائے؟"

نجمی نے گردن تیزی سے گھما کر قیدی مالی کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا اور مالا والا ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا "جیلر کی پتنی کو بلاؤ۔"

اس کے ساتھ ہی سامنے والے ڈرائینگ روم کا جالی دار دروازہ کھلا اور ایک گوری چٹی خوبصورت عورت ماتھے پر تلک لگائے، جامنی ساڑھی پہنے باہر نکلی اس نے ایک جوگن کو دیکھا تو غصّے سے جھڑک کر بولی "کون ہو تم ادھر کیا لینے آئی ہو؟"

نجمی سمجھ گئی کہ یہی کملا ہے۔ اس نے عورت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور پوچھا "کیا تم ہی کملا ہو؟"

"ہاں کملا ہی ہوں مگر تمھارا بہروپ یہاں نہیں چلے گا۔" کملا نے تنک کر کہا "تیری جیسی کئی...

جوگنیں میں نے دیکھی ہیں۔" نجمی نے اپنے ہونٹوں پر ایک طنزیہ تبسّم طاری کیا اور انگلی آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا "تیرا سندر روپ تو ایسا ہے کہ تیرا بیاہ کسی راج کمار سے ہونا چاہیئے تھا۔"

نجمی نے جان بوجھ کر ایسا جملہ بولا تھا جس میں کملا کے عاشق روپ کمار کا نام بنتا تھا۔ جیلر کی بیوی نے یہ جملہ سنا تو قیدی مالی سے کہا "تم جا کر اپنا کام کرو۔"

اور نجمی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بولی "سنیاسنی ماتا پدھاریئے میرے دھن بھاگ کہ آپ نے درشن دیئے۔"

نجمی نے دل میں کہا "اب آئی ہو سیدھی راہ پر۔" اور کملا کے آگے آگے ڈرائینگ روم میں داخل ہو گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈرائنگ روم میں آرائشی سامان کی بھرمار تھی مگر وہ بڑے بھدے طریقے سے سجایا گیا تھا یہ ایک ایسی عورت کا ہی ڈرائنگ روم ہو سکتا تھا جسے اپنے خاوند سے اور اس کے گھر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور جو کسی دوسرے مرد سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ آرائشی سامان میں زیادہ تعداد ان اشیاء کی تھی جو جیل کے قیدیوں نے تیار کی تھیں۔ کارنس کے اوپر کرشن بھگوان کی مورتی رکھی تھی جس کے آگے تھالی میں رتن جو کے کچھ پھول پڑے تھے۔ رنجی نے ڈرائنگ روم میں آتے ہی چاروں طرف ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور کملا کی طرف مڑ کر کہا۔

"سن کملا میری بات دھیان سے سن مجھے پہاڑوں سے اتر کر تیرے پاس آنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن مجھے شیراں والی ماتا نے تیرے نام ایک سندیسہ دے کر بھیجا ہے۔"

جیلر کی خوبصورت خوش لباس بیوی کملا تو رنجی کے آگے بچھ گئی۔ جلدی سے بولی "ماتا جی آپ بیٹھ جائیں میرے دھن بھاگ کہ ماتا شیراں والی نے مجھے یاد کیا ہے" اور کملا کی آنکھوں میں فرطِ عقیدت سے آنسو آ گئے۔ رنجی نے تیز لہجے میں کہا "آنسو مت بہا میری بات دھیان سے سن! تو نے ایک سادھو کو ایک بار کھانا کھلایا تھا ماتا شیراں والی کو تیرا یہ کام پسند آ گیا اس نے تیرے نام ایک سندیسہ بھیجا ہے۔"

رنجی جانتی تھی کہ اس ملک میں جوگی سادھو عام پھرتے رہتے ہیں اور ہندو عورتیں انھیں بھوجن بھی کرواتی رہتی ہیں تو کبھی نہ کبھی کملا نے بھی کسی سادھو کو کھانا ضرور کھلایا ہوگا۔ کملا بڑے ادب سے قالین پر ہاتھ باندھ کر بیٹھ گئی۔

"ماتا جی! شیراں والی ماتا جی نے مجھ جنم جلی کے پاس کیا سندیسہ بھیجا ہے میں شیراں والی ماں کی

جنم جنم کی داسی ہوں"۔

ایک نوکرانی ڈرائنگ روم میں کسی کام سے آ گئی۔ رنجی نے اس کی طرف اشارہ کیا اور کملا سے کہا "اسے یہاں سے باہر نکال دو۔"

کملا نے فوراً نوکرانی کو وہاں سے باہر بھیج دیا۔ اب رنجی نے چاروں طرف غور سے دیکھا اور کملا کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی "کملا شیراں والی ماں نے تمھیں سندیسہ بھیجا ہے کہ تیرے ہاں چاند سا لڑکا ہوگا۔"

کملا نے کسی قسم کی خوشی کا اظہار نہ کیا رنجی کو معلوم تھا کہ کملا اپنے جیلر خاوند سے طلاق لے کر جیل کے وارڈن روپ کمار سے بیاہ کرنا چاہتی ہے۔ پھر بھی کملا نے ہاتھ باندھے عرض کی "میرے دھن بھاگ ماتا۔"

رنجی نے اچانک اپنا مالا والا ہاتھ کملا کے کندھے پر رکھ دیا اور بولی "یہ بھی دھیان سے سن کہ یہ لڑکا تیرے خاوند ملک راج بھاکڑی سے نہیں بلکہ روپ کمار سے ہوگا۔"

کملا اپنی جگہ پر ساکت ہو گئی جب آتے ہی رنجی نے روپ کمار اور راج کمار کا نام لیا تھا تو کملا سمجھ گئی تھی کہ یہ کوئی پہنچی ہوئی جوگن ہے اور دلوں کے بھید جانتی ہے۔ اب جو اس نے صاف صاف یہ بات کر دی تو کملا نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ اٹھ کر اندر والے دروازے کا پردہ ہٹا کر دوسری طرف دیکھا کہ کسی نے جوگن ماتا کی آواز تو نہیں سن لی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور رنجی کے چرنوں کے پاس بیٹھ کر ہاتھ جوڑ کر بولی "ماتا تم انتریامی ہو تم پر دلوں کا بھید کھلا ہوا ہے شیراں والی ماں نے میرے آتما کو پرسن کر دیا ہے۔ میں ماتا کی آبھاری ہوں پر جوگن ماتا یہ کیسے ہو سکتا ہے میرا بیاہ تو بھاکڑی صاحب سے ہو چکا ہے۔"

رنجی نے کملا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"مگر تم روپ کمار سے پیار کرتی ہو تم اس سے بیاہ کرنا چاہتی ہو کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں؟ شیراں والی ماں نے مجھے تمھارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔"

کملا نے روتے ہوئے اپنا سر رنجی کے قدموں پر رکھ دیا۔ رنجی نے اپنے پاؤں کو ایک لمحے کے لیے بھی پیچھے نہ ہٹایا۔ کملا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "جوگن ماتا! کہیں میں پاپ تو نہیں کر رہی؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہ: ہ میری مرضی کے خلاف ہوا ہے مجھے شروع ہی سے روپ کمار سے پریم تھا۔ شادی کے بعد میرے نے اپنے پتی سے کہہ کر اسے یہاں جیل میں وارڈن لگوایا ہے۔"

بخمی نے کہا: "پریم کرنا پاپ نہیں ہے بچی اور شیراں والی ماں اگر چاہے تو وہ کیا نہیں کر سکتی۔ تمھارا بیاہ ایک سال بعد روپ کمار سے ہو جائے گا۔"

کملا کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ اس نے بخمی کے پاؤں پکڑ لیے۔ "ماتا جوگن! کیا ایسا ہی ہوگا؟"

"ایسا ہی ہوگا بچی!" بخمی نے کہا۔ "پھر تیرے گھر شیراں والی ماں ایک پتر دے گی، تو دولت میں کھیلے گی۔ راج کرے گی۔ لکشمی دیوی تجھ پر مہربان ہوگی لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے۔"

کملا نے جلدی سے پوچھا "مجھے ہر شرط منظور ہے۔"

بخمی نے کہا "یہ شرط تجھے نہیں مجھے پوری کرنی ہوگی میں یہ کشٹ کبھی نہ اٹھاتی مگر میں شیراں والی ماں کی داسی ہوں اس کے حکم کے آگے میں سر نہیں اٹھا سکتی۔ شیراں والی ماں کے حکم سے مجھے تیرے گھر پر ایک مہینہ ماں کا چلہ کاٹنا ہوگا۔"

کملا نے فوراً ہاتھ جوڑ کر کہا "جوگن ماتا میرا گھر آپ کا گھر ہے آپ کی سیوا کر کے تو میرا جنم سپھل ہو جائے گا۔ مگر ماتا جی! ایک بنتی کروں گی۔"

بخمی جانتی تھی کملا کیا کہنے والی ہے۔ اس نے چھت پر لگے پنکھے کی طرف نظریں اٹھا کر پوچھا "میں جانتی ہوں تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ تم چنتا مت کرو۔ تیرے پتی دیو کو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔"

کملا تو بخمی کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہو گئی۔ "میا! آپ تو دل کا حال جانتی ہیں۔"

بخمی نے گہری سانس کھینچ کر "جے شیراں والی ماتا کی" کا ایک ہلکا سا نعرہ لگایا اور کملا کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "بچی! روپ کمار تیرے پچھلے جنم میں بھی تیرا خاوند تھا۔ اس جنم میں بھی تیرا اسے پتی دیو ہونا تھا۔ پر اس سے ایک پاپ ہو گیا جس کے کارن تم دونوں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے لیکن شیراں والی ماں کے حکم سے تم ایک بار پھر مل جاؤ گے اور اس کے آگے جنم میں

ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارو گے۔"

بخمی نے کملا کے دل کا حال کتاب کی طرح کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا اور شیراں والی ماں کے حوالے سے اسے یہ خوش خبری بھی سنا دی تھی کہ نہ صرف یہ کہ اس جنم میں وہ وارڈن روپ کمار کی بہت جلد پتنی بن جائے گی بلکہ ہر جنم میں اس کی پتنی ہی رہے گی۔ بخمی نے کہا "تمھارے گھر میں مجھے صرف ایک چھوٹی سی کوٹھڑی چلہ کرنے کے لیے چاہیے۔ تم اپنے پتی دیو سے کہہ دینا کہ جوگن ماتا اولاد کے لیے ہمارے ہاں چلہ کرنے آئی ہے اور اسے شیراں والی ماں نے بھیجا ہے۔"

کملا بخمی کے پاؤں دباتے ہوئے بولی "ماتا! ایسا ہی ہوگا، بھاگڑی جی تو شیراں والی ماں کے پجاری ہیں۔ وہ تو اولاد کی خاطر وہاں دو بار یاترا بھی کر آئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے" بخمی نے جلال آمیز لہجے میں کہا۔ "ہمیں یہ بھی شیراں والی ماں نے بتا دیا ہے۔ باقی ہم خود تمھارے پتی سے بات کریں گے۔"

کملا بولی "ماتا آپ میرے کمرے میں بیٹھ کر چلہ کریں آپ کو وہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی آپ کو جس چیز کی ضرورت ہوگی میں آپ حاضر کر دوں گی۔"

بخمی اٹھ کھڑی ہوئی "ہمیں اپنا کمرہ دکھاؤ۔"

کملا بخمی جوگن کو اپنے کمرے میں لے گئی یہ کمرہ چھوٹا تھا لیکن سامان سے بھرا پڑا تھا۔ فرش قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ باتھ روم ساتھ ہی تھا۔ بخمی صوفے پر بیٹھ گئی۔ "یہ جگہ ہمارے چلّے کے لیے ٹھیک رہے گی۔"

کملا جلدی سے بولی، "ماتا آپ آرام کریں میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

بخمی نے اسے منع نہ کیا۔ کملا چلی گئی تو بخمی نے کمرے کا جائزہ لیا اس کی عقبی دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی بھی تھی۔ بخمی نے اٹھ کر کھڑکی کھولی۔ پیچھے چھوٹا سا برآمدہ تھا جس کے آگے کوٹھی کا عقبی لان تھا جہاں کوٹھی کی دیوار آم اور جامن کے درختوں میں نصف چھپ گئی تھی۔ اس کے پیچھے جیل کی اونچی دیوار تھی۔ بخمی نے سوچا اگر یہ کوٹھی جیل کے احاطے سے باہر ہوتی تو بادل کو وہاں سے نکال لے جانے میں زیادہ آسانی ہوتی۔ اب بخمی کو زیادہ سوچ بچار اور چالاکی سے کام لینا تھا اس کے لیے وہ پوری طرح تیار ہو کر آئی تھی۔ بخمی نے اسی کمرے میں اپنا آسن جما لیا۔ کملا خود

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چائے بنا کر لائی تھی۔ اس نے مٹھائی کی تھال بخمی کے سامنے بڑے ادب سے رکھتے ہوئے کہا "ماتا اسے سوئیکار کریں میں نے خود بنائی ہے"۔

بخمی کو کملا کی زبانی معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا جبلیر خاوند دن کے ایک بجے کھانا کھانے کوٹھی پر آتا ہے۔ اس سے پہلے پہلے بخمی نے کملا کے ذریعے نوکرانی کو باہر بھیج کر سندھور، زعفران، ہرمل، لوبان اور گیندے کے پھول منگوا لیے تھے۔ وہ اب صوفے کے آگے قالین پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ کانسی کی تھالی میں پوجا کی ساری سامگری رکھی ہوئی تھی۔ لوبان سلگ رہا تھا۔ گیندے کے کیسری پھولوں کے بیچ میں بخمی نے کرشن بھگوان کی گھر میں پڑی ہوئی کانسی کی مورتی منگوا کر رکھ دی تھی۔ کملا کے خاوند کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ دیوار پر لگا ہوا کلاک ایک بجا رہا تھا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی، کملا نے کہا "بھاکڑی جی آ گئے ہیں"۔

بخمی نے دل میں کہا تیرے بھاکڑی ہی کا مجھے انتظار تھا۔ اوپر سے بولی "اسے ادھر لے آ۔ ہم آشیرباد دیں گے"۔

کملا تیزی سے باہر نکل گئی۔ ڈرائنگ روم میں ایک اونچے قد کا چوڑے شانوں والا آدمی کوٹ پتلون پہنے ہاتھ میں چمڑے کا بریف کیس لیے داخل ہو چکا تھا۔ کملا کی طرف دیکھے بغیر اس نے بریف کیس صوفے پر پھینک دیا اور کوٹ اتارتے ہوئے بولا "کملا جی! آج کیا پکایا ہے یہ پنکھا چلا دو۔ ستمبر جا رہا ہے اور گرمی نہیں جاتی"۔

اس نے اپنے آپ کو صوفے پر دھم سے گرا لیا۔ کملا نے چھت والا پنکھا چلا دیا۔ جبلیر بھاکڑی نے فضا میں ناک سے سونگھتے ہوئے پوچھا "کملا جی! یہ آج کوئی خاص پوجا پاٹھ ہو رہی ہے لوبان کی خوشبو آ رہی ہے؟"

کملا اپنے جذبات کو بڑی مشکل سے قابو میں کرتے ہوئے اپنے خاوند بھاکڑی کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور بولی۔

"راج جی! ہمارے گھر میں بھگوان کی اوتار آئی ہوئی ہے"۔

"کیا مطلب"، بھاکڑی نے کملا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

تب کملا نے اسے سب کچھ بتا دیا کہ ایک بڑی پہنچی ہوئی جوگن ماتا ان کے مکان پر پدھاری ہے جو شیراں والی ماں کی داسی ہے"۔

"شیراں والی ماں نے اسے ہمارے گھر خوشی کی خبر دے کر بھیجا ہے کہ بہت جلد ہمارے ہاں ایک لڑکا پیدا ہو گا"۔

بھاکڑی پڑھا لکھا ہندو تھا مگر وہ بھی ضعیف الاعتقاد تھا اور دیوی دیوتاؤں کے نام پر اپنے آپ اس کا سر جھک جاتا تھا اور پھر وہ شیراں والی ماں کا چیلا بھی تھا۔ اسے اولادِ نرینہ کی شدید خواہش بھی تھی اور اس مراد کو لے کر وہ دو بار ماتا شیراں والی کے مندر کی یاترا بھی کر چکا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ کہیں یہ کوئی ڈھونگی عورت نہ ہو جو اولاد کا لالچ دے کر ان کا مال ٹورنے آ گئی ہو۔ مگر جب کملا نے "جوگن ماتا" کے بارے میں واقعات بیان کر کے بتایا کہ وہ دل کا سارا حال جان لیتی ہے تو بھاکڑی بولا۔

"مجھے اس کے چرنوں میں لے چلو"۔

جبلیر بھاکڑی جب اپنی خوبصورت بیوی کملا کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو بخمی قالین پر آسن جمائے آنکھیں بند کیے آرام سے بیٹھی رام نام کا جاپ کر رہی تھی۔ مالا اس کی انگلیوں میں پھر رہی تھی۔ کانسی کی تھالی میں کرشن کی مورتی کے آگے لوبان سلگ رہا تھا۔ جبلیر بھاکڑی نے غور سے بخمی کو دیکھا۔ گیروے کپڑوں میں بیٹھی گیان دھیان میں مشغول جوگنی اسے عجیب سی لگی۔ اتنی جوان جوگن بھاکڑی نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی لیکن اس کے ہندو مت نے اس کے خون میں یہ بات ڈال دی ہوئی تھی کہ کرشن بھگوان اور ماتا شیراں والی کی عقیدت میں جوان لڑکیاں جوگنیں بھی ہو جاتی ہیں اور دیو داسیاں بن کر اپنی ساری زندگی مندروں کے لیے وقف کر دیتی ہیں۔ تب بخمی نے آنکھیں کھول کر گہری نظروں سے کملا کے خاوند راج بھاکڑی کو دیکھا اور اپنا ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔

"تیرے بھاگ جاگنے والے ہیں ملک راج! ماتا شیراں والی کی کرپا سے اس گھر میں ایک لڑکا جنم لینے والا ہے جو بڑا بھاگیہ وان ہو گا"۔

پھر بخمی نے کانسی کی تھالی میں سے گیندے کا کیسری پھول اٹھا کر اسے کرشن کی مورتی کی آنکھوں سے لگایا اور جبلیر بھاکڑی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا:

"اس پھول کو ہمیشہ اپنی جیب میں رکھنا یہ بھگوان سری کرشن کے بندرابن کی کنج کا پھول ہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیرے سارے پاپ کٹ گئے۔ شیراں والی ماں تجھ پر مہربان ہوگئی"۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان باتوں کا ایک ایسے ہندو پر اثر نہ ہوتا جس نے پوجا کے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں اور جو خود شیراں والی ماں کا پجاری تھا۔ جیلر بھاکڑی نے فوراً دونوں ہاتھ بڑھا کر بڑی عقیدت سے گیندے کا پھول لے لیا اسے آنکھوں سے لگایا چوما اور اپنی جیب میں رکھ لیا پھر ادب سے بولا۔

"ماتا میں شیراں والی میّا کا داس ہوں اور تیرا بھی داس ہوں۔ میرے ہاں ایک پتر ہو جائے میں ماتا کے مندر میں سونے کا پنجہ چڑھاؤں گا"۔

نجمی نے اس کے بعد ایسی باتیں کیں کہ جیلر بھاکڑی قدرتی طور پر اس کا گرویدہ ہو گیا آخر میں نجمی نے کہا۔

"ہم ماتا شیراں والی کے حکم سے یہاں چلّہ کرنے آئے ہیں۔ ہمیں تم سے کسی قسم کا لالچ نہیں ہے چلّہ کر کے ہم جیسے آئے ہیں ویسے ہی چلے جائیں گے۔ ہمارے جانے کے نو ماہ بعد تم سونے کا پنجہ چڑھانے ماتا کے مندر میں آ جانا"۔

جیلر بھاکڑی نے نجمی کے قدم چھو کر کہا۔

"ماتا! میں ضرور آؤں گا۔ شیراں والی ماں نے مجھ پر کرپا کی ہے میں کتنا بھاگیہ وان ہوں"۔

اور جیلر بھاکڑی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نجمی یہی چاہتی تھی اس کا ڈرامہ ابھی تک کامیابی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بے حد محتاط بھی تھی اس نے کملا اور اس کے خاوند بھاکڑی کو ہدایت کر دی تھی کہ کسی کو یہ نہ بتایا جائے کہ شیراں والی ماں کی داسی ان کے مکان پر چلّہ کر رہی ہے کملا نے گھر کے نوکروں اور نوکرانیوں کو صرف اتنا ہی بتایا کہ یہ جوگن اپنی مرضی سے ان کے ہاں کچھ روز کے لیے آ کر ٹھہر گئی ہے۔ نوکر نوکرانیوں نے بھی اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔ کیونکہ ہندو سرمایہ داروں اور امیر گھرانوں میں جوگی جوگنیں آتی جاتی ہی رہتی تھیں۔ نجمی سارا دن کوٹھی کے کمرے میں گزارتی۔ وہ اگرچہ سخت بور ہو رہی تھی مگر بادل کی خاطر اسے ہر قسم کی جسمانی اور ذہنی تکلیف گوارا تھی۔ کیونکہ بادل ایک سچا وفادار اور نیک دل دوست تھا اور اس نے بھی نجمی کے لیے بڑی مصیبتیں جھیلی تھیں اور ابھی تک جیل میں پولیس کا تشدد برداشت کر رہا تھا۔ شام کا اندھیرا ہو جانے کے بعد

نجمی کمرے سے نکل کر پلاٹ کے درختوں میں تھوڑی دیر کے لیے اکیلی ٹہلتی اور ساتھ ہی ساتھ جیل کی دیوار کا جائزہ بھی لیتی جاتی۔

کسی وقت نجمی کو احساس ہوتا کہ جیل کی اتنی اونچی دیوار کو پار کرنا ممکن نہیں۔ جیل کی دیوار کے اوپر چاروں کونوں پر جو چیک پوسٹیں بنی ہوئی تھیں وہاں سے سرچ لائٹ کی روشنی رات بھر جیل کی دیواروں کو ٹٹولتی رہتی تھی۔ بغیر کمند کے جیل کی اتنی اونچی دیوار پار نہیں کی جا سکتی تھی۔ جیل میں حفاظتی انتظامات نہایت سخت تھے۔ لوہے کا دروازہ کسی قلعے کے دروازے کی مانند تھا جو ہمیشہ بند رہتا تھا صرف اس کی چھوٹی کھڑکی یا بڑا نصف پٹ کسی گاڑی کے آنے جانے کے لیے کھلتا تھا۔ نجمی کو جیلر کے مکان میں "چلّہ" کاٹتے چھ روز گزر گئے تھے۔ اس دوران اس نے کتنے ہی منصوبوں پر غور و فکر کیا مگر بادل کو وہاں سے نکالنے کی کوئی ترکیب اس کے ذہن میں نہیں آ رہی تھی اس اثناء میں نجمی نے یہ بھی اندازہ لگایا تھا کہ جیلر بھاکڑی دفتری نظم و ضبط کے معاملے میں انتہائی سخت آدمی تھا۔ جیلر بھاکڑی ایک دن اور ایک رات کے لیے جالندھر گیا تو کملا نے رات کو وارڈن روپ کمار کو اپنی کوٹھی پر بلوا لیا۔ اس نے نجمی کو بتا دیا تھا کہ میں اسے آج کی رات [illegible] رہی ہوں۔ نجمی نے اسے سختی سے متنبہ کیا کہ وہ اس کے بارے میں روپ کمار کو کچھ نہ بتائے ورنہ سارا چلّہ بھنگ ہو [illegible] جائے گا"۔

ساتویں روز نجمی کے دماغ میں جیسے اپنے آپ ایک ترکیب آ گئی۔ یہ ترکیب کوئی مکمل اور خطرے سے خالی نہیں تھی لیکن پھر بھی اس میں فرار کا امکان موجود تھا۔ نجمی کو لیڈی کانسٹیبل کوشلیا کا بھی خیال لگا ہوا تھا وہ اسے سات روز تک جیلر کی کوٹھی میں چلّہ کرنے کا کہہ کر آئی تھی۔ چنانچہ آٹھویں دن نجمی نے شام کو جب کہ بھاکڑی اور کملا دونوں اس کے آس پاس [illegible] اچانک اٹھتے ہوئے کہا۔

"ماتا شیراں والی نے سیتلا مندر میں بلایا ہے"۔

جیلر اور کملا بھی اٹھ کھڑے ہوئے .... بھاکڑی نے کہا" میں جیپ منگواتا ہوں آپ کے لیے ماتا"۔

نجمی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا "ہمیں تمہاری جیپ کی ضرورت نہیں ہے ہم ماتا کے حکم سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اڑ کر بھی سیتلا مندر جا سکتے ہیں لیکن سنسار والوں کے خیال سے ہم ایسا نہیں کریں گے۔ ہم پیدل چل کر سیتلا مندر کے درشن کو جا رہے ہیں۔"

اور نجمی جیلر کی کوٹھی سے نکل کر گول باغ کے سامنے والے سیتلا مندر کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہ جان بوجھ کر شام کے وقت اندھیرا ہو جانے کے بعد نکلی تھی تاکہ کوئی اسے پہچان نہ لے۔ ریل کا پل عبور کر کے وہ مندر کے عقبی محلے میں آ گئی۔ یہاں گلی میں لیڈی کانسٹیبل کوشلیا کا مکان تھا۔ کوشلیا نے جوگن ماتا کو دیکھا تو خوشی سے نہال ہو گئی۔ اس کی ماتا جی نے فوراً چارپائی پر چادر بچھا دی۔ نجمی نے کوشلیا کو رازداری سے بتایا کہ وہ ایک چلہ پورا کر چکی ہے مگر ابھی سات روز کا دوسرا چلہ باقی ہے۔ ماتا شیراں والی نے حکم دیا ہے کہ کوشلیا کو ترقی کے واسطے دوسرا چلہ بھی کاٹا جائے۔ لیڈی کانسٹیبل نے نجمی کے پاؤں کو چھو کر کہا "ماتا میں تیرا احسان نہیں اتار سکتی۔"

نجمی نے کہا "اس کی ضرورت نہیں بچی! ہم ماتا شیراں والی کے حکم سے ایسا کر رہے ہیں۔ ابھی ہم زیادہ دیر نہیں رکیں گے کیونکہ ہمیں ماتا کے درشن کو سیتلا مندر بھی جانا ہے۔"

ایک گھنٹہ کوشلیا کے ہاں ٹھہرنے اور اسے اپنی جگہ پر مطمئن کرنے کے بعد نجمی واپس چل دی گول باغ سے وہ ایک سائیکل رکشا میں بیٹھی اور امرتسر سنٹرل جیل پہنچ گئی۔ جیلر بھاکڑی اور اسکی پتنی کملا اس کا انتظار ہی کر رہے تھے۔ نجمی سیدھی اپنے کمرے میں آ گئی۔ دونوں میاں بیوی بھی پیچھے پیچھے آ گئے۔ نجمی فوراً قالین پر کانسی کی تھالی کے آگے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور خوش ہو کر بولی "تم بھاگوان ہو۔ ماتا نے تمھیں اپنی آشیرباد بھیجی ہے۔"

جیلر بھاکڑی اور اس کی بیوی کملا دونوں بڑے خوش ہوئے۔ ادب سے نجمی کے سامنے ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گئے انھوں نے اپنے ہاتھ باندھ رکھے تھے اور عقیدت سے شرابور چہروں سے نجمی کو تک رہے تھے۔ اچانک نجمی نے آنکھیں کھول دیں۔ غضب آلود نگاہیں اوپر چھت پر ڈالیں اور پھر ہاتھ بلند کر کے کہا "ماتا نے خون مانگا ہے۔"

ایک پل کے لیے جیلر بھاکڑی اور کملا دونوں کانپ سے گئے۔ نجمی نے اپنی نظریں ان کے چہروں پر گاڑ دیں اور کہا "لیکن خون تمھارا نہیں بلکہ ایک راکھشش کا ہو گا جو اس وقت ایک قیدی کی شکل میں اسی جیل کی چاردیواری میں موجود ہے۔ شیراں والی ماتا نے مجھے اس کا چہرہ دکھا دیا ہے

اس کی پیٹھ پر گردن کے نیچے شیراں والی ماتا کے ایک شیر کے پنجے کا نشان ہے۔"

یہ نجمی کے منصوبے کا آخری مرحلہ تھا اور نجمی نے شب و روز کے غور و فکر کے بعد تیار کیا تھا۔ نجمی نے بادل کی پیٹھ پر ایک بار یہ نشان دیکھ لیا تھا۔ پوچھنے پر بادل نے اسے بتایا تھا کہ ایک بار وہ جنگل میں جا رہا تھا کہ درخت کے اوپر سے ایک چھوٹے چیتے نے اس پر اچانک حملہ کر کے زخمی کر دیا تھا۔ اس کی پیٹھ پر چیتے کے ایک پنجے کے ناخنوں کا نشان باقی رہ گیا تھا۔ جیلر بھاکڑی کا منہ کھلا تھا اور وہ نجمی کی طرف تک رہا تھا۔ "کیا اس قیدی کا خون کرنا پڑے گا؟"

نجمی نے فوراً کہا...... نہیں! اس راکھشش قیدی کی پیٹھ پر شیر کے پنجے کے زخم کا جو نشان ہے وہیں سے تھوڑا سا خون نکال کر اس کا تلک ماتا شیراں والی کے نام پر مجھے اپنے مستک پر لگانا ہو گا۔ اس کے بعد ماتا کا چلہ پورا ہو جائے گا اگر اس راکھشش کے خون کا تلک میں نے اپنے ماتھے پر نہ لگایا تو چلہ بھنگ ہو جائے گا۔ شیراں والی ماں ناراض ہو جائے گی اور تمھارے گھر کبھی اولاد نہیں ہو گی۔"

جیلر بھاکڑی نے جلدی سے کہا "نہیں... نہیں جوگن ماں میں اس راکھشش کو تمھارے سامنے حاضر کر دوں گا کیا وہ ہماری جیل میں ہے؟"

"ہاں"...... نجمی نے آنکھیں نکال کر کہا "شیراں والی ماں نے مجھے اس کا چہرہ بھی دکھا دیا ہے۔ میں اسے فوراً پہچان لوں گی۔ تم مجھے جیل کے قیدیوں کے چہرے دکھاؤ یہ راکھشش انھی قیدیوں میں یہاں موجود ہے۔ پچھلے جنم میں یہ راکھشش تھا اور اگلے جنم میں یہ لومڑ کے روپ میں آئے گا۔"

جیلر بھاکڑی نے کہا "ماتا میرے پاس جیل کے تمام قیدیوں کی تصویریں دفتر میں موجود ہیں کیا آپ ان کو دیکھ کر راکھشش کو پہچان لیں گی۔"

"کیوں نہیں"، نجمی نے کڑک کر کہا "شیراں والی ماں نے مجھے اس کا چہرہ صاف صاف دکھا دیا ہے۔ میں اسے فوراً پہچان لوں گی۔ یہ راکھشش تمھاری اولاد کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔"

جیلر بھاکڑی اٹھ کھڑا ہوا اور بولا "میں ابھی قیدیوں کی تصویروں والا رجسٹر لاتا ہوں ماتا"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھاکڑی کمرے سے نکل گیا تو کملا نے نجمی کے پاؤں پکڑ کر کہا "میا کہیں اس بھاکڑی سے تو مجھے اولاد نہیں ہوگی؟ میں ایسا نہیں چاہتی ماتا! میں تو روپ کمار سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔"

نجمی نے کملا کا کندھا آہستہ سے تھپتھپایا "کملا تو کیوں پریشان ہوتی ہو یہ سب کچھ تیرے اور روپ کمار کے بیاہ کے لیے ہی ہو رہا ہے۔ شیراں والی ماں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے سیتلا مندر میں درشن دیئے تھے اور کہا تھا کہ کملا کا روپ کمار سے بیاہ اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ جیل کے اندر جو راکھشش قیدی کی شکل میں موجود ہے اس کی پیٹھ پر شیر کے پنجے کا جو نشان ہے وہاں سے خون نکال کر میں اس کا تلک لگاؤں۔ سچی میں تو سب کچھ تیرے ہی لیے کر رہی ہوں۔ بھاکڑی سے تو تمھیں کبھی اولاد نہیں ہوگی۔ تیری تو اگلے سال روپ کمار سے شادی ہوجائے گی۔"

کملا بڑی خوش ہوئی۔ اس نے نجمی کے پاؤں سے ہاتھ لگا کر کہا "شیراں والی ماتا کی جے ہو۔"

"جے ہو" نجمی نے بھی اس کی تائید میں نعرہ لگایا۔

نجمی نے آنکھیں بند کرلیں اور خود ہی بولنے لگی "ماں شیراں والی! تیری آگیا کا پالن ہوگا، راکھشش کے خون کا تلک میرے ماتھے پر لگے گا اور کملا کا وواہ روپ کمار سے ہی ہوگا جو اس کا جنم جنم کا پتی ہے۔"

کملا کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ جھوم جھوم کر نجمی کے پاؤں دبانے لگی۔ جیلر کا دفتر وہیں جیل کے اندر ہی تھا اگرچہ رات ہوگئی تھی مگر جیلر کو اپنے دفتر میں سے کوئی فائل اٹھا کر لانے سے کون روک سکتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد جیلر بھاکڑی وہ رجسٹر نما فائل اٹھا کر لے آیا جس میں جیل کے تمام قیدیوں کی تصویریں لگی تھیں اور نیچے ان کے جرائم کی تفصیل اور سزا کی مدت لکھی ہوئی تھی۔ بھاکڑی نے یہ رجسٹر نجمی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا "ماتا! اس میں تمام قیدیوں کی تصویریں لگی ہیں اس راکھشش کو پہچان لیجیے جس کے خون کا تلک لگانا ہے۔"

نجمی نے ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا "مجھے اس کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہے تم خود ہی اسے کھول کر دکھاؤ۔"

جیلر نے رجسٹر کے ورق الٹنے شروع کر دیئے وہ ہر ورق الٹ کر دو سیکنڈ کے لیے توقف کرتا

اور نجمی کے نفی میں سر ہلانے سے دوسرا ورق الٹ دیتا۔ نجمی کو یقین تھا کہ اگر اس رجسٹر میں جیل کے تمام قیدیوں کی تصویریں لگی ہیں تو بادل کی تصویر بھی ضرور ہوگی۔ رجسٹر کے ورق الٹتے چلے گئے مگر بادل کی تصویر نہیں آرہی تھی۔ نجمی کے دل میں تشویش ہوئی کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ بادل کو یہاں سے کسی دوسری جیل میں تبدیل کر دیا گیا ہو۔ پھر کیا ہوگا وہ اس کی تلاش میں یوں ماری ماری پھرے گی۔ رجسٹر کے ورق الٹے جارہے تھے زیادہ تر سکھ قیدیوں کی تصویریں تھیں۔ نجمی کا دل ایک تصویر پر اپنے آپ زور سے دھڑک اٹھا یہ بادل کی تصویر تھی بلکہ دو تصویریں تھیں۔ ایک سائیڈ پوز تھا اور ایک سامنے کا پوز تھا۔ اس تصویر کو دیکھتے ہی نجمی نے ہاتھ بلند کر کے کہا "یہی ہے وہ راکھشش جس کی شکل مجھے ماتا والی نے سیتلا مندر میں دکھائی تھی۔"

جیلر بھاکڑی نے تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے قیدی کا نام وغیرہ پڑھا اور بولا "ماتا! یہ تو ایک قاتل ڈاکو اور پاکستانی جاسوس ....."

نجمی نے ترش روئی سے بھاکڑی کو جھاڑتے ہوئے کہا "تمھیں یہی معلوم نہیں کہ یہ کون ہے یہ پچھلے جنم میں راکھشش تھا اس جنم میں قاتل ہے اور اگلے جنم میں خونخوار لومڑ ہوگا۔ بس شیراں والی ماں کو اسی کے خون کی ضرورت ہے ابھی جا کر دیکھو۔ اس کی پیٹھ پر گردن سے نیچے شیر کے پنجے کا نشان ہوگا، ابھی جاؤ۔"

"جو آگیا ماتا!"

یہ کہہ کر جیلر بھاکڑی رجسٹر سنبھال کر اسی وقت اٹھا اور اپنے دفتر کی طرف تیز تیز قدموں سے چل دیا۔ دفتر میں جا کر اس نے رجسٹر کو الماری میں اس کی جگہ پر رکھ دیا اور نائب وارڈن کو جو ڈیوٹی پر تھا بلا کر کہا "سیل نمبر ۱۵ کی چابیاں لے کر میرے ساتھ آؤ۔"

جیلر بھاکڑی کو معلوم تھا کہ جس راکھشش کی تصویر جوگن ماتا نے پہچانی ہے وہ خطرناک ڈاکو بادل ہے جس پر پاکستانی جاسوس ہونے کا بھی الزام ہے۔ اس وقت جیلر بھاکڑی پر شیراں والی ماتا کا بھرپور اثر تھا۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ شیراں والی ماتا انتریامی ہے اور اس کے کہنے کے مطابق بادل کی پیٹھ پر شیر کے پنجے کا نشان ضرور ہوگا۔ سیل نمبر ۱۵ جیل کے دوسرے بلاک کے تہہ خانے میں تھا رات کے وقت جیلر صاحب کو آتا دیکھ کر جمعدار اور پہرے دار چوکس ہوگئے تھے۔ وہ یہی سمجھے کہ جیلر صاحب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اچانک راؤنڈ پر آئے ہیں۔ بادل سیل نمبر پندرہ میں پھٹے پرانے بوریئے پر پڑا تھا۔ اس کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔

پولیس کے تشدد کی وجہ سے آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ وہ دیوار کی طرف منہ کیے، سونے کی کوشش کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ سوچ رہا تھا کہ کیا کبھی وہ جیل کی چار دیواری سے فرار ہو سکے گا۔ چھت کے ساتھ بجلی کا بلب روشن تھا اسے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس نے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ قدموں کی آواز جب اس کے سیل کے سلاخ دار دروازے کے پاس آ کر رک گئی اور باہر پہرے پر کھڑے سنتری کے سیلوٹ کرنے کی آواز سنائی دی تو بادل نے گردن گھما کر دیکھا۔ اسے جیل کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ سنگ دل آفیسر یعنی جیلر بھاکڑی نظر آیا جو پتھر ایسا چہرہ لیے خاموش کھڑا تھا اور اسسٹنٹ وارڈن تالہ کھول رہا تھا۔ بادل یہی سمجھا کہ اسے امرتسر سنٹرل جیل سے نابھ یا انبالہ جیل میں بھیجا جا رہا ہے۔ اس نے بے زاری سے چہرہ دیوار کی طرف کر لیا۔ دروازہ کھلا۔

جیلر اندر آ گیا۔ پھر اس نے رعب دار آواز میں حکم دیا "کھڑے ہو جاؤ۔"

بادل مجبور تھا۔ بادلِ نخواستہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "جیلر صاحب! آپ میرا ایک ہی بار کام تمام کیوں نہیں کر دیتے۔"

جیلر بھاکڑی نے بادل کو انگریزی میں گالی دیتے ہوئے کہا "قمیص اتارو۔"

بادل کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے چپ سا ہو گیا کہ آخر اس کی قمیص کس لیے اتروائی جا رہی ہے۔ جیلر بھاکڑی نے زور سے بادل کو ایک تھپڑ مارا اور کہا "سنا نہیں؟ اپنی قمیص اتارو۔"

بادل کو طیش تو بہت آیا مگر وہ بے بس تھا۔ اسسٹنٹ وارڈن نے زبردستی بادل کی قمیص اتار دی۔ جیلر نے کہا "دیوار کی طرف منہ کرو۔"

بادل نے دل میں جیلر بھاکڑی کو چھ سات گالیاں دیں اور دیوار کی طرف منہ کر دیا۔ چھت سے لگے بلب کی روشنی میں جیلر بھاکڑی نے بادل کی پیٹھ کو دیکھا تو دنگ ہو کر رہ گیا اس کے منہ سے زیرِ لب بے اختیار نکل گیا "جے شیراں والی ماتا کی۔" کیونکہ بادل کی پیٹھ پر گردن سے ذرا نیچے

پنجے کے زخم کا نشان صاف نظر آ رہا تھا۔

وہ کچھ کہے بغیر کوٹھڑی سے باہر نکل آیا اور تیز تیز قدموں سے اپنی کوٹھی کی طرف چلنے لگا۔

اس کے دل میں شیراں والی ماتا کے ساتھ ساتھ اپنے گھر میں آئی ہوئی جوگن ماں کی قدر و منزلت دوبالا ہو گئی تھی۔ اس کا دل دونوں کی عقیدت میں شرابور تھا۔ یہ جوگن ماتا سچی ہے۔ شیراں والی ماتا سچی ہے جوگن نے بادل کو کبھی نہیں دیکھا تھا اسے کیسے علم ہو سکتا ہے کہ اس قیدی کی پیٹھ پر شیر کے پنجے کا نشان ہے۔ یہ کرامت شیراں والی ماتا کی ہی ہے اسی نے جوگن کو بتایا ہے۔ جیلر راستے میں سوچتا آ رہا تھا۔ اب میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری ہو جائے گی میرے گھر لڑکا جنم لے گا۔ شیراں والی ماں کی ہر بات ٹھیک ہو رہی ہے۔ جب وہ واپس کمرے میں آیا تو اس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ نجمی کو معلوم تھا کہ وہ کیا دیکھ کر آیا ہے۔ کملا نجمی کے چرنوں میں بیٹھی تھی۔ نجمی جان بوجھ کر خاموش رہی۔ کملا نے بے تابی سے پوچھا "کیا راکھشش کی پیٹھ پر......"

جیلر بھاکڑی نجمی کے پاؤں پر گر پڑا اور بولا "ماتا تیری جے ہو۔ شیراں والی ماں کی جے ہو اس راکھشش کی پیٹھ پر شیر کے پنجے کا نشان موجود ہے۔ میں ...... میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں۔"

کملا "ہری اوم ہری اوم" پکارنے لگی۔ نجمی نے جیلر بھاکڑی کے سر پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا اور کہا "شیراں والی کا کہا کبھی جھوٹ نہیں ہو سکتا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جیلر بھاکڑی کے لیے اس سے بڑی کرامت اور کیا ہو سکتی تھی۔

کہاں ہماچل پردیش کے پہاڑوں میں رہنے والی ایک سنیاسن جو دنیا کو چھوڑ چکی ہے اور کہاں وسطی ہند کا ایک بدنام ڈاکو بادل! وہ بھلا کیسے جان سکتی ہے کہ اس بدنام ڈاکو کی پیٹھ پر شیراں والی ماں کے شیر کے پنجے کا نشان موجود ہے۔ جیلر بھاکڑی تو نجمی کے سامنے سربسجود ہو گیا تھا وہ اپنا سر نہیں اٹھاتا تھا۔ نجمی کی سکیم بڑی کامیابی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اب سب سے خطرناک مرحلہ بادل کے جسم سے خون نکالنے کا تھا۔ نجمی چاہتی تھی کہ کوئی ایسی ترکیب لڑائی جائے کہ خون نکلوانے اور اپنے ماتھے پر خون کا ٹیکا لگانے کے لیے بادل کو جیل سے باہر لے جایا جائے۔ اسے یہ خطرہ بھی تھا کہ کہیں اس مرحلے پر جیلر بھاکڑی کو اس پر شک نہ ہو جائے اگرچہ اس کا امکان ایک فیصد ہی تھا تاہم ذرا سے شک پر نجمی کے کیے دھرے پر نہ صرف یہ کہ پانی پھر سکتا تھا بلکہ وہ خود بھی گرفتار ہو سکتی تھی۔ جیلر کی بیوی عاشق مزاج کملا پر بھی نجمی کی اس "کرامت" کا بے حد اثر ہوا تھا ان دونوں کو دل سے یقین ہو گیا تھا کہ "سنیاسن" بڑی پہنچی ہوئی ہے اور شیراں والی ماں نے اسے غیب کا حال معلوم کرنے کی طاقت عطا کر رکھی ہے۔ جیلر بھاکڑی نے نجمی کے چرنوں سے اپنا سر اٹھا کر بڑے ادب سے ہاتھ باندھ کر کہا "ماتا اب مجھے اجازت دو کہ میں اس راکھشش قیدی کے جسم کے نشان میں سے خون نکال کر لے آؤں"۔

بھلا نجمی اس بات کی کیسے اجازت دے سکتی تھی۔ اسے بادل کا خون نہیں بلکہ خود بادل چاہیے تھا۔ نجمی کچھ دیر تک منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی رہی پھر جیلر بھاکڑی سے مخاطب ہو کر بولی "اس کے لیے مجھے شیراں والی ماں سے اجازت لینی ہو گی۔ کل صبح سویرے میں شیراں والی ماں کے

درشن کرنے سیتلا مندر جاؤں گی پھر جو وہ حکم دے گی ویسا ہی ہو گا۔ لیکن ایک بات تم دونوں دھیان سے سن لو اس بات کا ذکر اگر تم میں سے کسی نے بھی کسی دوسرے شخص سے کیا تو نہ صرف یہ کہ تم اولاد سے محروم ہو جاؤ گے بلکہ تم پر ماتا شیراں والی کا عذاب نازل ہو گا"۔

جیلر بھاکڑی اور کملا نے ہاتھ باندھ لیے "ماتا! ہم بھول کر بھی ایسا نہیں کر سکتے"۔

نجمی نے انہیں حکم دیا کہ اب جا کر سو جاؤ ہمارے گیان دھیان کا وقت ہو رہا ہے۔ جب دونوں نجمی کے پاؤں چھو کر چلے گئے تو نجمی نے اپنے منصوبے کو آخری شکل دینا شروع کر دی۔ سب سے بڑا مسئلہ اس کے سامنے یہی تھا کہ وہ بادل کو جیل کی چار دیواری سے باہر کیسے نکالے اور کہاں لے جائے۔ نجمی کو وہم تھا کہ جیلر بھاکڑی اس کا کتنا ہی عقیدت مند کیوں نہ ہو۔ شاید وہ اتنا اہم مجرم کو جس پر پاکستان کے جاسوس ہونے کا بھی الزام ہے جیل کی چار دیواری سے باہر لے جانے کی اجازت نہیں دے گا۔ لیکن بادل کو جیل سے باہر لے جانا بھی بہت ضروری تھا۔ جیل کے اندر رہ کر نجمی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ کافی دیر تک سوچ بچار کرنے کے بعد آخر ایک ہی راستہ اس کی سمجھ میں آیا۔ اسی پر اکتفا کر کے وہ سو گئی۔ صبح منہ اندھیرے حسب عادت وہ بیدار ہو گئی۔ اس نے اٹھ کر غسل کیا ماتھے پر تلک لگایا اور کمرے سے باہر آ گئی۔ ہندو لوگ صبح جلدی اٹھنے کے عادی ہیں۔ ان کی عورتیں تو منہ اندھیرے اٹھ کر پوجا پاٹھ اور گھر کے کام کاج میں لگ جاتی ہیں۔ کملا اور جیلر بھاکڑی بھی اٹھ بیٹھے تھے۔ بھاکڑی ڈرائنگ روم میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ نجمی کو آتا دیکھ کر اس نے جلدی سے اٹھ کر پرنام کیا اور بولا "ماتا! میں سیتلا مندر آپ کو چھوڑ آتا ہوں"۔

نجمی خود بھی یہی چاہتی تھی کہ وہ گاڑی میں بیٹھ کر جائے۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ جیلر بھاکڑی نے فوراً اپنی چھوٹی سی گاڑی نکالی اور نجمی کو بٹھا کر جیل کے احاطے سے نکل کر سیتلا مندر کی طرف چل دیا۔ راستے میں نجمی نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ ایک بار جیلر نے کچھ کہنے کی کوشش بھی کی لیکن نجمی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بات کرنے سے منع کر دیا وہ اسے یہ تاثر دینا چاہتی تھی کہ وہ ویدوں کے اشلوک کا ورد کر رہی ہے۔

سیتلا مندر میں صبح کے وقت کافی رونق تھی۔ جیلر نے گاڑی باہر ہی ایک طرف کھڑی کر دی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ابھی پولیس کے سپاہی وغیرہ وہاں نہیں پہنچے تھے۔ نجمی نے جیلر سے کہا کہ وہ گاڑی میں اس کا انتظار کرے جیلر بولا "ماتا! میں بھی مندر میں ماتھا ٹیک آؤں"۔

نجمی نے اسے سختی سے منع کرتے ہوئے کہا "ماں شیراں والی مجھے درشن دینے آرہی ہے میں تمھیں مندر میں نہیں لے جانا چاہتی"۔

"جو حکم ماتا"۔

اور جیلر گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ نجمی جوگن کے بھیس میں مندر میں گھنٹی بجانے کے بعد اندر چلی گئی۔ وہ تالاب کے اوپر بنے ہوئے راستے پر سے گزر کر مندر کے سب سے بڑے کمرے میں آگئی۔ اس نے رام اور سیتا کی مورتیوں کو ہاتھ باندھ کر پرنام کیا اور دل میں کہا "میں جانتی ہوں کہ تم صرف مٹی کے بت ہو اور کچھ نہیں ہو"۔

اس نے کبھی ان مورتیوں کے آگے ماتھا نہیں ٹیکا تھا باہر آکر اس نے مندر کے چوکور کمرے کا طواف کیا پھر ایک طرف کھمبے کے پاس بیٹھ کر غور و فکر کرنے لگی وہ اپنے منصوبہ کو آخری شکل دے رہی تھی۔ ویسے بھی وہ کچھ وقت وہاں لگانا چاہتی تھی۔ پندرہ منٹ کے بعد نجمی وہاں سے اٹھی اور واپس چل پڑی۔ جب وہ مندر کی بڑی ڈیوڑھی میں سے باہر نکل رہی تھی تو اتفاق سے امرتسر دربار صاحب تھانے کا ایس ایچ او تھانے دار آتمارام بھی پوجا کرنے مندر آیا ہوا تھا۔ اس وقت وہ مندر میں داخل ہو رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر نجمی پر پڑ گئی۔ وہ ٹھٹھک سا گیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس نے اس جوگن کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ مگر اسے یاد نہیں آرہا تھا۔ اگر نجمی کے سر پہ لمبے بال ہوتے اور کمر میں کرپان لٹک رہی ہوتی تو تھانے دار آتمارام اسے فوراً پہچان لیتا۔ منڈے ہوئے سر اور ماتھے پر تلک اور گیروے کپڑوں کی وجہ سے آتمارام کو پہچاننے میں دقت ہو رہی تھی۔ نجمی نے تھانے دار آتمارام کو نہیں دیکھا تھا۔ آتمارام پہلے تو اپنی جگہ پر وہیں کھڑا رہا جب اس نے جوگن یعنی نجمی کو مندر کے احاطے میں کھڑی ایک کار کی طرف بڑھتے دیکھا تو بڑا حیران ہوا کہ یہ جوگن کار میں کس کے ساتھ جا رہی ہے۔ اس کی شکل و صورت پر کچھ شبہ اسے پہلے ہی ہو گیا تھا چنانچہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ کر کار کی طرف آیا۔

نجمی جوگن کار میں بیٹھ چکی تھی اور جیلر ٹھاکر کار کو اسٹارٹ کرنے کے بعد اسے احاطے سے

باہر نکل رہا تھا۔ تھانے دار آتمارام کی نظر جب اس پر پڑی تو اس نے جیلر ملک راج ٹھاکر کو فوراً پہچان لیا۔ وہ دل میں سوچنے لگا کہ یہ پڑھا لکھا شخص بھی جوگی جوگنوں کے بارے میں کس قدر وہمی ہے اس کے خیال میں ٹھاکر صاحب نے اس جوگن کو خیر و برکت کے لیے اپنے گھر میں مہمان بنا رکھا ہوگا۔ مگر میں نے اس عورت کو پہلے کہاں دیکھا ہے۔ تھانے دار آتمارام یہی سوچتا ہوا مندر میں داخل ہو گیا ابھی تک اس کے ذہن میں نجمی جوگن کی شکل واضح ہو کر نہیں آئی تھی۔

دوسری طرف نجمی جوگن کے بھیس میں جیلر کی گاڑی میں بیٹھی تھی اور گاڑی سینٹرل جیل کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔ جیلر ٹھاکر کو اتنی جرأت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ نجمی سے یہ پوچھے کہ ماتا شیراں والی کے درشن ہوئے تو ماتا نے کیا حکم دیا ہے۔ نجمی بھی خاموش تھی وہ تو زیادہ باتیں کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ جیلر کی کار کو آتا دیکھ کر دربان نے فوراً جیل کے بڑے دروازے کا ایک پٹ کھول دیا۔ کوٹھی میں کملا بھی نجمی کا انتظار کر رہی تھی اس نے میز پہ ناشتہ لگا دیا تھا۔

نجمی نے کسی سے کوئی بات نہ کی اور اپنے کمرے میں آکر خاموشی سے قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد جیلر اور اس کی بیوی کملا دبے دبے قدم اٹھاتے اندر آکر ایک طرف ادب سے بیٹھ گئے۔ نجمی نے کن اکھیوں سے انھیں اندر آتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور منہ میں بڑبڑانے لگی۔ کچھ وقت اسی طرح گزر گیا تب نجمی نے آنکھیں کھول کر جیلر اور اس کی بیوی کملا پر نگاہ ڈالی اور کہا "ماتا شیراں والی تم سے بہت خوش ہے۔ اس گھر میں لہر بہر ہونے والی ہے"۔

جیلر اور اس کی بیوی کملا خوشی سے جھوم اٹھے۔ نجمی بولی "ماتا شیراں والی نے سیتلا مندر میں مجھے درشن دے کر بتا دیا ہے کہ اس راکھشش قیدی کا خون نکال کر مجھے کس جگہ اس کے خون کا تلک لگانا ہوگا لیکن سب سے پہلے ضروری ہے کہ اس راکھشش قیدی کو میرے سامنے حاضر کرو میں اسے ماتا شیراں والی کا ایک خاص منتر پانی پر پھونک کر پلاؤں گی یہ بہت ضروری ہے"۔

جیلر ٹھاکر نے عرض کی "جو حکم ماتا میں ابھی اس راکھشش قیدی کو آپ کے چرنوں میں حاضر کیے دیتا ہوں"۔

یہ کہہ کر جیلر اٹھا اور الٹے قدموں کمرے سے نکل گیا۔ کملا نے اپنے خاوند کے جاتے ہی نجمی کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پاؤں پکڑ لیے اور بولی۔

"ماتا شیراں والی نے میرے بارے میں کچھ کہا؟"

نجمی نے جلدی سے اپنا پاؤں پیچھے کھینچ لیا اور کرخت آواز میں کہا "تم کون ہوتی ہو، شیراں والی ماں کی باتیں پوچھنے والی"۔

کملا ہاتھ باندھ کر چپ ہو گئی۔ نجمی کے لیے اس عورت کو قابو میں رکھنا بھی ضروری تھا، اس نے دوسرے لمحے اپنی آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا "کملا تو گھبراتی کیوں ہے شیراں والی ماں نے مجھے بتا دیا ہے کہ کملا کا بیاہ روپ کمار سے ہی ہو گا اور اسی کے لڑکے کی ماں بنے گی اور لاکھوں میں کھیلے گی"۔

کملا اپنی جگہ پر خوشی سے نہال ہو گئی۔ نجمی کے پاؤں چھونے کے بعد چائے اور مٹھائی لانے کے لیے رسوئی کی طرف چل دی۔ نجمی کو اب بادل کا بے تابی سے انتظار تھا۔ کیا وہ اسے اس حلیہ میں پہچان لے گا؟ کہیں پہچان لینے کے بعد اچانک جذباتی ردعمل کا اظہار نہیں کرے گا؟ اگر وہ نجمی کو دیکھتے ہی جذباتی ہو گیا یا اس کے چہرے پر حیرانی کے اثرات آ گئے تو کہیں جیلر بھاکڑی کو شک نہ ہو جائے مگر نہیں بادل بڑا تجربہ کار ہے۔ وہ نجمی کو جوگن کے روپ میں پہچان لینے کے بعد بھی کسی قسم کے تاثر کا اظہار نہیں کرے گا اور فوراً سمجھ جائے گا کہ نجمی نے اسے جیل سے نکالنے کے لیے یہ سوانگ رچایا ہے۔ دوسری طرف جیلر بھاکڑی سیل نمبر ۱۵ میں پہنچ چکا تھا۔

دو سپاہی اس کے ساتھ تھے جیلر نے سپاہیوں کو یہی بتایا تھا کہ قیدی کے کچھ خصوصی فنگر پرنٹس وغیرہ لینے ہیں اس نے بادل کو ہتھکڑی لگوائی اور اپنے ساتھ لے کر کوٹھی کی طرف چلا۔ بادل کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اسے نجمی کے پاس لے جایا جا رہا ہے۔ پہلے تو وہ یہ سمجھا کہ اسے وقت سے پہلے عدالت میں لے جایا جا رہا ہے لیکن جب جیلر اپنی کوٹھی کی طرف گھوم گیا تو وہ کچھ حیران ضرور ہوا پھر اسے خیال آیا کہ ممکن ہے اسے کوٹھی کے اندر مشقت کرنے کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔ کوٹھی کے اندر ضرور کوئی فرش وغیرہ توڑنا ہو گا۔ دیواروں کی صفائی وغیرہ کرنا ہو گی۔ جیلر نے دونوں سپاہیوں کو برآمدے میں رکنے کا حکم دیا اور ہتھکڑی کی زنجیر تھام کر بادل کو اندر ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ اس دوران نجمی نے دروازہ کھلنے کی آواز سن لی تھی۔ کملا اس کے

سامنے ادب سے سر جھکائے بیٹھی تھی آگے مٹھائی کی تھالی اور چائے پڑی تھی۔ نجمی نے چائے کا ایک پیالہ ابھی ابھی ختم کیا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ جیلر بھاکڑی اکیلا اندر داخل ہوا اور ہاتھ جوڑ کر بولا "ماتا! راکھشش قیدی میں لے آیا ہوں"۔

نجمی کا دل ایک بار زور سے دھڑک اٹھا اس نے اپنے دل سے کہا "خبردار یہ بے تابی دکھانے کا وقت نہیں"۔

پھر جیلر کی طرف دیکھا اور کہا "اس راکھشش کو اندر لے آؤ"۔

جیلر باہر چلا گیا۔ نجمی نے کملا سے کہا "کانسی کے کٹورے میں صاف پانی بھر کر لے آئے"۔

کملا جلدی سے رسوئی کی طرف چل دی دروازہ دوسری بار کھلا اور جیلر کے ساتھ بادل اس حالت میں اندر آیا کہ اس کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی داڑھی بڑھ آئی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ جونہی بادل کی نظر جوگن پر پڑی وہ وہیں ٹھٹھک سا گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جوگن کو تک رہا تھا۔ اس نے نجمی کو فوراً پہچان لیا تھا۔ نجمی نے آنکھیں کھول کر بادل کی طرف قہرآلود نظروں سے دیکھا اور کڑک کر کہا "راکھشش! آنکھیں نیچی کر دا اور بیٹھ جاؤ..... نہیں تو ابھی منتر پھونک کر بھسم کر دوں گی"۔

بادل سمجھ دار تھا اس سے پہلے بھی وہ نجمی کے ساتھ بھیس بدل چکا تھا۔ فوراً سمجھ گیا کہ نجمی نے یہ سب کچھ اسے وہاں سے نکالنے کے لیے کیا ہے۔ فوراً نظریں نیچی کر کے وہیں صوفے کے پاس قالین پر بیٹھ گیا۔ تب نجمی نے جیلر کی طرف چہرہ اٹھا کر کہا "بیٹا کرشن بھگوان کی جو مورتی کمرے میں پڑی ہے تم اس کے سامنے لوبان سلگا کر پچاس بار رام نام کا جاپ کرو۔ کملا پانی لا رہی ہے میں اس راکھشش پر شیراں والی ماں کا منتر پڑھ کر پھونکوں گی"۔

جیلر ایک خطرناک قاتل اور ڈاکو کو جوگن ماتا کے پاس اکیلا چھوڑ کر جانے سے ذرا ہچکچایا تو نجمی نے گرجدار آواز میں کہا "گھبراتے کیوں ہو بھاکڑی؟ تمہیں معلوم نہیں شیراں والی ماں کے پانچ شیر میرے پیچھے کھڑے میری حفاظت کر رہے ہیں"۔

بادل نے دل میں سوچا نجمی نے کمال کر دیا ہے۔ جیلر جلدی سے ہاتھ جوڑ کر کمرے سے نکل گیا اتنے میں کملا پانی کا کٹورا لے کر آ گئی نجمی نے اسے بھی کڑک کر کہا "تم بھی باہر جا کر بیٹھو"۔ وہ بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فوراً باہر نکل گئی۔ جب کمرے میں بادل اور نجمی اکیلے رہ گئے تو نجمی نے بلند آواز میں "ہرے کرشنا ہرے راما" کے بول دہرائے۔ پھر سرگوشی میں بادل سے کہا۔

"آج رات میں تمھیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گی"۔

بادل نے آہستہ سے دھیمی آواز میں پوچھا "لیکن یہ کیسے ممکن ہے"۔

نجمی نے سختی سے کہا "تم یہ کیوں پوچھتے ہو۔ خاموش رہو"۔

اس کے ساتھ ہی نجمی نے ہرے کرشنا ہرے راما کا جاپ کرنا شروع کر دیا پھر کملا کو آواز دی۔ کملا فوراً اندر آ گئی نجمی نے کہا "اپنے پتی دیو کو بھی بلاؤ"۔

جیلر بھاکڑی بھی اپنا جاپ ادھورا چھوڑ کر جوگن ماتا کے چرنوں میں حاضر ہو گیا۔ نجمی اس وقت "ہرے راما ہرے کرشنا" کا جاپ کر رہی تھی اور بادل اس کے سامنے دوزانوں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ نجمی نے جاپ ختم کر کے کٹوری والے پانی پر سات بار پھونک ماری اور بادل سے کہا "اسے پی جاؤ راکھشش"۔

بادل جان بوجھ کر ذرا ہچکچایا اس نے جیلر کی طرف دیکھا۔ جیلر نے اسے ڈانٹ کر کہا "ماتا جو کہتی ہے ویسے ہی کرو"۔

بادل نے کٹوری اٹھائی اور پانی پی گیا۔ تھالی میں کچھ گلاب جامن پڑے تھے۔ نجمی نے سوچا کہ بادل بیچارے کو جیل میں کھانے کو کچھ بھی نہیں ملتا ہو گا۔ اس نے مٹھائی پر بھی سات بار پھونک ماری اور کڑک کر کہا "ان گلاب جامنوں کو بھی کھا جاؤ، جلدی کرو"۔

بادل دل میں بڑا خوش ہوا ایک عرصے سے مٹھائی اسے نہیں ملی تھی وہ دیکھتے ہی دیکھتے سارے گلاب جامن چٹ کر گیا۔ تب نجمی نے جیلر کی طرف متوجہ ہو کر کہا "اس راکھشش کو واپس لے جا کر بند کر دو اور فوراً میرے پاس آؤ مجھے ماتا شیراں والی کا اگلا حکم تمھیں سنانا ہے"۔

جیلر نے بادل کی ہتھکڑی کی زنجیر پکڑ کر اسے کھینچ کر کہا "چلو"۔

برآمدے میں مسلح سپاہی کھڑے تھے انھوں نے فوراً بادل کو اپنی حراست میں لے لیا۔ جیلر بھی ساتھ ہی رہا۔ اپنی نگرانی میں اس نے بادل کو اس کے سیل میں بند کر کے سلاخوں والے دروازے کو تالا لگوایا اور اپنی کوٹھی کی طرف واپس روانہ ہوا۔ وہاں نجمی ابھی تک "ہرے راما، ہرے کرشنا" کا

جاپ جھوم جھوم کر کر رہی تھی۔ جیلر کو آتے دیکھ[illegible]ن نے کملا کو وہاں سے بھجوا دیا۔ جیلر کو اپنے سامنے بٹھایا اور بولی "سن بیٹا! شیراں والی ماتا کس[illegible]ں پر مہربان ہوتی ہے تو بڑا بھاگوان ہے کہ ماتا تجھ پر مہربان ہو گئی ہے اور وہ تجھے نہال کر[illegible] چاہتی ہے۔ راکھشش پر شیراں والی ماں کا منتر پورا ہو گیا ہے اب اس کی پیٹھ پر جو شیر کے پنجے کا نشان ہے وہاں سے خون نکال کر اُس کا تلک لگانا باقی ہے بس اس کے بعد تیرے گھر پر لکشمی دیوی اتر آئے گی اور شیراں والی کے حکم سے تیرے گھر چاند ایسے دو بیٹے باری باری پیدا ہوں گے جو تیرا نام روشن کریں گے تیری ترقی ہو جائے گی اور تیرے پاس اتنی دولت آ جائے گی کہ تجھ سے سنبھالی نہیں جائے گی"۔

جیلر بھاکڑی چونکہ شیر کے پنجے کے نشان کو قیدی کی پیٹھ پر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اس لیے وہ جوگن کا بے دام مرید ہو گیا تھا اور اس کی ہر بات کو سچ سمجھ رہا تھا بلکہ پتھر پر لکیر جان رہا تھا وہ اس کے آگے بچھا جا رہا تھا کہنے لگا: "ماتا! راکھشش ابھی آپ کے پاس تھا۔ آپ نے اس کا خون کیوں نہیں نکالا؟"۔

نجمی نے سر کو دائیں بائیں دو بار جھٹکا اور بولی "ماتا شیراں والی کا حکم ہے کہ اس راکھشش کا خون یہاں نہیں نکالا جائے گا۔ مجھے بتاؤ کیا اس شہر میں کوئی ایسی شمشان بھومی ہے جو شہر سے باہر کسی ویران جگہ پر ہو؟"

جیلر ایک لمحے کے لیے چپ سا ہو گیا۔ نجمی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی "میری بات کا جواب دو کیا تم شیراں والی ماں کا حکم نہیں مانو گے؟"۔

جیلر بھاکڑی ہاتھ باندھ کر بولا "ضرور مانوں گا میّا! ضرور مانوں گا۔"

نجمی نے [illegible]ت لہجے میں پوچھا "تو بتاؤ یہاں کوئی ایسی شمشان بھومی ہے جہاں لوگ اپنے مُردے جلاتے ہوں اور جو شہر سے باہر ویران جگہ پر بھی ہو جہاں کیکر کے درخت بھی ہوں"۔

نجمی کو معلوم تھا کہ جہاں ہندو لوگ اپنے مُردوں کو جلاتے ہیں وہاں عام طور پر کیکر کے دو چار بے ڈھنگے درخت ضرور ہو[illegible]ں۔ جیلر نے ایک سیکنڈ کے لیے غور کیا پھر بولا "ایسی شمشان بھومی ہے ماتا۔ یہاں سے دکن کی طرف رام تلائی کے پاس ویران جگہ پر ہے"۔

نجمی نے پر اعتماد انداز میں اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور کہا "تو پھر آج شام جب سورج دیوتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پچھم میں ڈوب جائے تو اس راکھشش کو اس شمشان بھومی میں لے چلو۔ مجھے ایک چاقو اور ایک کانسی کی کٹوری کی ضرورت ہوگی وہاں میں اسے ٹھنڈی چتا پر الٹا لٹا کر خود اپنے ہاتھ سے اس راکھشش کی پیٹھ سے خون نکال کر کٹوری میں ڈالوں گی اور پھر وہیں اس کا تلک لگاؤں گی۔ یہی شیراں والی ماں کا حکم ہے اس کے ساتھ ہی تجھ پر دولت اور خوشیوں کے دروازے کھل جائیں گے۔ کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟ اگر نہیں تو میں ابھی یہاں سے جا رہی ہوں۔ پھر تمھارا گھر نرگ کے راکھششوں کا ٹھکانہ بنے گا۔"

نجمی نے جیلر بھاکڑی کو ڈرانا ضروری خیال کیا تھا۔ جیلر سوچ رہا تھا وہ ایسے خطرناک قیدی کو جیل سے باہر کیسے لے جائے۔ دوسری طرف اسے اپنے گھر کی تباہی کا بھی خیال تھا اگر وہ جوگن ماتا کی شیر کے پنجے کے نشان والی کرامت نہ دیکھ چکا ہوتا تو شاید وہ قیدی کو باہر لے جانے سے انکار کر دیتا لیکن وہ خود اپنی آنکھوں سے بادل کی پیٹھ پر وہ نشان دیکھ چکا تھا جس کی پیش گوئی نجمی نے کی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ پولیس کی گارڈ ساتھ لے جائے گا یہ اس کے گھر کی تباہی اور خوشحالی کا معاملہ تھا وہ خود بھی ماتا شیراں والی کا مرید تھا۔ وہ نجمی کی ایک ایک بات پر یقین کر رہا تھا۔ اس نے کہا "میں تیار ہوں ماتا! میں تیار ہوں۔"

نجمی نے اطمینان کا سانس لیا کہنے لگی "بس اب جاؤ اور جب سورج دیوتا پچھم میں اتر جائے تو راکھشش کو شمشان میں پہنچا دینا میں بھی اس راکھشش کے ساتھ جاؤں گی ماتا شیراں والی کا یہی حکم ہے۔"

جیلر ادب سے پرنام کر کے چلا گیا سارا دن دفتر میں بیٹھا وہ یہی سوچتا رہا کہ اگر یہ بات باہر نکل گئی کہ وہ ایک خطرناک قیدی کو باہر لے گیا تھا تو کہیں اس کے خلاف محکمانہ کارروائی نہ شروع ہو جائے۔ آدمی چونکہ ضعیف الاعتقاد بھی تھا اور شیراں والی ماتا کا پجاری بھی تھا۔ اس لیے ساتھ ہی یہ بھی اسے خیال آتا کہ وہ یہ سب کچھ شیراں والی ماں کے حکم پر کر رہا ہے اور ماں اس کی ضرور حفاظت کرے گی لیکن حفظ ما تقدم کے طور پر اس نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ وہ اپنے خاص آدمیوں کو مسلح کر کے جیپ میں ساتھ بٹھا کر لے جائے گا اور جب تک جوگن ماتا قیدی کا خون نکالے گی اس کے آدمی شمشان میں برابر پہرہ دیتے رہیں گے اس نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ وہ قیدی کو ہتھکڑی

لگانے کے علاوہ اس کے پاؤں میں بیڑیاں بھی ڈال دے گا تاکہ اس کے بھاگ جانے کا امکان ہی باقی نہ رہے۔

نجمی نے سارا دن اندر ہی اندر بے چینی سے گزارا اسے دھڑکا لگا رہا کہ جیلر ملک راج بھاکڑی محکمے اور اپنے منصب سے متاثر ہو کر کہیں فیصلہ تبدیل نہ کر دے۔ اس نے زیادہ وقت اپنے کمرے میں ہی گزارا۔ کملا نے درمیان میں ایک دو دفعہ آ کر اس سے اپنے عاشق روپ کمار کے بارے میں بات کرنی چاہی مگر نجمی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے باہر بھیج دیا اور یہ ظاہر کیا کہ وہ گیان دھیان میں محو ہے۔ حقیقت میں اسے سورج غروب ہونے کا انتظار تھا۔ ستمبر کی آخری تاریخیں تھیں اور سورج غروب ہونے کے بعد اندھیرا جلدی ہو جاتا تھا۔ نجمی کو اپنے اوپر پورا اعتماد تھا کہ اگر وہ ایک بار بادل کو شمشان بھومی میں لے جانے میں کامیاب ہو گئی تو پھر وہ واپس امرتسر سنٹرل جیل میں نہیں آئے گا۔ خدا خدا کر کے دن ڈھلا اور سورج غروب ہونے لگا۔ ہلکا ہلکا اندھیرا چھا رہا تھا کہ باہر کوٹھی کے صحن میں کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ نجمی سمجھ گئی کہ جیلر بھاکڑی "راکھشش" بادل کو لے کر آگیا ہے اور ایسا ہی تھا۔ جیلر نے کمرے میں آ کر جوگن ماتا کو پرنام کیا اور کہا "ماتا! میں راکھشش کو لے آیا ہوں صرف اتنی بنتی کروں گا کہ شمشان میں زیادہ دیر نہ لگانا بس جاتے ہی خون نکال کر تلک لگا لینا۔"

نجمی نے اٹھتے ہوئے کہا "گھبراؤ نہیں شیراں والی ماں تیری رکھشا کرے گی مجھے رات کی سیاہی چھا جانے سے پہلے راکھشش کا خون نکال کر تلک لگا لینا ہے، ورنہ ماتا ناراض ہو جائے گی، چلو!"

نجمی نے باہر آ کر دیکھا کہ کوٹھی کے برآمدے کی بتی جل رہی تھی شام کا اندھیرا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ سامنے ایک جیپ کھڑی تھی۔ جیپ کے باہر دو مسلح سپاہی رائفلیں لیے پہرے پر کھڑے تھے۔ جیلر بولا "میرے ساتھ آگے پدھاریے ماتا راکھشش قیدی پیچھے بیٹھا ہے۔"

نجمی نے جیپ کے قریب سے گزرتے ہوئے اندر نگاہ ڈال کر دیکھا اندر بھی دو سپاہی بندوقیں لیے بیٹھے تھے۔ بادل ان کے درمیان بیٹھا تھا۔ نجمی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جیلر نے آہستہ سے کہا "ماتا! میں نے چاقو اور کٹوری اپنے پاس رکھ لی ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"شاباش! جے ماتا شیراں والی کی"۔

جیپ تیزی سے شمشان بھومی کی طرف چل دی۔ سرکاری جیپ شہر کی مصروف سڑکوں پر شام کے جھٹپٹے میں کم رفتار سے چل رہی تھی۔ بجمی نے جیلر سے کہا "ملک راج! تیز کرو اوپر مینہ برسنے والا ہے مگر جلدی چلو رات ہو گئی تو کام بگڑ جائے گا"۔

جیلر نے جیپ کی رفتار تیز کر دی اور جلدی جلدی جیپ کو ٹریفک کے ہجوم میں سے نکال کر جی ٹی روڈ پر لے آیا۔ اب رام تلائی والا شمشان زیادہ دور نہیں تھا۔ چند لمحوں میں وہ شمشان بھومی میں پہنچ گئے۔ ابھی رات نہیں ہوئی تھی۔ آسمان پر شفق سرخ سے گہری قرمزی ہو رہی تھی۔ شمشان بھومی کا بڑا دروازہ کھلا تھا یہ ایک ویران شمشان تھا۔ اندر نحوست اور ویرانی برس رہی تھی۔ جیلر نے جیپ ایک طرف کھڑی کر دی۔ بجمی نے پوچھا "یہاں کیکر کے درخت کہاں ہیں؟"

جیلر نے کہا "اندر ایک طرف لگے ہیں ماتا! میں نے دیکھ رکھے ہیں"۔ جب بادل کو جیپ میں سے نکالا گیا تو یہ دیکھ کر بجمی پریشان ہو گئی کہ بادل کو ہتھکڑی تو لگنی ہی تھی۔ مگر اس کے پاؤں میں بیڑیاں بھی پڑی ہوئی تھیں ایک لمحے میں اس کے ذہن نے اس کا توڑ بھی سوچ لیا اور جیلر سے کہا "اسے اندر لے جا کر اس جگہ الٹا لٹا دو جہاں مُردوں کو جلایا جاتا ہے"۔

جیلر نے مسلح سپاہیوں کو اشارہ کیا وہ شام کے اندھیرے میں بادل کو شمشان بھومی کے اندر لے گئے۔ دو سپاہی باہر پہرہ دیتے رہے اور دو اندر جیلر کے ساتھ آ گئے۔ بجمی یہ ساری کارروائی بڑی گہری نظر سے دیکھ رہی تھی اسے خوب معلوم تھا کہ کیا کرنا ہوگا۔ جب بادل کو چتا والے چبوترے پر لٹانے لگے تو بجمی نے آلتی پالتی مار کر چبوترے پر ایک طرف پہلے ہی بیٹھ گئی تھی اور "ہرے راما ہرے کرشنا" اور جے شیراں والی ماں کا ورد شروع کر دیا تھا بولی "ملک راج بیٹا! راکھشش کے دونوں بازو اور ٹانگیں پھیلانی بہت ضروری ہیں"۔

اس کے لیے ضروری تھا کہ بادل کی ہتھکڑی اور بیڑیاں کھول دی جائیں جیلر اس بار بھی کچھ جھجکا۔ بجمی نے کڑک کر کہا "میں جا رہی ہوں اب تم جانو اور ماں شیراں والی جانے....."

جیلر نے فوراً بادل کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کھلوا دیں اور اسے راکھ پر اس طرح الٹا لٹا دیا کہ اس کے دونوں بازو اور ٹانگیں پھیلی ہوئی تھیں۔ تب بجمی نے چاقو کھول کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا

کانسی کی کٹوری اپنے سامنے رکھ لی۔ بادل کی پیٹھ پر سے قمیص اوپر اٹھا دی اور زور زور سے "ہرے راما ہرے کرشنا" کا جاپ شروع کر دیا۔ دونوں مسلح سپاہی چند قدموں کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ جیلر بجمی کے قریب ہی ہاتھ باندھے موجود تھا وہ اندر سے بے حد پریشان تھا اور چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہو جوگن ماتا قیدی کی پیٹھ والے شیر کے پنجے کے نشان سے خون نکالے اور وہ اس کے فوراً بعد اسے دوبارہ بیڑیاں پہنا کر ہتھکڑی لگا دے۔ بجمی نے چاقو بادل کی ننگی پیٹھ پر زخم کے نشان پر رکھا ہی تھا کہ ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ہاتھ باندھ کر جیسے ہوا سے باتیں کرتے ہوئے بولی "جے ہو ماتا شیراں والی! تیری پجارن تیرے حکم کی پالن کر رہی ہے جی ماتا جی! جی ماتا جی! میں آپ کے پجاری کو آپ کے پاس بھیج رہی ہوں"۔

اس کے ساتھ ہی بجمی نے پلٹ کر جیلر کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی "دھن ہو دھن ملک راج! شیراں والی ماں تجھے درشن دینے تیرے گھر پر آ رہی ہے جتنی جلدی ہو سکے اپنے گھر پہنچو، شیراں والی ماں نے تجھے وہاں نہ پایا تو و[illegible] جائے گی"۔

جیلر ملک راج بھاکڑی اپنے فرض اور عقیدے کے دو پاٹوں میں بُری طرح پھنس گیا تھا گھبرا کر بولا "مگر ماتا! میں..... میں اس قیدی کو چھوڑ کر.....؟"

بجمی نے گرج کر کہا "نہیں جاؤ گے تو یہ شیراں والی ماں کا اپمان ہوگا۔ وہ تمہیں تیرے سارے خاندان کو بھسم کر دے گی۔ جلدی جاؤ تیرے آدمی قیدی کو لے آئیں گے"۔

جیلر عجیب الجھن میں مبتلا تھا وہاں سے جانا بھی نہیں چاہتا تھا اور وہاں رک بھی نہیں سکتا تھا۔ جب بجمی نے دھمکی دی کہ وہ واپس جا رہی ہے تو جیلر نے جلدی سے مسلح سپاہیوں کو قیدی کے سر پر کھڑے رہنے اور بھاگنے کی صورت میں اسے وہیں گولی مار دینے کی ہدایت کی اور تیز تیز قدم اٹھاتا شمشان سے باہر کی طرف چل دیا۔

جیپ میں بیٹھا اور اسے فل سپیڈ پر چھوڑ دیا کوٹھی پر پہنچتے ہی کملا نے پوچھا "جوگن ماتا کہاں ہے؟" جیلر نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا "شیراں والی ماتا نے درشن دیئے کیا؟"۔

کملا نے حیرانی سے پوچھا "یہ کیا کہہ رہے ہیں؟"

تب جیلر نے اسے سب کچھ بتایا اور کہا کہ ابھی تھوڑی دیر میں ماں شیراں والی درشن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دینے آٹے گی جلدی سے لوبان سلگاؤ۔ کملا نے اسی وقت لوبان سلگا کر کارنس پر رکھ دیا۔ اتنے میں نوکر نے آکر بتایا کہ آتمارام ایس ایچ او، علاقہ دربار صاحب ملنے آیا ہے۔ جیلر نے غصے میں کہا "اسے کہو صبح آفس میں آئے"۔

نوکر چلا گیا، ساتھ ہی واپس آگیا اور دبی زبان میں بولا: "صاحب جی! وہ کہتا ہے بڑا ضروری کام ہے"۔

جیلر ملک راج بھاکڑی نے دل میں آتمارام کو موٹی سی گالی دی اور نوکر سے کہا "اسے ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ"۔ شیراں والی ماتا نے درشن تو نہیں دیئے تھے مگر اس کی جگہ ایس ایچ او آتمارام آگیا تھا۔ جیلر جب ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو تھانے دار آتمارام ہاتھ میں ایک فائل لیے قدرے بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ جیلر صاحب کو دیکھتے ہی اس نے سلیوٹ کیا اور بولا "شما کیجیے گا حضور! میں غلط وقت پر آگیا ہوں"۔

جیلر نے کرخت لہجے میں پوچھا "جلدی بتاؤ کیا کام ہے میں اس وقت بڑا مصروف ہوں"۔

ڈرائنگ روم کی بتیاں روشن تھیں تھانے دار آتمارام نے فائل کھول کر جیلر بھاکڑی صاحب کی طرف بڑھا دی فائل کے صفحے پر ایک عورت کی تصویر لگی تھی یہ نجمی کی تصویر تھی اور نیچے لکھا تھا "چندا بائی"۔ اصل نام نجمی، مسلمان، چندا ڈاکو کے نام سے جانی جاتی ہے۔ قتل اور ڈکیتی کے جرم میں مطلوب ہے۔ پاکستانی جاسوسوں کے ساتھ اس کا رابطہ بھی ہے۔ کئی بار جیل توڑ کر فرار ہو چکی ہے"۔

تھانیدار آتمارام نے کہا "حضور! کیا آپ اس عورت کو پہچانتے ہیں؟"

جیلر کو نجمی کی فوٹو دیکھتے ہی ایسے لگا جیسے اس نے اس عورت کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے تھانے دار نے کہا "حضور! میں آپ کو یاد دلاتا ہوں آج صبح آپ اس عورت کے ساتھ سیتلا مندر گئے تھے۔ اس عورت نے جوگن کا بھیس بدل رکھا ہوا تھا"۔

جیلر کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی وہ جلدی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ تھانیدار اس کے سامنے بیٹھ گیا اور بولا "حضور! جب سے میں نے اس عورت کو جوگن کے بھیس میں آپ کے ساتھ دیکھا تب سے مجھے پریشانی لگی ہوئی تھی کہ اس عورت کو کہیں دیکھا ہے۔ دن بھر میں اسی الجھن میں

پھنسا رہا۔ شام کو جاکر مجھے خیال آیا کہ سیکرٹ ایجنٹوں کی فائل دیکھنی چاہیے پھر میں بھاگا بھاگا سی آئی اے آفس پہنچا وہاں سے فائل نکالی تو اس عورت کو میں نے غور سے دیکھا۔ حضور! اس عورت کے بالوں کو مونڈ ڈالیں، اسے گنجا کر دیں تو کیا یہ وہی جوگن نہیں ہے جو آپ کے ساتھ صبح سیتلا مندر آئی تھی"۔

جیلر ملک راج بھاکڑی کی آنکھیں فائل پر نجمی کی تصویر کو تک رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے، ہونٹ خشک ہو گئے تھے ایک سیکنڈ کے اندر اندر وہ ساری واردات کو سمجھ چکا تھا۔ مگر دستی بم کا پن نکل چکا تھا۔ بم کسی وقت بھی پھٹ سکتا تھا۔ اس نے فائل وہیں پھینکی اور تھانیدار آتمارام سے چلا کر کہا "میرے ساتھ آؤ"۔

جیلر ملک راج بھاکڑی دوڑتے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکل کر باہر کھڑی جیپ کے پاس آیا۔ تیزی دروازہ کھول کر اندر بیٹھا۔ جیپ اسٹارٹ کی اور تھانے دار آتمارام ابھی جیپ میں پوری طرح سوار بھی نہیں ہوا تھا کہ جیپ بجلی کی تیزی کے ساتھ کوٹھی سے نکل کر جیل کے بڑے دروازے کی طرف بڑھی۔ گارڈ نے جیلر صاحب کی جیپ کو دور سے آتے دیکھ کر جلدی سے آدھا دروازہ کھول دیا جیپ تیزی سے دروازے میں سے گزر کر رام تلائی والی شمشان بھومی کی طرف دوڑنے لگی۔ جیلر ملک راج بھاکڑی کا حلق کڑوا ہو رہا تھا۔ کنپٹیاں جل رہی تھیں۔ اسے نہ صرف اپنی نوکری جاتی نظر آرہی تھی بلکہ وہ اپنے آپ کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھی دیکھ رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بادل چتا پر بالکل سیدھا لیٹا تھا

نجمی جوگن کے بھیس میں اس کے پاس بیٹھی تھی۔ چاقو اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے باہر جیپ کی آواز سنی تو اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ بادل بھی سمجھ گیا کہ حملہ کرنے کا وقت آ گیا ہے دو سکھ سپاہی ان کے سر پر کھڑے تھے۔ نجمی نے انھیں کہا۔

"دیکھو باہر کس کی جیپ آئی ہے؟"

ان میں سے ایک سپاہی وہیں کھڑا رہا۔ دوسرا شمشان بھومی کے گیٹ کی طرف بڑھا۔ ابھی اس نے ایک قدم ہی اٹھایا ہو گا کہ نجمی نے زور سے چاقو اپنے پاس کھڑے سپاہی کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ بادل اچھل کر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس سے پہلے کہ زخمی سپاہی بندوق سے فائر کرتا اسے لات مار کر گرا دیا۔ چاقو سپاہی کے پیٹ کے اندر دھنسا ہوا تھا وہ وہیں شدید زخمی حالت میں پڑا رہا دوسرے سپاہی نے پلٹ کر دیکھا بادل نے اس پر فائر کر دیا گولی اس کی گردن چیرتی ہوئی گزر گئی۔ اب جیلر بھاکڑی کی جیپ شمشان بھومی میں داخل ہو گئی تھی وہ فائر کی آواز سے سمجھ گیا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ جیپ ایک دم رکی وہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ چھلانگ لگا کر جیپ سے کودا۔ اب ایک بندوق نجمی کے ہاتھ میں بھی تھی۔ بادل اور نجمی نے جیلر بھاکڑی اور اس کے سپاہیوں پر اندھا دھند گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ ان کے نشانے کبھی خطا نہیں گئے تھے۔ دیکھتے دیکھتے شمشان بھومی میں لاشیں بچھ گئیں۔ نجمی نے چلا کر کہا۔

"بادل جیپ میں بیٹھو۔"

چند لمحوں کے بعد ان کی جیپ رام تلائی کی شمشان بھومی سے نکل کر جی ٹی روڈ پر جالندھر کی

طرف دوڑ رہی تھی۔ شام کا اندھیرا رات کی سیاہی میں تبدیل ہونے لگا تھا۔ بادل نے کہا۔

"ہمیں یہاں سے اپنا رُخ بٹالہ گورداس پور کی طرف موڑ دینا چاہیے۔ یہ مین لائن ہے ہم جالندھر پہنچنے سے پہلے ہی گرفتار کر لیے جائیں گے۔"

اور بادل نے بجلی والی نہر پر جا کر جیپ کو نہر کے کنارے بٹالہ کی طرف ڈال دیا۔ بادل اس علاقے سے واقف ہو چکا تھا۔ بٹالہ ابھی دور تھا کہ وہ گورداس پور کی طرف ہو گیا۔ نجمی نے کہا۔

"تم کس طرف جانا چاہتے ہو؟ خطرہ تو ادھر بھی ہو گا۔"

بادل بولا "پولیس کو کچھ دیر بعد جیلر اور دوسرے سپاہیوں کے قتل کی خبر ہو گی وہاں کوئی زندہ نہیں بچا تھا۔"

اب رات ہو گئی تھی۔ جیپ گورداس پور سے آگے نکل چکی تھی۔ اب وہ نیم پہاڑی علاقے سے گزرتے ہوئے سجان پور کی طرف جا رہی تھی۔ بادل نے نجمی کو بتایا کہ اسے دلی کی بجائے واپس جموں ہی جانا چاہیے۔ وہ وہاں سے اس کو بارڈر کراس کروانے کی بہتر کوشش کر سکتا ہے۔ نجمی نے اس سے کہا کہ ندیم پاکستان سے واپس آیا ہوا ہے اور اس کی اطلاع کے مطابق وہ دلی میں مقیم ہے۔ بادل نے کہا۔

"تمھارا دلی جانا کسی طرح بھی مناسب نہیں تم جموں میں لال دین کے پاس ٹھہرو گی میں دلی جا کر ندیم کو بھی وہاں سے نکال لاؤں گا اس نے واپس آ کر بڑی حماقت کی ہے۔"

نجمی خاموش ہو گئی۔ راتوں رات وہ سجان پور پہنچ گئے۔ یہاں انھوں نے جیپ کی ٹینکی پٹرول سے بھروائی اور اب ان کا رخ کٹھوہا کی طرف تھا۔ راستے میں انھیں کسی نے چیک نہ کیا۔ نیم پہاڑی سڑکیں ویران تھیں۔ بادل نے کٹھوہا سے جیپ کو ایک دوسرے پہاڑی راستے پر ڈال دیا اور رات کے پچھلے پہر اسے دور سے جموں شہر کی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ اس نے جیپ کو دوبارہ ایک نسبتاً پکی سڑک پر ڈال دیا یہ سڑک جموں کے دریائے توی کو بہت پیچھے سے کراس کر کے دوسری جانب سے ہوتی ہوئی اس علاقے کی طرف نکل جاتی تھی جہاں لال دین کا محلہ تھا۔ بادل کے نزدیک لال دین کے گھر سے زیادہ اور کوئی جگہ محفوظ نہیں تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جموں شہر میں داخل ہونے کے بعد بادل بہت محتاط ہوگیا تھا۔ نجمی نے اگرچہ جوگنوں والا بھیس بدل رکھا تھا اور اس کا سر بھی منڈا ہوا تھا۔ پھر بھی پولیس کی پوچھ گچھ خطرناک صورت اختیار کرسکتی تھی کیونکہ اب تک اس علاقے کی پولیس کو بھی نجمی کے حلیے کے بارے میں یقیناً خبردار کردیا گیا تھا۔ بادل نے ایک جگہ سڑک کے کنارے جیپ کو دریا کے قریب کھڑا کردیا اور نجمی سے کہا۔

"نیچے اتر آؤ میں جیپ کو دریا میں پھینکنے لگا ہوں کیونکہ یہ جیپ امرتسر جیل کی ہے اور یہ ہمیں یہاں گرفتار کروا سکتی ہے"۔

نجمی نیچے اتر آئی بادل رات کے پچھلے پہر کے اندھیرے میں جیپ کو تھوڑا چلا کر دریائے توی کے کنارے پر لے آیا۔ یہاں ڈھلان تھی دریائے توی کا پانی پتھروں سے ٹکراتا تیزی سے گزر رہا تھا۔ اس نے جیپ کو ڈھلان پر لا کر پیچھے سے دھکیل دیا۔ جیپ ڈھلان پر تیزی سے گزرتی ہوئی ایک ہلکے سے دھماکے کے ساتھ دریا میں جا گری اور دیکھتے ہی دیکھتے دریا کے پانی نے اسے نگل لیا"۔

اس کے بعد بادل نے نجمی کو ساتھ لیا اور محلہ استاداں کی طرف روانہ ہوگیا۔ لال دین کا مکان اسی محلے میں تھا۔ جموں شہر کا علاقہ بھی رات کے پچھلے پہر سنسان تھا۔ مکانوں میں روشنیاں کہیں نہیں ہورہی تھیں۔ صرف سڑک کی بتیاں روشن تھیں۔ گلی کے کونے پر آکر بادل نے نجمی کو ایک طرف مکان کی دیوار کے ساتھ اندھیرے میں کھڑا کردیا اور کہا۔ "میں لال دین کو اطلاع دینے جاتا ہوں تم اسی جگہ رہنا"۔

نجمی اندھیرے میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے جوگنوں والا لباس پہن رکھا تھا۔ گلی اور بازار سنسان تھے دور ایک ٹرک پل پر سے گزرا اس کی آواز آئی تو نجمی نے پل کی طرف دیکھا۔ پل پر ٹرک کی روشنی تھوڑی دیر تک نظر آتی رہی پھر غائب ہوگئی۔ دس منٹ بڑی مشکل سے گزرے۔ تب بادل گلی میں دکھائی دیا اس نے آتے ہی کہا۔

"لال دین کو میں نے سب کچھ سمجھا دیا ہے میرے ساتھ آؤ"۔

"لال دین نے پہلے تو نجمی کو بالکل نہ پہچانا پھر کہنے لگا" تم تو بالکل جوگن بن گئی ہو"

پھر اس نے بادل سے کہا۔

"آج کی رات تم لوگ اسی جگہ چھپے رہو۔ کل میں تم لوگوں کا کسی دوسری جگہ بندوبست کردوں گا وہاں سے تم بے شک دلی چلے جانا۔ نجمی اس جگہ بالکل محفوظ رہے گی"۔

وہاں انھوں نے رات کا بچا ہوا تھوڑا بہت کھانا کھایا اور سو گئے ساری رات کے تھکے ہوئے تھے ایسے سوئے کہ دوسرے دن دو بجے دوپہر کو آنکھ کھلی۔ لال دین باہر سے مکان کو تالا لگا کر جاچکا تھا اس نے بادل کو سمجھا دیا تھا کہ پیچھے مکان میں کیسے رہنا ہے۔ انھوں نے مکان کی کھڑکیاں بند ہی رکھیں۔ نجمی نے کچن میں جاکر چائے اور ٹوسٹ وغیرہ بنائے۔ وہیں بیٹھ کر اس نے اور بادل نے ناشتہ کیا۔

نجمی نے پوچھا۔

"تم دلی کب جاؤ گے اور ندیم کو کہاں تلاش کروگے؟"

بادل کہنے لگا "تمھاری اطلاع کے مطابق ندیم دلّی میں حضرت نظام الدین کی درگاہ کے آس پاس کہیں چھپا ہوا ہے اس نے تمھیں یہی پیغام پہنچایا ہے۔ میں اسے تلاش کرلوں گا، تم بے فکر رہو"۔

نجمی خاموشی سے چائے پی رہی تھی، کہنے لگی۔

"تمھارا خیال ہے کہ ہم جموں کشمیر کی سرحد سے ہندوستان کا بارڈر کراس کرسکیں گے؟ تم نے ہی بتایا تھا کہ یہاں کے حالات بہت سنگین ہیں اور بارڈر پر فوج موجود ہوگی"۔

بادل نے کہا "اس میں کوئی شک نہیں کہ فوج بارڈر پر موجود ہے لیکن لال دین کا ایک دوست ہمارے کام آئے گا وہ تمھیں کشمیر کی پہاڑیوں میں کسی جگہ سے بارڈر کراس کرادے گا لیکن سب سے پہلے ندیم کا یہاں پہنچنا بہت ضروری ہے"۔

نجمی نے چائے کی پیالی تپائی پر رکھ دی۔

"ندیم نے یہاں واپس آکر ہمیں نئی مشکل میں پھنسا دیا ہے"۔ بادل نے دبی آواز میں کہا "اس نے جذبات میں آکر ایسا کیا ہے اصل میں وہ تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا"

نجمی نے گہری سانس بھر کر چھت کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا اور بولی "یہ باتیں اب مجھے بچوں جیسی لگتی ہیں۔ بہرحال تم کب دلی جاؤ گے؟ لال دین تو میرا خیال ہے آج شام ہوجانے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی ہمیں کسی دوسری جگہ پر لے جائے گا۔"

بادل نے کہا "اگر لال دین تمھیں آج شام یا رات کو کسی دوسری پناہ گاہ میں پہنچا دیتا ہے تو میں پچھلے پہر کی گاڑی پکڑ کر روانہ ہو جاؤں گا۔"

"تم ٹرین میں جاؤ گے؟" نجمی نے پوچھا "ٹرین میں تو خطرہ زیادہ ہوگا۔"

بادل نے گردن کو آہستہ سے جھٹک کر کہا۔

"خطرہ کہاں نہیں ہے نجمی؟ ہماری، خاص طور پر میری ساری زندگی خطروں کا مقابلہ کرتے ہی گزر گئی ہے۔ ویسے تم فکر نہ کرو میں انشاءاللہ خیریت کے ساتھ دلی پہنچ جاؤں گا اور ندیم کو بھی وہاں سے نکال کر یہاں لے آؤں گا۔"

نیچے مکان کا تالا کھولنے کی آواز آئی بادل بولا "لال آگیا ہے؟"۔

دونوں خاموش ہو گئے۔ کسی نے دروازہ اندر سے بند کر کے کنڈی لگا دی۔ پھر سیڑھیوں میں قدموں کی آواز آئی اور لال دین نمودار ہوا آتے ہی بولا۔ "سارا انتظام ہو گیا ہے۔"

پھر لال دین نے انھیں بتایا کہ ان کو اسی رات جموں شہر سے نکل کر کشمیر روڈ پر کوئی ساٹھ میل آگے ایک گاؤں میں جا کر رہنا ہوگا۔ جہاں لال کا ایک پرانا اسمگلر دوست اپنی حویلی میں رہتا ہے لال کہہ رہا تھا۔

"وہاں سے بارڈر دس میل دور پہاڑیوں میں ہے میرا دوست اس سارے علاقے کے چپے چپے سے واقف ہے پہلے تو وہ حامی نہیں بھر رہا تھا لیکن پھر میں نے اسے راضی کر لیا۔ نجمی اب تم یہ جوگنوں والا لباس اتار کر شلوار قمیض پہن لو۔ تمھاری ایک شلوار قمیض میرے پاس امانت کے طور پر پڑی ہے میں وہ تمھیں لائے دیتا ہوں۔"

نجمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ جوگنوں والا لباس اتار کر شلوار قمیض پہن چکی تھی۔ اس نے ماتھے پر لگا ہوا تلک بھی دھو کر صاف کر لیا تھا۔ سر پر اس نے رومال باندھ کر اوپر دوپٹہ لے لیا تھا۔ رات کو لال دین دوبارہ مکان کو باہر سے تالا لگا کر چلا گیا واپس آیا تو مچھلی اور نان ساتھ لایا تھا۔ ان سب نے مل کر کھانا کھایا۔ لال دین کہنے لگا۔

"بادل یہاں اب میری نگرانی کچھ کم ہوئی ہے اس لیے میں بہت زیادہ محتاط ہوں اگر مجھ سے

کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو تم اور نجمی مجھے معاف کر دینا۔"

بادل نے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے لال دین! تم نے ہمارے ساتھ جو دوستی کا بہترین سلوک کیا ہے اسے میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

لال بولا "اس وقت رات کے نو بج رہے ہیں۔ بارہ بجے رات گلی کے باہر ایک ٹرک آ کر رُکے گا اس پر پرالی لدی ہوگی تم دونوں کو اس پرالی میں گھس کر چھپ کر جانا ہوگا۔"

نجمی نے بادل سے کہا "تمھیں میرے ساتھ جانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ بادل میں اکیلی ہی چلی جاؤں گی۔"

لال بولا "میں تمھارے ساتھ ہوں گا تم اکیلی نہیں ہوگی میں تمھیں خود اپنے دوست کے پاس چھوڑ کر آؤں گا۔"

نجمی کہنے لگی "بس ٹھیک ہے پھر بادل کو میرے ساتھ جانے کی کیا ضرورت ہے تم یہاں سے دلّی کی طرف روانہ کیوں نہیں ہو جاتے۔"

لال دین پوچھنے لگا "تم دِلّی کیسے جاؤ گے؟"

بادل بولا "میرا خیال ہے میں جالندھر جانے والی صبح کی گاڑی پکڑ دوں گا۔ جالندھر سے مجھے فرنٹیئر میل مل جائے گی۔"

لال نے کہا۔ "کیا تم ٹرین کے سفر میں محفوظ ہو گے؟ جالندھر اور امرتسر کا علاقہ تمھارے لیے بہت خطرناک ہے۔"

بادل بولا "کون سا علاقہ میرے لیے خطرناک نہیں ہے؟ جب نجمی میرے ساتھ ہو تو پھر قدم قدم پر مجھے خطرے کا احساس ضرور رہتا ہے اب تو میں اکیلا ہوں۔ میں حالات کو سنبھال لوں گا فکر نہ کرو انشاءاللہ دلّی پہنچ جاؤں گا۔"

آخر میں طے ہوا کہ نجمی رات کو لال دین کے ساتھ جموں کشمیر کے پہاڑی علاقے کی طرف روانہ ہو جائے گی اور بادل جموں شہر کے ریلوے سٹیشن سے جالندھر جانے والی گاڑی پکڑے گا نیند کسی کو بھی نہیں آ رہی تھی۔ رات گیارہ بجے تک وہ بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کمرے کی بتی انھوں نے بجھا رکھی تھی۔ باتیں بھی وہ اونچی آواز سے نہیں کر رہے تھے۔ جب رات کے بارہ بجے تو لال دین ٹرک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھنے اٹھ کر بازار کی طرف چل دیا۔ ابھی تک ٹرک نہیں پہنچا تھا وہ ایک بند دکان کے پھٹے پر چادر اوڑھ کر لیٹ گیا اس خیال سے کہ اگر کسی نے دیکھا بھی تو یہی سمجھے گا کہ کوئی مسافر سو رہا ہے۔ اتنے میں اسے ٹرک کی آواز آئی۔

آواز گلی کے نکڑ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ لال دین اٹھ بیٹھا ٹرک کی روشنیاں بجھی ہوئی تھیں وہ گلی کے نکڑ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ لال دین نے آگے بڑھ کر دیکھا۔

رحمت ڈرائیور نے کھڑکی میں سے سر نکال کر لال دین سے پوچھا "کاکا مال تیار ہے تو پیچھے رکھوا دو"۔

رحمت ڈرائیور کو بھی معلوم تھا اس کے مالک یعنی اس علاقے کے مشہور اور زبردست اسمگلر بلّے کے کوئی مہمان ہیں جنھیں لے کر ڈیرے پہنچانا ہے۔

لال دین نے آہستہ سے کہا "ابھی لاتا ہوں"۔

ٹرک کی آواز نجمی اور بادل نے بھی سن لی تھی اور سنبھل کر بیٹھ گئے تھے۔

لال نے آکر بتایا کہ ٹرک آگیا ہے۔

بادل نے نجمی سے کہا "خدا حافظ نجمی! پریشان مت ہونا میں ندیم کو لے کر ہی آؤں گا اور انشاءاللہ ضرور آؤں گا اب تم جاؤ"۔

نجمی نے کوئی جواب نہ دیا اور لال دین کے ساتھ سیڑھیاں اُتر کر گلی میں آگئی باہر اندھیرے میں ٹرک موجود تھا اس کے پیچھے پرالی لدی ہوئی تھی۔ رحمت ڈرائیور نے پہلے ہی اس کے اندر بیٹھنے کی جگہ بنا دی تھی۔ نجمی اس کے اندر گھس کر بیٹھ گئی۔

لال دین اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے پاس بیٹھ گیا۔ ٹرک سری نگر کشمیر روڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔ توی دریا کے پُل پر پولیس ضرور موجود تھی مگر پرالی سے لدے ہوئے ٹرک کی کیا چیکنگ ہو سکتی تھی۔ ٹرک پُل پر سے گزر گیا اور کھلی سڑک پر روانہ ہو گیا۔ پُل سے نکلتے ہی ٹرک نے اسپیڈ پکڑ لی لال دین نجمی کو بہت جلد اپنے دوست بلّے کے پاس پہنچانا چاہتا تھا کیونکہ اسے واپس آکر بادل کو بھی رخصت کرنا تھا۔ رحمت ڈرائیور بڑا ماہر اور تجربے کار ڈرائیور تھا۔ ٹرک کی بتیاں روشن تھیں۔ ٹرک خالی تھی ٹرک پوری رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ نجمی ٹرک کے پیچھے پرالی کے اندر اپنے آپ کو

سمیٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ پرالی میں لوہے کی سلاخوں سے اوپر ایک چھوٹی سی چھت ڈال دی گئی تھی۔ اس کی وجہ سے نجمی کے اوپر پرالی نہیں گر رہی تھی اسے دھچکے ضرور لگ رہے تھے، کیونکہ ٹرک کافی رفتار سے جا رہا تھا۔ ایک مقام پر آکر رحمت ڈرائیور نے ٹرک کو بائیں طرف موڑ دیا۔

یہ ایک کچی سڑک تھی جس پر سنگریزے بکھرے ہوئے تھے یہاں اس نے ٹرک کی رفتار دھیمی کر دی۔ اب بلّے سمگلر کا ڈیرہ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا۔ ٹرک کبھی کسی ٹیلے کے پہلو سے ہو کر اور کبھی دو ٹیلوں کے درمیان سے ہو کر گزر رہا تھا ایک جگہ ٹرک نے ٹیلے کا موڑ کاٹا تو ایک آدمی ٹیلے کے پیچھے سے نکل کر سامنے آگیا۔ اس نے رائفل تان رکھی تھی۔

رحمت ڈرائیور نے سر باہر نکال کر کہا "میں ہوں رحمت اوئے یارا!"

وہ آدمی ایک طرف ہو گیا ٹیلے کی دوسری طرف دھریک اور پیپل کے درختوں کے پاس ایک پرانی حویلی تھی جس کے باہر ایک کمزور سا بلب جل رہا تھا۔ ٹرک رک گیا۔

رحمت اور لال جلدی سے پیچھے آئے انھوں نے پرالی کو آگے سے ہٹایا۔ نجمی اپنے کپڑوں سے لگی ہوئی تنکے جھاڑتی ٹرک سے نیچے اتر آئی۔

لال نے پوچھا "تکلیف تو نہیں ہوئی نجمی؟"

نجمی نے جواب دینے کی بجائے نفی میں سر ہلا دیا اور حویلی کے دروازے کی طرف دیکھا جو اب کھل گیا تھا اور اس کے اندر سے ایک درمیانے قد اور گٹھے ہوئے بدن والا آدمی کاندھے پر شال ڈالے آنکھیں ملتا ہوا باہر نکل رہا تھا۔ لال دین نے آگے بڑھ کر کہا۔

"میں ہوں لال دین! بلّے سے کہو مال آگیا ہے"۔

مال کا لفظ سن کر نجمی کا ماتھا ٹھنکا۔ کہیں لال دین کی نیت تو نہیں بدل گئی۔ کہیں اسے ان اسمگلروں کے ہاتھوں فروخت تو نہیں کیا جا رہا؟ اس نے وہیں سوچ لیا کہ اگر ایسی بات ہوئی تو لال دین کا خون سب سے پہلے کرے گی۔ لیکن ایسی بات نہیں تھی۔ آدمی اندر چلا گیا۔ لال دین بھی نجمی کو حویلی میں لے آیا۔ بائیں جانب ایک کوٹھری کھول دی گئی۔ وہاں چارپائی اور کمبل پڑا تھا۔

لال نے کہا "تم یہاں آرام کرو میں بادل کو رخصت کرکے آتا ہوں۔ مجھے مکان پر تالا بھی لگانا ہے"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یہاں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس جگہ کو لال دین کے چچا کا گھر ہی سمجھو۔ میں صبح ہونے سے پہلے پہلے آجاؤں گا۔ ویسے بلے سے بھی تمھاری ملاقات صبح کو ہی ہوگی۔"

لال دین چلا گیا تجمی نے اٹھ کر اندر سے کنڈی لگا لی اور چارپائی پر کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔ اسے کئی طرح کے خیال آرہے تھے مگر وہ ان سب کو سلا کر خود بھی سو گئی۔

لال دین جب اسی ٹرک میں واپس جموں پہنچا تو پو پھوٹ رہی تھی مندروں میں سے گھنٹیوں کی آوازیں آنا شروع ہوگئی تھیں۔ اور ایک مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ لال نے مکان کا تالا کھولا اور اوپر والی منزل میں آگیا۔ بادل سو رہا تھا۔ اس نے بادل کو جگایا اور کہا "کیا آج دلی جانے کا ارادہ نہیں ہے؟"

بادل جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھا اور آنکھیں ملتے ہوئے بولا۔

"ابھی ٹرین جانے میں پورا آدھا گھنٹہ ہے۔"

لال نے کہا "تمھیں ایک گھنٹہ پہلے نکلنا چاہیے تھا اب جلدی کرو۔ تجمی کو میں نے اپنے دوست کے ڈیرے پر پہنچا دیا ہے۔ آج دن کو میں بھی وہاں پہنچ جاؤں گا۔ اب تجمی کو ندیم کا انتظار رہے گا۔ جس دن ندیم آگیا میں ان دونوں کو بارڈر کراس کرا دوں گا۔ ساری باتیں بلے سے طے ہو چکی ہیں۔"

بادل نے جلدی جلدی منہ ہاتھ دھویا اور کمبل کندھے پر رکھتے ہوئے لال دین سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"لال! تم میری خاطر جو کچھ کر رہے ہو اسے میں ساری زندگی فراموش نہیں کروں گا۔"

لال نے بادل کو گلے سے لگا لیا اور بولا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو بادل! ہم یاروں کے یار ہیں اب تم جلدی سے اسٹیشن کا راستہ پکڑو چاروں طرف سے چوکس رہنا۔"

بادل نے ایک بار پھر گرمجوشی سے لال سے ہاتھ ملایا اور بولا "میں جلد سے جلد ندیم کو لے کر یہاں پہنچنے کی کوشش کروں گا۔"

لال نے تاکید کرتے ہوئے کہا۔

"کوشش کرنا کہ یہاں رات کے وقت آؤ اس وقت میں گھر پر ہی ہوں گا۔"

بادل خدا حافظ کہہ کر تیزی سے سیڑھیاں اتر کر گلی کے اندھیرے میں گم ہوگیا اسٹیشن یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا ابھی دن بھی نہیں چڑھا تھا پچھلے پہر کا اندھیرا آہستہ آہستہ دور ہو رہا تھا۔ بادل اس اندھیرے میں ہی تیز تیز چلتا چلا جارہا تھا۔ ایک جگہ بازار میں اسے رکشا مل گیا۔ وہ رکشے میں بیٹھ گیا اسٹیشن پر کافی رش تھا اسٹیشن کی بتیاں جل رہی تھیں۔ ایک ریل گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی بادل نے سر پر کمبل لپیٹ رکھا تھا کیونکہ یہاں کافی سردی تھی۔ ویسے بھی سردی کا موسم شروع ہوچکا تھا۔ بادل نے ٹکٹ خریدا اور پلیٹ فارم پر آگیا۔ یہی گاڑی جالندھر جارہی تھی۔ یہ نئی نئی چلی تھی اور جموں سے گورداس پور بٹالہ اور امرتسر ہوتی ہوئی جالندھر جاتی تھی۔ پہلے امرت سر سے ٹرین بدلنی پڑتی تھی۔"

ٹرین میں روشنی تھی۔ بادل بھی ایک ڈبے میں گھس کر مسافروں کے بیچ میں بیٹھ گیا۔ پلیٹ فارم پر پولیس کے دو تین سپاہی بھی جیسے نیند میں چل پھر رہے تھے۔ ٹرین جموں ہی سے تیار ہوتی تھی ٹھیک وقت پر چل پڑی۔ اب ایک لمبا سفر سامنے تھا۔ بادل نے بھی فیصلہ کیا تھا کہ وہ ٹرین ہی سے سفر کرے گا اور جالندھر پہنچ کر دلی جانے والی ٹرین ہی پکڑے گا۔ گورداسپور پہنچنے سے پہلے پہلے صبح ہوگئی تھی دن نکل آیا تھا۔ مسافروں میں کچھ سکھ بھی تھے۔ بادل نے باری باری سب مسافروں کا جائزہ لیا۔ اس کے اندازے کے مطابق ان میں خفیہ پولیس کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ ٹرین امرتسر کی طرف چلی جارہی تھی۔

دوسری طرف تجمی بھی صبح ہوئی تو اٹھ بیٹھی اس کی کوٹھری میں روشن دان سے دھوپ آرہی تھی۔ وہی درمیانے قد کا گٹھے ہوئے جسم والا آدمی دروازے پر آکر بولا۔

"بی بی! دن چڑھ آیا ہے، میں چائے لایا ہوں۔"

لال دین ابھی تک نہیں پہنچا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ جب بادل کو اسٹیشن کی طرف روانہ کرنے کے بعد وہ چارپائی پر یوں ہی کمر سیدھی کرنے کی خاطر لیٹا تو اس کی آنکھ لگ گئی اور ایسا سویا کہ جب آنکھ کھلی تو دن نکل آیا تھا فوراً اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور ٹیکسی پکڑ کر بلے کی حویلی کی طرف روانہ ہوگیا اب وہ ٹیکسی کو حویلی تک نہیں لا سکتا تھا مجبوراً اس نے ٹیکسی پہاڑیوں والی کچی سڑک پر ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھوڑنی پڑی اور وہاں سے پیدل چل پڑا۔

نجمی نے پوچھا۔

"لال چچا کہاں ہے؟"

باہر سے جواب آیا: "وہ ابھی نہیں پہنچا تم چائے پی لو، کوئی بات ہو گئی ہوگی، آتا ہی ہوگا۔"

نجمی نے دروازہ کھول دیا، چائے کی پیالی پکڑی اور کہا

"لال چچا آئے تو مجھے خبر کر دینا۔"

وہ آدمی چلا گیا۔ نجمی چارپائی پر بیٹھے چائے پیتے ہوئے سوچنے لگی کہ کہیں کوئی ناخوشگوار حادثہ تو نہیں ہو گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ پولیس نے چھاپہ مار کر بادل اور لال دونوں کو پکڑ لیا ہو۔ نجمی خاموشی سے چائے پیتی رہی اب یہ چھاپے اور گرفتاریاں اس کے لیے معمولی بات ہو کر رہ گئی تھیں۔ ابھی اس نے چائے ختم ہی کی تھی کہ لال دین بھی آ گیا تھکاوٹ سے اس کا بُرا حال ہو رہا تھا کم از کم چھ میل پہاڑی راستوں پر پیدل چلنا پڑا تھا۔ آتے ہی چارپائی پر گر پڑا۔ ساری بات نجمی کو سنائی تو وہ ہنس پڑی۔

"چچا تم تھکے ہوئے تھے نیند آ گئی بادل تو چلا گیا تھا نا؟"

"اس کو خدا حافظ کہہ کر ہی تو میں ذرا کمر سیدھی کرنے لیٹا تھا کہ بے ہوش ہو کر سو گیا۔"

لال نے نجمی کو وہیں بیٹھی رہنے کی تلقین کی اور خود اٹھ کر حویلی میں چلا گیا۔ اسے پتہ چلا کہ بلا بارڈر کے کسی گاؤں گیا ہوا ہے بس آنے ہی والا ہوگا۔ لال نے منہ ہاتھ دھویا چائے پی اور نجمی کی کوٹھڑی میں آ گیا۔

"بلا رات کا باہر گیا ہوا ہے ابھی آنے والا ہے میں تمہاری اس سے ملاقات کروا کر جاؤں گا۔"

نجمی نے کہا: "لال چاچا! مجھے یہاں کتنے دن رہنا پڑے گا؟"

لال بولا: "یہ تو بادل کے واپس آنے پر منحصر ہے اگر وہ کل آ جاتا ہے تو میں بلے سے کہہ کر پرسوں رات کو تمہیں بارڈر کراس کرا دوں گا۔"

نجمی نے سر جھکا لیا اور اپنے اوپر کمبل کرتے ہوئے بولی: "میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے یہاں۔"

لال مسکرایا۔

"ارے اسلحے کی یہاں تمہیں کیا ضرورت ہے تو میرے دوستوں کی حویلی میں بیٹھی ہے۔ ان لوگوں کے پاس تمہاری حفاظت کرنے کے واسطے بے پناہ اسلحہ ہے۔"

باہر جیپ کی آواز آئی لال اٹھتے ہوئے بولا۔

"بلا آ گیا ہے میں ابھی اسے یہاں لاتا ہوں۔"

لال جلدی سے باہر نکل گیا۔

نجمی نے دروازہ بند کر لیا اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں کے بعد بھاری جوتوں کی آواز قریب آتی سنائی دی پھر دروازے پر لال دین نے دستک دیتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

"نجمی! دروازہ کھولو بچی۔"

نجمی نے دروازہ کھول دیا اور چارپائی کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ کوٹھری میں لال کے ساتھ ایک اونچے قد کا چوڑا چکلا مگر ذرا پکی عمر کا سرخ و سپید آدمی داخل ہوا۔ اس کے کاندھے سے سٹین گن لٹک رہی تھی۔ کمر میں میگزین کی پیٹی بندھی ہوئی تھی سر پر نیلا رومال رکھا ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی نوکیلی مونچھیں تھیں اس نے نجمی کی طرف اپنی ہلکی ہلکی نیلی آنکھوں سے گھور کر دیکھا اور کہا۔

"یہاں تمہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی آرام سے رہو۔"

یہ کہہ کر وہ کوٹھری سے نکل گیا، لال بھی اس کے ساتھ ہی چلا گیا۔

نجمی کو یہ اسمگلر بڑا عجیب سا لگا۔ اس کی شخصیت دیکھ کر نجمی نے کم از کم یہ اندازہ ضرور لگا لیا تھا کہ وہ دلیر آدمی ہے اور اسے اور ندیم کو بارڈر کراس کرا دے گا۔ اسمگلر عام طور پر کمزور ہوتے ہیں لیکن یہ آدمی اسمگلر سے زیادہ ڈاکو لگتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد لال بھی آ گیا کہنے لگا۔

"بلے سے ایک بار پھر ساری بات ہو گئی ہے وہ کہتا ہے کہ اگرچہ بارڈر پر حالات تشویشناک ہیں مگر میں ان دونوں کو کسی نہ کسی طرح بارڈر کراس کرا دوں گا۔"

نجمی نے لال سے پوچھا:

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا تم نے اسے میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔"

لال دین کہنے لگا۔

"سب کچھ تو نہیں بتایا ہاں اتنا ضرور بتا دیا ہے کہ تم ایک دلیر عورت ہو، ندیم سے بیاہ کرنا چاہتی ہو پاکستان جا کر! اور دونوں تم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو اور ندیم صرف تمھیں لینے بارڈر کراس کر کے یہاں آیا تھا۔ باقی اگر بلّے کو اپنے مخبروں کی زبانی کچھ علم ہو گیا ہو تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ یہاں کوئی ایسا آدمی نہیں آ سکتا جس کے بارے میں بلّے کو خود سب کچھ معلوم نہ ہو یا اسے اس کے مخبروں نے نہ بتا دیا ہو۔"

نجمی لال دین کو تکتی رہی پھر بولی:

"چاچا تمھارا کیا خیال ہے ندیم دلی میں ہی ہو گا؟"

لال نے کہا۔

"ہمیں تو یہی اطلاع ملی تھی کہ وہ دلی میں ہے اور خواجہ نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے آس پاس ہی کسی جگہ چھپا ہوا ہے۔"

نجمی نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

"اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا اب خدا کرے کہ وہ وہیں پر ہو اور بادل کو مل جائے"

لال مسکرا کر بولا۔

"بادل بڑا کائیاں اور تجربے کار آدمی ہے وہ ندیم کو زمین کے اندر سے بھی کھینچ لائیگا۔"

"ویسے اس کا جیل سے بچ نکلنا بھی ایک معجزہ ہی ہے۔ اگر تم اس کی مدد نہ کرتیں تو اسے پھانسی کے تختے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی تھی"۔

نجمی نے کہا۔

"خدا کو یہی منظور تھا میں نے اس پر کوئی احسان نہیں کیا۔ بادل نے میرے لیے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں چاچا۔ میرا خیال ہے کہ وہ جالندھر پہنچ گیا ہو گا"

لال دین نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"میرے اندازے کے مطابق تو وہ اس وقت فرنٹیئر میل میں بیٹھا دلی جا رہا ہو گا"

بادل فرنٹیئر میل کے سیکنڈ کلاس کے ڈبے کے برتھ پر منہ کھڑکیوں کی طرف کیے لیٹا تھا اور نیم کھلی آنکھوں سے نیچے بیٹھے ہوئے مسافروں کو دیکھ رہا تھا۔ ان میں دو سکھ ایک ہندو اور دو سادھو قسم کے لوگ تھے۔ یہ سادھو ایسے تھے جو انگریزی فر فر بولتے تھے اور امیر لوگوں کو اپنی باتوں سے گرویدہ کر کے انھیں مرید بنا لیتے ہیں اور پھر ان سے دولت بٹورتے ہیں اور عیش آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ بادل نے بڑے غور سے اور تجزیاتی انداز میں دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ ان میں خفیہ کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ بادل نے اتنی احتیاط کی کہ راستے میں بہت کم کسی اسٹیشن سے اترا جس وقت ٹرین دلی کے وسیع و عریض ریلوے یارڈ میں سے گزرتی ہوئی پلیٹ فارم پر جا کر رکی تو شام ہو چکی تھی۔ بادل کے لیے یہ وقت بڑا موزوں تھا۔

دلّی بادل کے لیے کوئی نیا اجنبی شہر نہیں تھا اس شہر کے گلی کوچوں اور نئی آبادیوں کی سڑکوں اور مارکیٹوں سے وہ خوب واقف تھا۔ تیس ہزاری کی پرانی بستی میں اس کا ایک جرائم پیشہ دوست بھی تھا۔ مگر بادل فی الحال اس کے پاس نہیں جانا چاہتا تھا اسے معلوم تھا کہ وہ نہ صرف جیل توڑ کر بلکہ چار آدمیوں کا خون کر کے امرت سر سے بھاگا ہے اور پولیس اس کے دوستوں کے اڈوں اور ڈیروں کی ضرور نگرانی کر رہی ہو گی۔

پلیٹ فارم پر کافی بھیڑ تھی بادل ان کے درمیان چلتا ہوا پلیٹ فارم سے باہر آگیا اب مسئلہ ندیم کو خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی بستی میں تلاش کرنے کا تھا۔ کسی زمانے میں یہ واقعی شہر سے پہلے ایک بستی ہوا کرتی تھی لیکن اب وہ شہر کا ایک حصہ بن چکی تھی اور آس پاس اتنی آبادی ہو گئی تھی کہ وہاں کسی ایسے آدمی کو تلاش کرنا جو خود پولیس سے چھپتا پھر رہا ہو بڑا مشکل کام تھا لیکن بادل نے عہد کر رکھا تھا کہ وہ ندیم کو تلاش کر کے ہی رہے گا۔

اس نے اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی ایک رکشہ لیا اور سیدھا بستی خواجہ نظام الدین کی طرف روانہ ہو گیا یہاں اسے پولیس کا بھی زیادہ خطرہ نہیں تھا اس لیے کہ عقیدت مندوں کا صبح و شام جمگھٹا لگا رہتا تھا جن میں بادل بڑی آسانی سے اپنے آپ کو گم کر سکتا تھا۔ بستی خواجہ صاحب یہاں سے کافی دور تھی۔ رات ہو گئی تھی جب وہ بستی میں پہنچا دور ہی سے اسے درگاہ شریف کی طرف سے قوالی کی روح پرور آواز سنائی دی۔ فضا میں گلاب اور عطریات کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

درگاہ شریف میں فاتحہ پڑھنے کے بعد وہ باولی کے پاس ایک طرف دیوار کے پاس لگ کر بیٹھ گیا اور آنے جانے والے لوگوں کو غور سے تکتا رہا۔ نو بجے رات کے قریب اس نے بھنڈارے کی روٹی کھائی اور اٹھ کر ٹہلتا ہوا پیچھے قبرستان کی طرف نکل گیا۔

قبرستان کے علاقے میں زیادہ روشنی نہیں تھی وہ امیر خسرو کے مزار کے قریب سے گزر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ بادل کے سارے بدن میں سنسنی دوڑ گئی اس نے پلٹ کر دیکھا۔

ایک اونچا لمبا داڑھی والا آدمی بادل کو اپنی لال لال آنکھوں سے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ "استاد مجھے پہچانا نہیں۔ میں سکھیا ہوں"۔

بادل نے اسے پہچان لیا تھا۔ سکھیا نے داڑھی رکھ لی تھی مگر اس کا چہرہ اسی طرح مسکرا رہا تھا جس طرح ان دنوں مسکرایا کرتا جب وہ اس کے گروہ میں شامل تھا۔ یہ بات اس زمانے کی ہے جب بادل کے گروہ میں ابھی نجمی شامل نہیں ہوئی تھی۔ بادل نے سکھیا کو گلے لگا لیا۔ سکھیا اسے ایک طرف نیم کے پیڑ تلے لے گیا اور رازداری سے پوچھا: "استاد بادل! کیا کوئی واردات کی ہے؟"

بادل نے کہا ایسی بات نہیں سکھیا میں ویسے ہی دربار پر حاضری دینے آیا تھا مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تم سے ایک عرصے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ ہمارا گروہ چھوڑنے کے بعد تم کہاں چلے گئے تھے؟"

سکھیا بولا: "استاد یہ بڑی لمبی کہانی ہے، ڈیرے پر چلو گے تو سنا دوں گا۔ تمھارے ساتھ کوئی اور آدمی تو نہیں ہے؟"۔

"نہیں میں اکیلا ہوں" بادل نے کہا۔

"تو پھر میرے ڈیرے پر چلو فکر نہ کرو پولیس ادھر پھٹکتی بھی نہیں"۔

پھر ہنس کر بولا: "میں پورے تھانے کو مہینہ دیتا ہوں"۔

سکھیا کا ڈیرہ بستی سے ذرا ہٹ کر ایک پرانے سوکھے ویران تالاب کے کھنڈر کے پاس ہی تھا۔ سکھیا ایک عرصے سے وہاں مقیم تھا۔ اس نے چند لڑکے رکھ چھوڑے تھے جو شہر میں گھوم پھر کر لوگوں کی جیبیں کاٹتے تھے اور سارا مال لا کر سکھیا کے حوالے کر دیتے تھے۔ سوکھے تالاب کے پیچھے دو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں جن کے آگے ایک کشادہ صحن تھا۔ ایک کوٹھڑی کے باہر بلب روشن تھا برآمدے میں دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور دو لڑکے کام کاج میں لگے ہوئے تھے۔ سکھیا بادل کو اپنی کوٹھڑی میں لے گیا۔ "کیا کھاؤ گے، بولو!"

بادل نے کہا کہ وہ بھنڈارہ کھا چکا ہے۔ سکھیا نے اسی وقت چائے بنوائی اور دونوں پرانے دوست باتیں کرنے لگے بادل نے سکھیا کو اپنے بارے میں زیادہ نہیں بتایا بس اتنا ہی کہا کہ اس کا ایک دوست جس کا نام ندیم ہے پاکستان سے بارڈر کراس کر کے دلی اسے ملنے آیا تھا مگر مل نہیں سکا کیونکہ پولیس اس کے پیچھے لگی ہے اور سنا ہے کہ وہ بستی نظام الدین میں کہیں روپوش ہے۔ سکھیا اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کچھ سوچنے لگا پھر بولا "استاد تم فکر نہ کرو میں اس کا پتہ کروا لوں گا تم مجھے اس کا حلیہ بتا دو اگر وہ اس بستی میں ہوا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میرے آدمی اس کا سراغ لگانے میں کامیاب نہ ہوں۔"

بادل سکھیا پر اتنا اعتبار کر سکتا تھا۔ ویسے وہ قابلِ اعتبار آدمی تھا۔ کیونکہ بادل کے سامنے سکھیا کا سارا ماضی روشن تھا۔ ماضی میں سکھیا نے کبھی اپنے کسی دوست کو دھوکہ نہیں دیا تھا وہ بات کا پکا اور دلیر آدمی تھا۔ بادل نے اسے ندیم کا حلیہ بتایا اور کہا۔ "پولیس میرے پیچھے بھی لگی ہوئی ہے تم جانتے ہی ہو کہ ہمارا پیشہ کس قسم کا ہے۔"

سکھیا مسکراتے ہوئے بولا: "استاد کیا اب بھی تم اسی گروہ میں ہو یا تم نے اپنا الگ گروہ بنا لیا ہے؟ یار میں اس زندگی سے تنگ آ گیا ہوں چاہتا ہوں پھر کسی گروہ میں شامل ہو کر ڈاکے مارنے شروع کر دوں ڈاکے مارنا مجھے اس بک بک سے زیادہ اچھا لگتا ہے یہاں تو ایک ایک جیب کا حساب لینا پڑتا ہے اور پھر لونڈے مال کھا بھی جاتے ہیں۔"

بادل نے کہا۔ "سکھیا ایک بار پھر سوچ لو میری طرف سے تمھیں انکار نہیں۔"

سکھیا بولا: "میں نے سوچ لیا ہے استاد۔ تم فکر نہیں کرو میں اس زندگی سے بیزار ہو گیا ہوں۔"

بادل نے کہا۔ "کوئی بات نہیں ندیم کو برآمد کر کے مجھے اس کے لواحقین کے ہاں پہنچا آنے دو واپسی پر تمھیں بھی اپنے ساتھ لیتا چلوں گا۔"

سکھیا نے بادل کے ہاتھ پہ ہاتھ مار کر کہا۔ "وعدہ رہا؟"

بادل نے پرجوش انداز میں کہا۔ "پکا وعدہ۔"

"ڈاکوؤں ایسا وعدہ؟" سکھیا نے پوچھا۔

"ہاں ڈاکوؤں والا وعدہ۔" سکھیا نے خوش ہو کر بادل کو گلے لگا لیا اور کہنے لگا "تم فکر ہی نہ کرو بادل یہاں پولیس والا کبھی نہیں آتا۔ میں پہلی تاریخ کو انھیں مہینہ پہنچا دیا کرتا ہوں تم آرام کرو۔ میں ایک ڈیرے پر جاتا ہوں ممکن ہے وہاں سے تمھارے ندیم کا کوئی سراغ مل جائے۔"

بادل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "یاد رکھنا اس لڑکے ندیم پر پاکستانی جاسوس ہونے کا بھی الزام ہے۔"

سکھیا جاتے جاتے رک گیا "استاد یہ بات تم نے پہلے کیوں نہیں بتائی۔"

بادل نے کسی قدر تشویش کے ساتھ پوچھا۔ "کیوں کوئی خاص بات ہے؟"

سکھیا چارپائی پر بیٹھ گیا اور سگریٹ کا لمبا کش لگا کر بولا "خاص بات یہ ہے کہ اب مجھے ایک ایسے آدمی کے پاس جانا ہو گا جو اس قسم کے مشتبہ آدمیوں کی پوری خبر رکھتا ہے۔"

بادل نے کہا۔ "لیکن ندیم پاکستانی جاسوس نہیں ہے یہ تو اس پر انڈین پولیس نے الزام لگایا ہے اور پھر ندیم کبھی کسی کو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا۔" سکھیا بولا۔ "چاہے وہ کسی کو کچھ نہ بتلائے لیکن جس آدمی کے پاس اب میں جانے والا ہوں اس کو ہر آدمی کی خبر ہوتی ہے، بس تم مجھے جانے دو میں رات دیر سے آؤں گا تم سو جانا۔ صبح اپنی کارگزاری بتاؤں گا۔"

اور سکھیا کوٹھڑی سے باہر نکل گیا۔ بادل کو سکھیا کی سراغ رسانی اور اس کے ذرائع پر اتنا اعتماد نہیں تھا۔ بھلا ندیم کے بارے میں اس کا آدمی کیسے کچھ معلوم کر سکے گا۔ ندیم اگر ان لوگوں سے ملا بھی تو وہ کہاں اپنے بارے میں انھیں بتائے گا۔ بادل اپنے طور پر ندیم کو تلاش کرنے کے سلسلے میں ذہن میں منصوبہ بندی کرنے لگا۔

وہ چارپائی پر نیم دراز ہو گیا، کمبل اوپر کر لیا اور سگریٹ سلگا کر سوچنے لگا کہ ندیم کو اس بستی میں کہاں اور کس مقام پر تلاش کیا جائے۔ اگر اس نے نجمی کو یہ اطلاع پہنچائی تھی کہ وہ بستی نظام الدین میں کس جگہ چھپا ہوا ہے تو ظاہر ہے کسی واقف کار کے ہاں چھپا ہوا ہو گا اور وہ آدمی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ندیم کے بارے میں کبھی کسی کو نہیں بتلائے گا اچانک بادل کو خیال آیا کہ ہو سکتا ہے اس آدمی کا تعلق سکھیا کے گروہ سے ہو اور وہ روپوں کے لالچ میں آکر ندیم کے بارے میں سکھیا کے کسی آدمی کو کچھ بتا دے ۔ یہ بادل کا قیاس ہی تھا ۔ اس نے سگریٹ بجھایا اور کمبل اوپر کر کے لیٹ گیا ۔ دن بھر کے سفر کا تھکا ہوا تھا تھوڑی ہی دیر بعد اسے نیند آگئی ۔ رات کا ایک بج رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی بادل جلدی سے اٹھ بیٹھا ۔ باہر سے سکھیا کی آواز آئی : "استاد سو گئے ہو کہ جاگ رہے ہو ؟"

بادل نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا ۔ سکھیا اندر آکر چارپائی پر بیٹھ گیا وہ سگریٹ پی رہا تھا ۔ باہر سردی ہو گئی تھی ۔ سکھیا نے کہا ۔ "استاد تم نے لحاف کیوں نہیں کھولا یہاں تو ٹھنڈ ہے ۔"

بادل آنکھیں ملتے ہوئے چارپائی پر کمبل اوڑھ کر بیٹھ گیا اور پوچھا ۔ "کیا خبر لائے ہو سکھیا؟"

سکھیا نے سگریٹ کا کش لگایا اور کہنے لگا ۔ "استاد تم نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ تم امرتسر میں چار خون کر کے جیل سے بھاگے ہو اور تمھارے ساتھ کوئی جوگن بھی تھی ۔"

کوٹھری میں مدھم روشنی والا بلب جل رہا تھا ۔ بادل نے سانس بھرتے ہوئے کہا " یہ بات تمھیں بتانے کی نہیں تھی ۔ ادھر قتل اور جیل تو ہماری زندگیوں کا حصہ بن گئے ہیں ۔ ہاں اگر تمھیں خطرہ ہے کہ پولیس کہیں میرے ساتھ تمھیں بھی گرفتار نہ کر لے تو میں ابھی یہاں سے چلا جاتا ہوں ۔"

سکھیا نے سگریٹ فرش پر پھینک کر اسے پاؤں سے مسل دیا اور بادل کی طرف گردن ٹیڑھی کر کے دیکھتے ہوئے بولا ۔ "بادل کیا تم مجھے ایسا آدمی سمجھتے ہو ، یار بڑے افسوس کی بات ہے کہ تمھارے ساتھ اتنا عرصہ گزارا ہے پھر بھی تم مجھے نہیں سمجھ سکے ۔"

بادل نے کھسیانہ سا ہو کر سکھیا کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور کہا ۔ "سکھیا مجھے تمھاری نیت پر ہرگز ہرگز شک نہیں ہے میں تو صرف تمھاری سلامتی کی بات کر رہا تھا کہ میری وجہ سے تم بھی کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ ۔"

سکھیا نے بادل کے ہاتھوں کو گرمجوشی سے دباتے ہوئے کہا ۔ "بادل کبھی مجھے آزما کر تو دیکھو خدا کی قسم اپنے دوست کی خاطر جان بھی قربان کر سکتا ہوں ۔ اب سنو میں دو ڈیروں پر گیا تھا

وہاں سے مجھے ندیم کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا ۔ کل ایک اور ڈیرے پر جا رہا ہوں ۔ مجھے امید ہے کہ وہاں سے تمھارے ندیم کا کوئی نہ کوئی سراغ ضرور مل جائے گا ۔ اچھا اب میں چلتا ہوں ۔ تم آرام کرو ۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے ۔"

اور سکھیا بادل کا ہاتھ گرمجوشی سے دبا کر کوٹھری سے نکل گیا ۔ بادل کچھ دیر تک سگریٹ پیتے ہوئے ندیم اور سکھیا کے اثر و رسوخ کے بارے میں غور کرتا رہا پھر سگریٹ بجھا کر سو گیا ۔ دوسرے دن بھی بادل نے سارا وقت سکھیا کے ڈیرے پر ہی کوٹھری کے اندر گزارا ۔ سکھیا صبح ہی سے ندیم کی سراغ رسانی میں نکل گیا تھا اور بادل کو تاکید کر گیا تھا کہ وہ کوٹھری سے باہر نکلتے وقت ذرا احتیاط سے کام لے کیونکہ خفیہ پولیس کے آدمیوں کا آس پاس امکان ہو سکتا ہے ۔ دو لڑکے بادل کی خدمت پر مامور کر دیئے گئے تھے ۔ انھوں نے ہی بادل کو چائے اور کھانا وغیرہ کوٹھری کے اندر ہی لا کر دے دیا ۔ دوپہر کے بعد سکھیا آ گیا ۔

وہ مسکرا رہا تھا ۔ بادل کو محسوس ہوا کہ شاید اس نے ندیم کا سراغ لگا لیا ہے ۔ سکھیا نے اندر آتے ہی پوچھا ۔ " یہ بتاؤ تم نے کھانا وغیرہ کھا لیا ؟ کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہوئی ؟"

بادل نے کہا ۔ "ارے نہیں سکھیا میں تو یہاں مزے میں ہوں ۔ تمھارے لڑکوں نے میری بڑی خدمت کی ہے ، اچھا بتاؤ کیا خبر لائے ہو ؟"

سکھیا نے لڑکے کو چائے لانے کے لیے آواز دی اور کوٹھری کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولا ۔ "استاد تمھارے آدمی کی سن گن مل گئی ہے ۔"

پھر سکھیا نے بادل کو بتایا کہ ایک خفیہ اڈے سے اسے معلوم ہوا ہے کہ ایک مشتبہ نوجوان کو اس علاقے کی ایک مسجد میں نماز پڑھتے دیکھا گیا جو نماز پڑھنے کے بعد بھی مسجد میں ہی بیٹھا رہا پھر اس نے امام مسجد سے کچھ باتیں کیں اور امام صاحب نے اسے مسجد کے حجرے میں ہی ٹھہرا لیا ہے اگر تم میرے ساتھ چلو تو وہ نوجوان ابھی تک اسی مسجد کے حجرے میں ہی ہے ۔ اس کا نام حلیہ تقریباً وہی ہے جو تم نے مجھے بتایا تھا صرف اس نوجوان کا سر منڈا ہوا ہے ۔"

بادل کے دل میں امید کی کرن پیدا ہو گئی تھی ممکن ہے یہ ندیم ہی ہو ۔ سکھیا کے آدمی علاقے میں آنے والے ہر نئے اور مشتبہ آدمی کی خبر رکھتے تھے ۔ ندیم کا سراغ مل جانا بھی اسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حفظِ ماتقدم کی ایک کڑی تھی۔ بادل بولا: "میں ابھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔"
سکھیا کہنے لگا: "ابھی نہیں ذرا شام کا اندھیرا ہو جانے دو۔ میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔"

بادل خاموش ہو گیا جب شام کا اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا تو سکھیا نے ایک بند رکشا وہاں منگوایا اور بادل کو ساتھ لے کر اس مسجد کی طرف روانہ ہو گیا جہاں ایک مشتبہ نوجوان حجرے میں رہ رہا تھا۔ یہ مسجد بستی نظام الدین کے علاقے میں ہی تھی مگر کافی فاصلے پر تھی۔ یہاں مکان دور دور بنے ہوئے تھے اور بیچ میں کچھ پارک بھی تھے۔ ایک بس سٹینڈ بھی قریب ہی تھا۔ مسجد سے تھوڑی دور سکھیا نے رکشا رکوالیا وہ دونوں مسجد کی طرف بڑھے۔ مسجد میں مغرب کی نماز ہو چکی تھی۔ سردی کی وجہ سے مسجد کا صحن خالی تھا۔ سکھیا نے بادل سے کہا "تم اسی جگہ ٹھہرو میں جا کر امام مسجد سے ملتا ہوں۔"

بادل کہنے لگا: "میرا خیال ہے تمھاری بجائے مجھے جانا چاہیے تمھیں دیکھ کر ہو سکتا ہے ندیم وہاں سے بھاگ جائے کیونکہ وہ تمھیں خفیہ پولیس والا بھی سمجھ سکتا ہے لیکن میری شکل دیکھ کر وہ حجرے سے باہر آ جائے گا۔"

سکھیا بولا: "ٹھیک ہے تم جاؤ میں اسی جگہ ٹھہرتا ہوں رکشا میں نے اسی لیے رکوالیا ہوا ہے۔"

بادل نے اپنے سر پر رومال باندھا اور مسجد کے باہر جوتے اتار کر صحن میں داخل ہو گیا سامنے کونے میں ایک حجرہ تھا جس کا دروازہ بند تھا۔ مسجد خالی تھی۔ بادل نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ حجرے کے دروازے پر دستک دی۔ کسی نے اندر سے بھاری آواز میں پوچھا: "کون ہے میاں؟"

بادل نے کہا: "حضور! مسافر ہوں بھوک لگی ہے میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔"

اندر سے آواز آئی: "بیٹھ جاؤ۔"

بادل چادر جسم کے گرد لپیٹ کر مسجد کے صحن میں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر یہ امام مسجد ہے تو وہ ندیم کے بارے میں اسے کچھ نہیں بتائے گا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے

ندیم نے امام صاحب کو صاف صاف بتا دیا ہو کہ وہ مسلمان ہے اور غیر قانونی طور پر بارڈر کراس کر کے یہاں اپنی والدہ یا بھائی بہنوں سے ملنے آیا ہے اور اب پولیس اس کے پیچھے لگ گئی ہے
بادل ابھی خیالات میں گم تھا کہ حجرے کا دروازہ کھلا اور باریش شخص ہاتھ میں تھالی لیے نمودار ہوا۔
"لو میاں کھچڑی ہے اسے قبول کرو۔"

بادل نے آگے بڑھ کر کھچڑی کی تھالی امام صاحب کے ہاتھوں سے تھام لی اور کہا: "حضور آپ کی بڑی مہربانی ہے۔"

اور بادل دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور کھچڑی کھانے لگا۔ امام صاحب نے حجرے کا دروازہ بند کر دیا۔ بادل نے فوراً اٹھ کر دروازے کے ساتھ کان لگا دیا۔ اندر سے کسی کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی: "حضور! یہ ضرور کوئی خفیہ پولیس والا ہو گا۔"

بادل کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ اس نے ندیم کی آواز پہچان لی تھی اب بادل کے لیے صبر کرنا ناممکن تھا۔ اس نے دروازے کے ساتھ منہ لگا کر کہا: "ندیم! دروازہ کھولو میں بادل ہوں۔"

حجرے میں ایک لمحے کے لیے بالکل سناٹا چھا گیا۔ پھر کسی نے جلدی سے دروازہ کھول دیا بادل کے سامنے ندیم اور ندیم کے سامنے بادل کھڑا تھا۔ دونوں بے اختیار ہو کر ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ امام مسجد دونوں کو حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ ندیم جلدی سے بادل کو حجرے میں لے آیا۔ اس نے امام صاحب سے کہا: "حضور یہی وہ شخص ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔ میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے حجرے میں پناہ دی۔ اگر آپ مجھے یہاں پناہ نہ دیتے تو شاید میں اپنے بھائی سے کبھی نہ مل سکتا۔"

بادل نے ندیم سے کہا: "میرے ساتھ چلو ندیم تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

ندیم اسی وقت چلنے کو تیار ہو گیا۔ امام مسجد نے کہا: "بیٹا تمھاری مہمان نوازی میں اگر کوتاہی ہو گئی ہو تو مجھے معاف کر دینا۔"

ندیم نے امام صاحب کا ہاتھ تھام کر چوم لیا اور جذباتی آواز میں بولا: "حضور! میں آپ کا احسان ساری زندگی نہیں بھول سکوں گا آپ نے اسلامی اخوت کی لاجواب مثال پیش کی ہے۔ اب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے اجازت دیجیے میں اپنے آدمیوں کے پاس پہنچ گیا ہوں"۔

امام صاحب نے ندیم کو گلے لگا کر دعا دی۔ ندیم اور بادل سلام کر کے مسجد سے باہر آ گئے باہر آتے ہی ندیم نے پوچھا "ہم یہاں محفوظ ہیں نا بادل بھائی؟"

"بالکل محفوظ ہیں میں تمھیں اپنے دوست سے ملواتا ہوں"

بادل نے ندیم کا سکھیا سے تعارف کرایا اور کہا "اگر میرا یار سکھیا میری مدد نہ کرتا تو شاید میں کبھی تم تک نہ پہنچ پاتا"۔

ندیم نے سکھیا کا بھی شکریہ ادا کیا اور رکشہ میں بیٹھ کر یہ لوگ سکھیا کے ڈبرے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ڈبرے پر آ کر سب نے مل کر کھانا کھایا پھر سکھیا چائے بنوانے باہر چل دیا۔ بادل نے ندیم سے کہا "تم نے پاکستان سے انڈیا آنے کی غلطی کیوں کی ہے؟"

ندیم نے کہا "صرف نجمی کے لیے میں نے ایسا کیا ہے۔ اب اس کے بغیر میرا کہیں بھی دل نہیں لگتا۔ یہ بتاؤ وہ کہاں ہے، خیریت سے تو ہے نا؟"

بادل نے کہا "وہ تم سے ناراض ہے کہ جب تم اس مصیبت سے نکل چکے تھے تو دوبارہ یہاں کیوں آ گئے ہو؟"

ندیم بولا "میں مجبور ہوں بادل بھائی۔ نجمی کا میں نے لاہور میں بڑا انتظار کیا جب اس کی جدائی برداشت نہ کر سکا تو بارڈر کراس کر کے یہاں پہنچ گیا۔ بارڈر پر میں مرتے مرتے بچا وہاں محسوس ہوا کہ دونوں طرف سیکورٹی کتنی سخت ہو گئی ہے۔ نجمی خوش ہے نا؟"

بادل نے اسے بتایا کہ نجمی بالکل خیریت سے ہے اور شمالی علاقے کی سرحدی پہاڑیوں میں اس کا انتظار کر رہی ہے تاکہ دونوں مل کر انڈیا کا بارڈر کراس کریں۔ ندیم نے کسی قدر تشویش کے ساتھ بادل سے کہا "بادل بھیا! کیا اس علاقے سے بارڈر کراس کر سکیں گے ہم؟ جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے اس وقت بارڈر کراس کرنا اپنی موت کو آواز دینے کے برابر ہے۔ کیا ہم کچھ عرصہ روپوش نہیں رہ سکتے؟"

بادل نے کہا "نجمی نہیں مانے گی۔ ویسے بھی جو آدمی تم دونوں کو بارڈر کراس کرائے گا ایک تو وہ بڑے اعتماد والا آدمی ہے دوسرے اسے بارڈر کی ایک ایک انچ زمین کا پتہ ہے جموں کشمیر کے

پہاڑی علاقوں میں وہ ایسی کئی خفیہ جگہوں کو جانتا ہے جہاں سے اس کے آدمی بارڈر کراس کرتے ہی رہتے ہیں"۔

سکھیا بھی چائے لے کر وہاں آ گیا۔ اب بادل نے اس سے کہا کہ وہ ندیم کو لے کر جموں جانا چاہتا ہے جہاں سے اسے بارڈر کراس کروا کر پاکستان بھیجا جائے گا۔

سکھیا بولا: "یہ تو بڑا لمبا فاصلہ ہے تم کب جانا چاہتے ہو؟"

بادل نے کہا "میں تو کل صبح ہی روانہ ہو جانا چاہتا ہوں۔ ویسے تو میں ندیم کو لے کر جا سکتا ہوں مگر صورتِ حال پیچیدہ ہو گئی ہے تم سے میں نے اس لیے مدد مانگی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ تم کوئی ایسا بندوبست کر دو کہ ہمیں زیادہ پریشانی نہ اٹھانا پڑے اور خطرہ بھی کم ہو جائے۔ کیا تم کوئی اس قسم کا بندوبست کر سکتے ہو؟"

سکھیا کچھ سوچنے لگا پھر بولا "ایک بات ہو سکتی ہے"۔

"وہ کیا" بادل نے پوچھا۔

سکھیا سگریٹ کا کش لگا کر بولا "میرا ایک دوست چرس اور کوکین جموں کشمیر اسمگل کرتا ہے ویسے تو وہ پھلوں کا کاروبار کرتا ہے۔ کشمیر کے سیب وغیرہ کلکتے لے جاتا ہے اور کلکتے سے ناریل اور اناناس جموں کشمیر لے جاتا ہے لیکن اصل میں وہ ناریلوں میں چرس اور کوکین بھر کر لے جاتا ہے وہ خود تو نہیں لیکن اس کا ایک خاص آدمی اپنی نگرانی میں یہ منشیات جموں ٹرک میں پہنچاتا ہے۔ اس کا ٹرک پرسوں آنے والا ہے تم دونوں اس میں بیٹھ کر چلے جانا۔ میرا خیال ہے کہ اس سے بہتر تمھارا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا"۔

بادل یوں [illegible] ہوا لیکن اس نے پوچھ ہی لیا "اگر راستے میں چیکنگ ہو گئی تو ہم ضرور پولیس کے ہتھے [illegible] جائیں گے"۔

سکھیا ہنستے ہوئے بولا [illegible] اتنا عرصہ ہو گیا تمھیں اپنا گروہ چلاتے ہوئے اور ابھی تک تم کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ایسے [illegible] سارا بندوبست کرنے کے بعد ہی اپنے گھر سے چلتے ہیں یہ کوئی اناڑی نہیں ہیں یہاں سے لے کر جموں تک میرے دوست نے سب پولیس والوں کا بھتہ مقرر کر رکھا ہے۔ ارے ان کے ٹرک کی طرف تو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا"۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ندیم بولا۔ "بادل بھیا! تب تو یہ ہمارے لیے خوب رہے گا"۔

سکھیا نے کہا۔ "یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں پرسوں ٹرک یہاں پہنچ جائے گا۔ ٹرک اڈے پر ہی کھڑا ہوتا ہے میں خود بوگن سے جاکر مل لوں گا۔ یہ بوگن میرے دوست کا خاص اور پر اعتماد آدمی ہے۔ اس روٹ پر اسمگلنگ کا سارا کام وہی کرتا ہے۔ یہ جو چرس کوکین ہے نا؟ یہ میرے دوست کو برما کے بارڈر سے اسمگل ہو کر ملتی ہے۔ بہرحال تم ایک دن اور یہاں ٹھہر جاؤ"۔

بادل اور ندیم کو سکھیا کی یہ سکیم پسند آئی۔ اب انھوں نے کلکتے سے آنے والے ٹرک کا انتظار شروع کر دیا۔ دونوں سکھیا کے مکان میں چھپے رہے رات کو بھی باہر نہیں نکلتے تھے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے کہ وہ کون ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟ آخر وہ دن بھی آگیا جس روز کلکتے سے ٹرک آنا تھا۔ سکھیا شام کے وقت ٹرکوں کے اڈے پر پہنچ گیا۔ بوگن کا ٹرک آچکا تھا اور ایک طرف کھڑا تھا۔ بوگن دکان کے باہر لکڑی کے بنچ پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ سکھیا کو دیکھتے ہی بولا۔ "دادا میں چائے پی کر تمھاری طرف آنے ہی والا تھا"۔

سکھیا اس کے پاس ہی اسٹول پر بیٹھ گیا اور بولا۔ "دو امانتیں جموں پہنچانی ہیں"۔

بوگن ڈرائیور نے پرچ میں سے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔ "امانتیں سوکھی ہیں یا تر؟" سکھیا نے کہا۔ "دو آدمی ہیں پولیس کو ڈکیتی میں مطلوب ہیں میرے یار ہیں انھیں جموں کشمیر روڈ تک پہنچانا ہے"۔

بوگن کو معلوم تھا کہ سکھیا اس کے مالک کا گہرا یار ہے اور سکھیا کے اس کے مالک پر احسانات بھی ہیں۔ ویسے وہ خود بھی سکھیا سے کئی کام کروا چکا تھا کہنے لگا۔ "دادا یہ تو کوئی بات ہی نہیں اپنی امانتیں لے آنا میں منہ اندھیرے نکل جاؤں گا"۔

سکھیا خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔ آتے ہی اس نے ندیم اور بادل کو بتا دیا کہ ان کا بندوبست ہو گیا ہے اور وہ تیار رہیں۔ منہ اندھیرے انھیں ٹرک میں سوار کرا دیا جائے گا۔ ندیم کہنے لگا۔ "سکھیا بھائی ہم ٹرک میں چھپ کر جائیں گے یا ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ کر؟"

سکھیا نے کہا۔ "خطرہ پنجاب میں ہے۔ کیونکہ یہاں کی پولیس بادل کی شکل سے واقف ہے

اور ابھی تازہ تازہ اس نے وارداتیں بھی کی ہیں۔ اس لیے تمھارا چھپ کر ہی جانا بہتر رہے گا کیا خیال ہے بادل؟"

بادل اس معاملے میں سکھیا سے متفق تھا کہنے لگا۔ "ٹرک میں ایسی جگہ بنالیں گے جہاں دن کے وقت چھپ کر بیٹھے رہیں گے رات کو باہر نکل آئیں گے"۔

سکھیا بولا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا باقی تم راستے میں پولیس کی چیکنگ کی فکر نہ کرو۔ ایسے ٹرک کی چیکنگ ہو سکتی ہے جس پر سرکاری سامان لدا ہوا ہو مگر یقین کرو ہمارے ٹرک کی چیکنگ نہیں ہوگی۔ یہاں سے لے کر جموں کشمیر تک سارے روٹ کی پولیس میرے دوست کی خریدی ہوئی ہے ان کو گھر بیٹھے بیٹھے باقاعدہ بھتہ ملتا ہے"۔

بادل کے لیے یہ بھی حوصلہ افزا بات تھی اس کے باوجود بادل نے ندیم سے یہ ضرور کہا کہ ہمیں ہر وقت چوکس رہنے کی ضرورت ہوگی۔ اگر راستے میں کہیں کوئی گڑبڑ ہو گئی تو یاد رکھو ہمیں جدھر سینگ سمائے بھاگ جانا ہوگا اور ہم واپس اس سکھیا کے مکان میں ہی آئیں گے"۔

رات ندیم اور بادل نے کچھ سو کر اور زیادہ جاگ کر گزاری ابھی رات کا کچھ حصہ باقی تھا کہ سکھیا آگیا تینوں مکان سے نکل کر اس اڈے پر آگئے جہاں ڈرائیور بوگن کوچ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ سکھیا نے بادل اور ندیم کو اس سے ملوایا اور کہا۔ "بوگن یہ میری امانتیں ہیں انھیں اپنی حفاظت میں جموں پہنچانا ہے باقی سب کچھ میں نے تمھیں بتا دیا ہے"۔

بوگن نے ندیم اور بادل سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ "کوئی بات نہیں ہے دادا سمجھو تمھاری امانتیں جموں پہنچ گئیں۔ میں نے ان کے بیٹھنے کے لیے ٹرک کے پیچھے جگہ بنا رکھی ہے۔ دن کے وقت انھیں یہاں چھپنے کی ضرورت ہوگی۔ رات ہم اپنی جگہ پر پہنچ کر سوئیں گے"۔

ٹرک میں ناریلوں کے بڑے بڑے ٹوکرے لدے ہوئے تھے ان میں اناس بھی تھے ان کے بیچ میں آگے جا کر دو آدمیوں کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنا دی گئی تھی۔ ٹرک اس وقت اڈے سے باہر نکل کر کھڑا تھا بوگن نے یہ جگہ ندیم اور بادل کو دکھائی اور کہا۔ "دادا تم دونوں یہاں مزے سے بیٹھو چاہے سو جاؤ فکر مت کرنا کوئی تمھیں پوچھنے نہیں آئے گا ہمارے لیے سارا راستہ صاف ہوتا ہے"۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور وہ بڑی کاکش لگا کر ہنسنے لگا اس کو کچھ خبر نہیں تھی کہ جس آدمی یعنی بادل کو وہ یہ بات سمجھا رہا ہے وہ اس علاقے کا بدنام ترین خونخوار ترین ڈاکو ہے۔ بادل نے بوگن کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ذرا کاندھا دبایا اور کہا "بڑے اچھے آدمی ہو بوگن"۔

پھر اس نے سکھیا کو گلے لگا لیا۔ گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔ ندیم نے بھی سکھیا سے ہاتھ ملایا اور اس کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ بوگن نے اشارہ کیا کہ ٹرک میں بیٹھ جاؤ وقت ہو گیا ہے۔

بادل اور ندیم ٹرک میں چڑھ کر ناریل اور اناس کے ٹوکروں کے درمیان پیچھے جا کر بیٹھ گئے۔ ان ناریلوں میں سے ایک ہزار کے قریب ایسے ناریل تھے جن میں چرس اور کوکین کی تھیلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان ٹرک کے کونے میں بیٹھنے کے لیے اچھی خاصی جگہ بنی ہوئی تھی ہوا کا بھی انتظام تھا۔ ندیم اور بادل ناریل کے بوروں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ٹرک سٹارٹ ہوا اور اپنے طویل روٹ پر روانہ ہو گیا۔

ابھی رات کا اندھیرا تھا۔ ٹرک شہر سے نکل کر گرینڈ ٹرنک روڈ پر آ گیا۔ یہ روٹ دلی سے انبالہ جالندھر اور ہوشیار پور سے کٹھوعا اور پھر جموں کا تھا۔ جالندھر سے ٹرک نے اپنا روٹ ہوشیار پور کٹھوعا کی طرف تبدیل کرنا تھا۔ ندیم اور بادل جہاں بیٹھے تھے وہاں ٹرک پر لدے ہوئے ٹوکروں اور بوروں کے درمیان صبح کی روشنی آنے لگی۔ ایک جگہ ٹرک رُک گیا اور بوگن نے ٹرک کو جان بوجھ کر اڈے سے کچھ فاصلے پر کھڑا کیا تھا اس نے خود بھی ناشتہ کیا اور بادل اور ندیم کو بھی ناشتہ کروایا۔ دونوں ٹرک میں سے باہر نکل آئے تھے یہاں ایک جانب ہرے بھرے کھیت دور تک پھیلتے چلے گئے تھے ٹرک یہاں سے چلا تو دوسرے شہر جا کر رکا۔ یہاں ٹرک میں پیٹرول ڈالا گیا۔ پھر ایک تاریخی شہر سے "پانچ چھ میل پیچھے ٹرک روک کر ایک ڈھابے میں کھانا کھایا۔

یہاں سے ٹرک چلا تو اس شام کو ایک جگہ پہنچ کر ہی دم لیا۔ ٹرک کی رفتار ڈرائیور نے خاصی تیز رکھی ہوئی تھی۔ اس بوسیدہ سی آبادی والے علاقے میں ٹرک ایک پیپل کے درخت تلے جا کر رک گیا۔ بادل اور ندیم باہر نکل آئے بیٹھے بیٹھے ان کے گھٹنے چڑھ گئے تھے۔ باہر نکل کر

انھوں نے تھوڑی سی ورزش کی۔ بوگن نے انھیں بتایا کہ یہ شہر کی باہر والی بستی ہے اور رات وہ اپنے آدمی کے ڈیرے پر گزاریں گے یہ رات بھی خیریت سے گزر گئی۔ بادل ایک ایک میل گن گن کر طے کر رہا تھا اسے اگرچہ بڑی امید دلائی گئی تھی کہ راستے میں کہیں بھی چیکنگ نہیں ہو گی۔ پھر بھی وہ بے حد محتاط تھا اور ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے اپنے آپ کو اور ندیم کو تیار کیے ہوئے تھا۔

اس شہر سے ٹرک منہ اندھیرے روانہ ہوا۔ اب انھیں ایک اور شہر میں رات بسر کرنی تھی۔ پھر وہ علاقہ آ گیا۔ ٹرک یہاں تھوڑی دیر کے لیے رُکا۔ بادل اور ندیم کو کچھ ایسی آوازیں آئیں جیسے بوگن کسی پولیس والے سے باتیں کر رہا ہے وہ ہنس ہنس کر بول رہا تھا۔ پولیس والے نے ٹرک پر دو ایک بار ڈنڈا مارا اور اس کی آواز آئی "سیٹھ کو بول دینا ہمارا کم ہے اسے بڑھا دے مہنگائی بہت ہو گئی ہے"۔

بوگن نے ہنس کر کہا "فکر نہ کرو دادا! سب ٹھیک ہو جائے گا"۔

بادل نے ندیم کے کان میں کہا۔ "یہ پولیس کانسٹیبل ہے"۔

ٹرک یہاں سے چلا تو بادل نے خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر سفر کرتے ہوئے رات ہو گئی۔ یہ ایک بڑا شہر تھا یہاں پولیس اور خفیہ پولیس جگہ جگہ پھرتی رہتی ہے۔ بوگن بادل اور ندیم کو ایک خفیہ اڈے پر لے گیا اور تاکید کر دی کہ وہاں سے باہر نہ نکلیں۔ بادل خود بھی یہی چاہتا تھا اس کوٹھڑی میں انھوں نے رات بسر کرنی تھی اور صبح منہ اندھیرے وہاں سے آگے کی طرف روانہ ہونا تھا۔ اس کوٹھڑی میں بوگن ان کو کھانا دے گیا۔ کھانا کھانے کے بعد بادل اور ندیم باتیں کرنے لگے۔ ندیم نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ آدھے سے زیادہ راستہ طے ہو گیا ہے"۔ بادل کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اسے جیپ کے آنے اور رکنے کی آواز سنائی دی۔ بادل نے جلدی سے ندیم کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ دونوں ہمہ تن گوش ہو گئے۔ ان کے کان باہر جیپ کی آواز پر لگے ہوئے تھے جس کا انجن ابھی تک چل رہا تھا۔ پھر بوگن کی آواز آئی "آؤ دادا! آج تھانے سے نکل کر ادھر کیسے آنا ہوا؟" بادل اور ندیم ایک دم ساکت سے ہو گئے یہ کوئی پولیس افسر تھا جو خدا جانے کیوں وہاں آ گیا تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بادل اور ندیم نے دروازے کے ساتھ کان لگا دیئے۔

باہر سے جیپ کے انجن کی آواز آنی بند ہو گئی۔ پھر بوگن کی کسی پولیس افسر سے باتیں کرنے کی ہلکی ہلکی آوازیں آتی رہیں۔ وہ ماہانہ رقم میں اضافے کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ندیم اور بادل نے اطمینان کا سانس لیا۔ تھوڑی دیر بعد جیپ اسٹارٹ ہوئی اور اس کی آواز آہستہ آہستہ دور ہوتے ہوئے غائب ہو گئی۔ چند لمحوں کے بعد بوگن اندر آ گیا اور بولا "علاقہ کا ایس ایچ او تھا وہ اپنی رقم کی بات کر رہا تھا۔ تم بے فکر ہو کر سو جاؤ صبح صبح جگا دوں گا۔ ہم تین بجے یہاں سے چلیں گے۔"

بادل اور ندیم کو بارہ ایک بجے تک نیند نہ آئی۔ انھیں دھڑکا ہی لگا رہا کہ کہیں ان کی مخبری نہ ہو جائے اور پولیس پارٹی اچانک چھاپہ نہ مار دے۔ مگر ڈیڑھ بجے تک باہر خاموشی طاری رہی۔ اس کے بعد وہ سو گئے۔ منہ اندھیرے بوگن نے آ کر انھیں جگا دیا۔ دونوں ٹرک کے نیچے اپنی خاص جگہ پر گھس کر بیٹھ گئے اور ٹرک روانہ ہو گیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ ٹرک کو شہر سے نکلتے ہوئے لگ گیا۔ جب سڑک پر دونوں طرف خاموشی ہو گئی تو بادل سمجھ گیا کہ ٹرک شہر سے نکل آیا ہے۔ پھر ٹرک کے اندر آہستہ آہستہ دن کی روشنی ہونے لگی۔ ٹرک انبالے اور پانی پت سے بھی گزر گیا۔ لدھیانہ پہنچ کر انھوں نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ ندیم اور بادل کو باہر نکال کر ایک درخت کے نیچے بٹھا کر بوگن نے کھانا دیا۔ بوگن نے کہا "آگے جالندھر آ رہا ہے۔ میں وہاں نہیں رکوں گا وہاں سے میں ٹرک کا رخ ہوشیار پور کی طرف کر دوں گا۔ ہم رات ہونے سے پہلے پہلے جموں پہنچ جائیں گے۔ تم بالکل فکر نہ کرو سب ٹھیک

ہو جائے گا۔ دیکھ لو کہیں بھی ٹرک کی چیکنگ نہیں ہوئی پیسہ ہر جگہ کام آ رہا ہے۔"

اور وہ ہنسنے لگا۔

ٹرک لدھیانہ سے جالندھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جالندھر آیا تو سڑک پر ٹریفک بڑھ گیا یہاں سے بادل اور ندیم نے اندازہ لگایا کہ وہ جالندھر شہر میں سے گزر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ٹرک مختلف سڑکوں سے ہوتا ہوا ایک نسبتاً کم ٹریفک والی سڑک پر آ گیا۔ یہ سڑک سیدھی جموں جاتی تھی۔ یہاں ٹرک کی رفتار تیز ہو گئی۔ دن کے چار بجے وہ ہوشیار پور پہنچے۔ نیم پہاڑی علاقہ یہاں سے شروع ہو گیا تھا۔ یہاں بوگن نے بادل اور ندیم کو باہر آنے کا اشارہ دیا۔ وہ ٹرک کی سائیڈ کو تین بار کھٹکھٹا کر اشارہ دیتا تھا۔ اس سفر میں بوگن کے ساتھ کلینر نہیں ہوتا تھا۔ اسے کلینر ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ہوشیار پور میں دھوپ نکلی ہوئی تھی اور فضا میں خنکی شروع ہو گئی تھی۔ یہاں انھوں نے چائے وغیرہ پی ایک نالے پر منہ ہاتھ دھویا۔ تھوڑی دیر آرام کیا اور پھر ٹرک میں گھس گئے۔ بوگن نے انھیں بتا دیا تھا کہ ٹرک یہاں سے چل کر اب جموں ہی جا کر رُکے گا۔ بادل نے بوگن کو بتایا کہ انھیں دریائے توی پار کرنا ہوگا اور پل پر دونوں جانب پولیس ہوتی ہے جو ہر گاڑی کی ضرور چیکنگ کرتی ہے۔

بوگن نے بیڑی نکال کر سلگائی اور ہنس کر بولا "دادا! توی دریا کے پل والے سپاہی ہم سے سب سے زیادہ پیسے لیتے ہیں۔ وہ تو ہمارے ٹرک کو ہاتھ تک نہیں لگاتے۔ دور سے میری شکل دیکھ کر راستہ کھول دیتے ہیں۔"

ٹرک جموں کی طرف روانہ ہو گیا۔ کٹھوعا بھی گزر گیا آگے جموں تھا۔ اب شام کا اندھیرا بہت [گہ]را ہو گیا تھا۔ جموں پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ ڈرائیور بوگن نے جموں شہر سے باہر ایک پیٹرول [پم]پ کے آگے ٹرک کھڑا کر دیا۔ یہاں اس نے تیل وغیرہ ڈلوایا اور کوئی چھ سات میل آگے [جا]کر ایک جگہ ٹرک روک دیا۔ اس نے ٹرک کی سائیڈ کو ہاتھ سے تین بار بجایا۔ ندیم اور [ب]ادل ٹرک سے باہر آ گئے۔ انھیں اپنے سامنے اور دائیں بائیں پہاڑی ڈھلانوں اور وادی [میں] جموں شہر کی روشنیاں جھلملاتی نظر آئیں۔ بوگن بیڑی پی رہا تھا۔ بادل کو باہر آتے دیکھ [ک]ر اس نے اپنی جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک پستول نکال لیا۔ بادل ایک سیکنڈ کے لیے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بوکھلا سا گیا۔

بوگن نے مسکرا کر کہا "ایسی کوئی بات نہیں، یہ پستول بھرا ہوا ہے۔ اسے اپنے پاس رکھو مجھے آگے خطرہ لگ رہا ہے۔ میری اسٹین گن میرے پاس موجود ہے۔ اگر ایسی ویسی بات ہوئی تو تم بھی اندر سے فائرنگ شروع کر دینا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

بادل نے اطمینان کا سانس لیا اور بھرا ہوا پستول لے کر رکھ لیا اور پوچھا "خطرہ کس کا ہے۔؟"

بوگن نے بیڑی کا کش لگایا اسے ایک طرف پھینک کر بولا "بس کوئی ایس پی گارڈ وغیرہ لے کر آیا ہوگا۔ جب تک میں گولی نہ چلاؤں تم مت چلانا۔" یہ کہہ کر بوگن اپنی سیٹ کی طرف بڑھا۔ ندیم نے بادل سے کہا "کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔"

بادل نے پستول جیب میں ڈالی اور بولا "اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

ٹرک کشادہ سڑک پر سے گذرتا دریائے توی کے پل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بوگن کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید پل پر ایس پی یا ڈی ایس پی وغیرہ چیکنگ کے لیے موجود ہو۔ کسی نے مخبری کر دی ہو۔ ٹرک کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ بوگن ڈرائیور کی نظریں اندھیرے میں پل کی روشنیوں کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ پل کے اس طرف چیک پوسٹ پر بوگن کو پولیس کی وہی شکلیں نظر آئیں جنھیں وہ ہر پھیرے پر دیکھا کرتا تھا۔ اسٹین گن اس نے اپنے سامنے کلچ والی جگہ پر رکھی ہوئی تھی۔ جہاں سے وہ ذرا سا جھک کر اسے اپنی گرفت میں لے سکتا تھا۔

پل پر چیک پوسٹ کے پاس بوگن نے ٹرک کو روک دیا۔ ہردیال سنگھ کانسٹیبل اس کی طرف بڑھا۔ بوگن نے مسکراتے ہوئے اسے سلام کیا۔ ہردیال سنگھ نے کھڑکی کے قریب آ کر آہستہ سے کہا "جلدی سے نکل جا آج ایس پی صاحب کے آنے کا خطرہ ہے۔ تو نکل جائیں پل کی دوسری پوسٹ پر اطلاع کر دیتا ہوں۔"

بوگن کی چھٹی حس نے یونہی اسے چوکس نہیں کیا تھا۔ اس نے سلام کر کے ٹرک پل پر بڑھا دیا۔ پل کے دوسرے کنارے ڈوگرہ ہیڈ کانسٹیبل کالی رام ہاتھ کے اشارے سے بوگن کو جلدی

سے ٹرک نکال لے جانے کا اشارہ کر رہا تھا۔ یہ دونوں بوگن کے مالک سے ہر ماہ چار چار ہزار روپے وصول کرتے تھے۔ بوگن ٹرک کو تیزی سے نکال کر لے گیا۔ پل سے کافی دور جانے کے بعد بوگن نے ٹرک کو سڑک کے کنارے ایک طرف کھڑا کیا نیچے اتر کر ٹرک کی سائیڈ پر تین بار ہاتھ مارا۔ ندیم اور بادل ناریل کے بوروں کے پیچھے سے نکل آئے۔ بوگن بولا "خطرہ تھا مگر ٹل گیا ہے دادا پستول واپس دے دو اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔"

بادل نے پستول بوگن کو واپس کر دیا اور بائیں جانب کے اونچے اونچے پہاڑوں کی طرف دیکھ کر کہا "بوگن دادا یہاں سے وہ علاقہ شروع ہو جاتا ہے جہاں ہمیں ٹرک سے اترنا ہوگا۔"

بوگن بولا "تو پھر اب تم دونوں میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ۔ اب اندر چھپنے کی کیا ضرورت ہے۔"

بادل اور ندیم نے بھی اطمینان کا سانس لیا اور وہ ٹرک کی اگلی سیٹ پر بوگن کے ساتھ آ کر بیٹھ گئے۔ بوگن نے کہا "جہاں اترنا ہو ہمیں بتا دینا۔"

ٹرک جموں کشمیر روڈ پر رات کے اندھیرے میں دوڑا چلا جا رہا تھا۔ وہ شہر سے کافی دور نکل آئے تھے۔ بادل ایک ایک جگہ کو غور سے دیکھے جا رہا تھا۔ اندھیرے میں بھی اس نے ایک خاص درخت کی نشانی کو اپنے ذہن میں رکھا ہوا تھا۔ جب وہ درخت بادل کو نظر آیا تو اس نے بوگن سے کہا "بس دادا اس درخت کے آگے جہاں سڑک بائیں جانب جاتی ہے وہیں ٹرک روک لینا۔"

تھوڑی دیر بعد ٹرک اس کچی سڑک کے پاس رک گیا جو جموں کشمیر روڈ میں سے نکل کر بائیں جانب دور دراز پہاڑیوں کی طرف نکل گئی تھی۔ بادل نے بوگن ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا اور ندیم کو ساتھ لے کر کچی سڑک پر چل پڑا۔ ندیم نے دور پہاڑیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیا ان پہاڑیوں کے اوپر جانا ہے۔"

بادل نے کہا "نہیں ان پہاڑیوں کی دوسری طرف جانا ہوگا تمھیں اور نجمی کو، کیونکہ ان پہاڑیوں کی دوسری طرف پاکستان ہے۔"

ندیم کے دل سے ایک آہ نکل گئی۔ کہنے لگا "بادل! ایک بار پاکستان پہنچ گیا تو پھر وہاں سے کبھی باہر نہیں جاؤں گا۔ اس بار پاکستان سے باہر آ کر محسوس ہوا کہ اپنا وطن کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوتی ہے۔ واقعی انسان کی عزت اور سلامتی صرف اپنے وطن میں ہی ہے۔"

بادل کہنے لگا "اس میں کوئی شک نہیں۔ کاش میں بھی تمھارے ساتھ پاکستان جا سکتا۔"

ندیم نے کہا "تو تم ہمارے ساتھ چلے کیوں نہیں جاتے بادل؟ یہاں انڈیا میں تمھارے لیے سوائے جیل اور خواری کے اور کیا ہے۔"

بادل نے چلتے چلتے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور کہنے لگا "ندیم تم ابھی چھوٹے ہو۔ ہاں اگر کبھی میں پاکستان آیا تو وعدہ کرتا ہوں تمھیں اور نجمی سے ضرور ملوں گا۔"

سڑک اونچی نیچی تھی اور اس پر چھوٹے چھوٹے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ ندیم نے پوچھا کہ انھیں کتنی دور تک چلنا ہوگا۔ بادل نے کہا "ابھی چار میل چلنا ہوگا۔"

رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ سردی بھی بڑھ گئی تھی لیکن پیدل چلنے کی وجہ سے انھیں زیادہ احساس نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ کچھ دیر بعد تو ندیم کو پسینہ آ گیا۔ جب چار میل کی مسافت بھی طے ہو گئی ندیم نے سانس درست کرتے ہوئے پوچھا "ابھی کتنی دور اور چلنا ہوگا بادل بھائی؟"

بادل نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ندیم کو لے کر ایک ٹیلے کا موڑ گھوما تو کچھ فاصلے پر انھیں ٹمٹماتی ہوئی روشنی دکھائی دی۔ بادل نے اس روشنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ہمیں وہاں جانا ہوگا۔"

یہ سوچ کر ندیم کا دل دھڑکنے لگا کہ وہاں نجمی اس کا انتظار کر رہی ہوگی اس کے منہ سے اپنے آپ نکل گیا "نجمی کی صحت ٹھیک ہے نا بادل بھائی۔؟"

بادل نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ بات تمھیں پہلے یاد کیوں نہیں آئی؟"

ندیم نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا "اسے اپنے قریب پا کر بس اپنے آپ ہی یہ سوال منہ سے نکل گیا۔"

بادل نے کہا "وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ تمھارے لیے بے حد پریشان تھی...... وہ تو تمھاری تلاش میں ایک بار پھر دلی آنے لگی تھی۔ میں نے اسے روک دیا۔ اور ہاں نجمی میں ایک تبدیلی ضرور محسوس ہوگی۔"

"وہ کیا؟" ندیم نے کسی قدر تجسّس سے پوچھا۔

بادل بولا "اس کے سر پر بال نہیں ہیں۔"

اور بادل نے قہقہہ لگایا۔ ندیم کو اس نے بتایا تھا کہ نجمی کو جوگن کا بھیس بدلنے کی خاطر اپنے سر کے بال منڈوانے پڑے تھے۔

بادل نے کہا "ندیم! نجمی نے میری خاطر بڑی قربانی دی ہے اور اس نے جس دلیری سے کام لیتے ہوئے مجھے جیل بلکہ پھانسی کی کوٹھری سے نکالا ہے میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔ مجھ پر اس کا بڑا احسان رہے گا۔"

ندیم کہنے لگا "کوئی بات نہیں بال تو سر پر پھر اُگ آئیں گے۔"

"وہ اب سر پر نیلا رومال باندھے رکھتی ہے۔" بادل نے کہا۔

وہ دونوں اب بلے اسمگلر کی حویلی کے قریب پہنچ رہے تھے۔ بادل اور ندیم کے بارے میں لال دین نے بلے کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ ندیم اور بادل کی سب سے بڑی پہچان تو خود نجمی تھی جس نے ان دونوں کو پہچاننا تھا۔ حویلی کے قریب پہنچے ہی تھے کہ دو آدمی اسٹین گنیں تان کر ان کے سامنے آ گئے۔ بادل نے ندیم کو ہاتھ سے اپنے پیچھے کر لیا اور ایک خاص کوڈ لفظ بولا جس کے جواب میں ان میں سے ایک نے بھی جواب میں ایک خاص لفظ بولا۔ بادل نے کہا "مجھے بلے کے پاس لے چلو۔ میں اس کا مہمان ہوں۔"

اتنے میں حویلی کے کونے والے برآمدے میں سے بلا اسمگلر بھی اسٹین گن پکڑے باہر نکل آیا۔ اس نے بادل اور ندیم کو روشنی میں اپنے قریب آنے کو کہا۔ پھر اپنے آدمی کو اشارہ کیا۔

نجمی کو اندر دیکھ کر ندیم کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ نجمی نے ندیم اور بادل کو دیکھا اور بلے سے کہا "یہی میرے آدمی ہیں۔" بلے نے اسٹین گن کی نالی نیچے کر لی اور بادل سے کہا "تم لوگ اندر چلے جاؤ۔"

ندیم اور بادل نجمی کی طرف بڑھے۔ نجمی نے سر پر نیلا رومال باندھ رکھا تھا کیونکہ اس کے سر پر بال نہیں تھے۔ ندیم نے محبت بھری آواز میں کہا "مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں تمھیں اپنے پاس دیکھ رہا ہوں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نجمی نے کسی قدر غصّے سے کہا "میں تمھیں دوبارہ یہاں نہیں دیکھنا چاہتی تھی تمھیں کس احمق نے یہ مشورہ دیا تھا کہ تم دوبارہ بارڈر کراس کر کے اس جہنم میں آؤ۔" ندیم نے آہستہ سے کہا "میرے دل نے ۔"

نجمی کا دل بھی اب دھڑک اٹھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ندیم نجمی سے بے پناہ پیار کرتا تھا۔ اگرچہ اسی وجہ سے نجمی آج اس حالت میں پہنچی تھی۔ لیکن ندیم نے بھی اپنی ساری زندگی اور جوانی کی ساری خوشیاں اور آرام اس پر قربان کر دیا تھا۔ وہ بار بار موت کے منہ سے نکل کر نجمی سے ملنے اور اسے وہاں سے نکالنے آیا تھا۔ نجمی نے ندیم کا ہاتھ تھام لیا اور اسے اپنے ساتھ اندر لے گئی۔ بلے نے اپنے آدمی کے ہاتھ ان کے لیے کھانا بھجوایا اور یہ پیغام بھی کہ وہ کل ان سے ملاقات کرے گا۔ ندیم، بادل اور نجمی کھانا کھانے کے بعد دیر تک باتیں کرتے رہے۔ نجمی کو شبہ تھا کہ وہ بارڈر کراس کر سکیں گے۔ اس نے بادل سے کہا کہ بلا اسمگلر کسی سے باتیں کر رہا تھا کہ بارڈر پر نئی سیکورٹی فورس آ گئی ہے۔ بادل نے کہا "یہ تو اس سے بات کر کے ہی کچھ معلوم ہو سکے گا۔" رات گزر گئی۔ دوسرے دن بلا ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور بولا "تمھیں بارڈر کراس کرانا میرا فرض بن گیا ہے۔ حالات سازگار نہیں ہیں لیکن میں نے ایک راستہ تلاش کر لیا ہے۔ وہاں سے تم لوگوں کو آدھی رات کے بعد گزرنا ہوگا۔ وہاں قدم قدم پر خطرہ ہوگا۔ لیکن تمھیں ان خطروں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ ورنہ تم ان حالات میں کبھی بارڈر کراس نہیں کر سکو گے۔"

بادل نے کہا "نجمی اور ندیم سخت جان ہیں انھیں مشکلیں برداشت کرنے کی عادت ہے تم فکر نہیں کرو۔"

بلے نے کہا "ٹھیک ہے پھر آج رات تیار رہنا۔ میں تمھیں لے کر ٹھیک نو بجے رات یہاں سے چل پڑوں گا۔" بلا اسمگلر یہ کہہ کر چلا گیا۔ بادل نے اس کے جانے کے بعد نجمی اور ندیم سے کہا "آج رات نو بجے تم اپنے وطن کی طرف سفر شروع کرو گے۔ یہ سفر خطرناک ضرور ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ خدا کی مدد سے تم اپنے پیارے وطن پہنچ جاؤ گے۔"

ندیم بولا "یہ شخص کہاں تک ہمارے ساتھ جائے گا؟"

نجمی نے کہا "جہاں تک وہ جا سکتا ہے جائے گا۔ ایک خاص حد کے بعد ہمیں خود ہی بارڈر کراس

کرنا ہوگا۔ کیا تم ڈر رہے ہو ندیم؟"

ندیم نے محبت بھری نظروں سے نجمی کی طرف دیکھا اور بولا "تم میرے ساتھ ہو تو پھر موت بھی مجھے خوفزدہ نہیں کر سکتی۔"

نجمی کے چہرے پر محبت کی روشن مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر بادل پہلی بار دیکھ رہا تھا وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ ندیم اور نجمی کوٹھڑی میں اکیلے رہ گئے۔ ندیم نے نجمی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا "مجھے معاف کر دینا نجمی۔ میں نے دوبارہ بارڈر کراس کر کے تمھیں ذہنی کوفت دی لیکن یقین کرو تمھارے بغیر وہاں ایک لمحے کے لیے بھی میرا دل نہیں لگتا تھا۔"

نجمی نے اپنا ہاتھ آہستہ سے کھینچتے ہوئے پوچھا "شبانہ لاہور میں ہی ہے کیا؟"

ندیم نے اسے بتایا کہ شبانہ اپنے خاوند کے پاس امریکہ چلی گئی ہے۔ نجمی نے پھر اپنے گھر والوں کے بارے میں دریافت کیا۔ اتنا نجمی کو معلوم تھا کہ اس کا باپ اس کے صدمے سے فوت ہو گیا تھا اور سوتیلی ماں اپنے بیٹے کو لے کر گاؤں چلی گئی تھی۔ ندیم نے کہا "تمھارے گھر کو تمھاری ماں نے بیچ دیا ہے۔ وہاں دوسرے لوگ آ کر رہنے لگے ہیں۔ تمھاری سوتیلی ماں پھر لاہور نہیں آئی۔"

نجمی کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ کہنے لگی "ندیم اگر میری سوتیلی ماں تمھارے ساتھ میرا نکاح کرنے پر راضی ہو جاتی تو آج ہم یہاں نہ ہوتے۔"

ندیم نے کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ نجمی کی ساری مصیبتوں اور اذیتوں کا باعث وہی ہے۔ اگر وہ اسے گھر سے بھگا کر اپنے ساتھ کراچی نہ لے جاتا تو یہ نوبت کبھی نہ آتی۔ نجمی نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ کہ ہمیں بھی کوئی اسلحہ اپنے ساتھ رکھنا چاہیئے کیا؟"

ندیم نے کہا "اسلحے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میرا خیال ہے ہمیں تو چوری چھپے بارڈر کراس کرنا ہوگا۔"

شام کا کھانا کھانے کے بعد بادل ندیم اور نجمی اپنی کوٹھڑی میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ بلا اسمگلر اندر آ گیا کہنے لگا "تم دونوں تیار رہنا؟"

نجمی اور ندیم نے بلے کی طرف دیکھا۔ بادل بولا "ہم تو بالکل تیار ہیں لالہ۔"

بلے نے ندیم اور نجمی کی طرف انگلی اٹھا کر کہا "میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نجمی نے کہا "ہم تیار ہیں۔"

یہی جواب ندیم نے بھی دیا۔ بلا اسمگلر ذرا کھانس کر بولا "ایک بات یاد رکھنا۔ سرحد تمھیں اکیلے ہی پار کرنا ہوگی۔ اگر سیکورٹی فورس کی طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی تو وہیں لیٹ جانا اور لیٹے لیٹے بارڈر کی طرف جانا۔ اگر اٹھے تو سیکورٹی فورس کی گولیاں تم دونوں کو بھون کر رکھ دیں گی۔ دوسری بات .... اگر پکڑے گئے تو چاہے کچھ ہو جائے میرا نام نہ لینا۔"

ندیم اور نجمی نے بلے کو یقین دلایا کہ وہ اس کی ہدایت کے مطابق چلیں گے اور پکڑے جانے کی صورت میں اس کا نام زبان پر نہیں آئے گا۔ بلے اسمگلر کو ان پر زیادہ یقین نہیں تھا لیکن وہ اپنے دیرینہ دوست لال دین کی وجہ سے ان لوگوں کو بارڈر کراس کرانے پر مجبور تھا۔ بلا اسمگلر رات نو بجے آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ رات کو ٹھیک نو بجے جیپ تیار تھی وہ سب لوگ اس میں سوار ہوئے اور جیپ پہاڑی راستے پر بارڈر کی طرف روانہ ہو گئی۔ بلے اسمگلر کے ساتھ اس کے تین محافظ تھے جنھوں نے اسٹین گنیں تھام رکھی تھیں۔ جیپ اونچے نیچے پہاڑی راستے پر ایک خاص رفتار کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ جیپ کی بتیاں بجھا دی گئی تھیں۔ بلا خود جیپ چلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بادل اور بلے کا ایک محافظ بیٹھا تھا۔ نجمی اور ندیم جیپ کے پیچھے بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ دو مسلح محافظ تھے۔ جیپ اوپر سے بند تھی۔ سائیڈ پر ترپال میں ایک ایک کھڑکی رکھی تھی جس میں سے ندیم اور نجمی کو سوائے اندھیرے کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ان اونچے نیچے سنگلاخ پہاڑی راستے پر جیپ ایک گھنٹہ تک چلتی رہی۔ پھر بلے نے جیپ روک دی۔ یہاں اس کے چار آدمی ایک ٹیکری کے پیچھے خچر لیے کھڑے تھے۔ یہاں جیپ چھوڑ دی گئی اور وہ خچروں پر سوار ہو گئے۔ اب دشوار گزار پہاڑی راستہ تھا۔ کبھی چڑھائی آ جاتی کبھی اترائی۔ کہیں کسی دیہاتی آبادی کا نشان بھی نہیں تھا۔ بلے نے ندیم کو بتایا کہ یہ سارا علاقہ غیر آباد ہے اور انڈین فوج کی تحویل میں ہے۔ خچروں پر سفر کافی تکلیف دہ اور لمبا تھا۔ گیارہ بجے رات وہ ایک اونچا پہاڑ پار کر کے اس کی دوسری طرف پہنچے تو ندیم اور نجمی نے دیکھا کہ آگے اونچی نیچی ٹیکریوں کا ایک طویل سلسلہ اندھیرے میں تاروں بھرے آسمان کے نیچے پھیلتا چلا گیا تھا۔ یہاں پہنچ کر خچروں کو بھی واپس بھیج دیا تھا۔ بلے نے بادل سے کہا "یہاں سے تم بھی ان کے ساتھ ہی واپس

چلے جاؤ کیونکہ اب آگے تمھارا کام نہیں ہے۔ میں اکیلا ہی انھیں بارڈر کی آخری پٹی تک لے جاؤں گا۔ میرے ساتھ میرا ایک مسلح محافظ ہوگا۔"

بادل کا نجمی اور ندیم کو چھوڑنے کا دل نہیں چاہتا تھا مگر وہ مجبور تھا۔ ندیم بادل کے گلے لگ گیا اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

رات اندھیری تھی۔ پہاڑیوں میں تاریک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نجمی نے بادل کی طرف اندھیرے میں دیکھا اور کہا۔

"بادل! تم ایک بہادر آدمی ہو۔ میں بھی بہادر اور دلیر لڑکی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ ہم بہادر آدمیوں کی طرح ایک دوسرے سے جدا ہوں۔ شاید اس کے بعد ہم زندگی میں کبھی ایک دوسرے سے نہ مل سکیں۔ تمھاری دوستی کی میں نے ہمیشہ قدر کی ہے اور ہمیشہ اسے عزت اور قدر و منزلت سے یاد کروں گی۔"

نجمی نے ہاتھ آگے بڑھایا بادل نے نجمی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مصافحہ کرتے ہوئے بولا "میں تم دونوں کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ خدا تم دونوں کو ہمیشہ سلامت اور خوش و خرم رکھے بس میری زندگی کی یہی ایک آرزو ہے۔"

بادل نے نجمی کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا کر چھوڑ دیا۔ بلے نے کہا "جلدی کرو۔"

بادل بلے کے آدمیوں کے ساتھ خچر پر بیٹھ گیا اور اندھیرے میں یہ خچر بلے کے دو مسلح محافظوں کے ساتھ واپس چل پڑے۔ نجمی اور ندیم اس وقت بادل کو دیکھتے رہے جب تک کہ بادل اندھیرے میں ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔

اب ندیم اور نجمی کے ساتھ صرف دو آدمی تھے ایک بلا اسمگلر اور دوسرا اس کا مسلح محافظ۔ رات سرد تھی اور آسمان پر ستارے بھی چپ چاپ ان لوگوں کو تک رہے تھے۔ آس پاس چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر ایک مہیب سناٹا چھایا تھا۔ بلا اسمگلر آگے آگے چل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ رک کر اندھیرے کا جائزہ لیتا۔ ہاتھ کے اشارے سے ندیم اور نجمی کو رکنے کے لیے کہتا۔ فضا میں کچھ سونگھتا اور پھر قدم قدم آگے چل پڑتا۔ پتھروں اور سنگ ریزوں پر چلنے کی وجہ سے ہلکی ہلکی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ بلا ایک ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ وہ ٹیلے کے پہلو سے ہو کر اوپر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بڑھ رہا تھا۔ ندیم، نجمی اور مسلح محافظ بھی اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ ٹیلے کی دوسری طرف ایک گھاٹی تھی جس کے درمیان میں ایک چھوٹا سا پہاڑی نالہ بہہ رہا تھا۔ انھوں نے وہ نالہ عبور کیا سامنے ایک کالا اونچا پہاڑ آگیا بلا پتھروں پر بیٹھ گیا اور سرگوشی میں بولا "اب بولنا نہیں، کھانسنا نہیں، پاؤں کی آواز پیدا نہ ہو۔ ہم انڈین بارڈر کے قریب آگئے ہیں۔ میرے پیچھے پیچھے آؤ۔"

بلے اسمگلر کا مسلح محافظ وہیں بیٹھ گیا۔ بلا اکیلا پہاڑ کو جانے والی پگڈنڈی چھوڑ کر چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کے درمیان سے گزرنے لگا۔ ندیم اور نجمی اس کے پیچھے تھے۔ یہ سب جھک کر پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے جا رہے تھے۔ اندھیرے میں انھیں بلے اسمگلر کا سایہ سا نظر آ رہا تھا۔ ندیم نے نجمی کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ بلا اسمگلر اب ہر چھ سات قدم چلنے کے بعد رک جاتا تھا اور ہاتھ سے ندیم اور نجمی کو بھی رکنے کا اشارہ کر دیتا۔ اس سرد رات میں بھی ندیم اور نجمی کے جسم پسینے میں شرابور ہو گئے تھے۔ اچانک ایک شاخ چھوٹا اور سارا علاقہ گلابی روشنی میں شرابور ہو گیا۔ بلا تیزی سے جھاڑیوں میں بیٹھ گیا۔ ندیم اور نجمی نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہ انڈین بارڈر سیکورٹی فورسز نے ایک روشنی کا گولا فضا میں چھوڑا تھا۔ سرخی مائل روشنی کا گولا ننھے سے پیراشوٹ کے ساتھ آہستہ آہستہ زمین پر آتا گیا۔ اس کے بعد ایک بار پھر وہاں اندھیرا چھا گیا۔ بلا اسمگلر رینگتا ہوا ندیم اور نجمی کے پاس آیا اور سرگوشی میں بولا...

"یہ روشنی کے گولے بارڈر سیکورٹی والے چلاتے رہتے ہیں۔ خاموش لیٹے رہو۔"

دس پندرہ منٹ اسی طرح جھاڑیوں میں شبنم سے گیلی گھاس پر یہ لوگ بے حس و حرکت لیٹے رہے۔ اس کے بعد بلا اسمگلر آہستہ آہستہ آگے بڑھا اس کے ہاتھ سے ندیم اور نجمی کو بھی پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ رینگتے رینگتے یہ لوگ ایک جگہ آگئے جہاں سامنے سے تھوڑی سی کھلی جگہ تھی جہاں ایک خشک نالہ تھا بلے نے ندیم کے کاندھے کے ساتھ اپنا منہ لگاتے ہوئے بہت ہی دھیمی سرگوشی میں کہا "اس خشک نالے کے پار پاکستان کی سرحد شروع ہوتی ہے اس نالے کو پار کرنا تمھارا کام ہے۔ میرا کام تمھیں یہاں تک لانے کا تھا میں واپس جا رہا ہوں۔ تم پر فائرنگ بھی ہو سکتی ہے اب تم جانو تمھارا کام ..... میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔"

اور بلا تیزی سے لیٹے لیٹے پیچھے کو گھوم گیا اور کہنیوں کے بل رینگتا ہوا جھاڑیوں کے اندھیرے

میں گم ہو گیا۔ ندیم اور نجمی وہاں اکیلے رہ گئے۔ انھیں محسوس ہوا کہ وہ دشمن کے پیٹ کے اندر آ گئے ہیں اور کسی بھی وقت ان پر مشین گن کا فائر کھل سکتا ہے۔ ندیم کچھ گھبرا رہا تھا۔ نجمی رینگ کر اس کے قریب آگئی اور اس کے کان میں کہا "اب ہمت ہاری تو تھوڑی دیر بعد یہاں ہماری لاشیں پڑی ہوں گی۔ میرے پیچھے پیچھے آؤ۔"

نجمی انتہائی دلیری کے ساتھ خشک نالے کی طرف رینگنے لگی۔ یہاں زمین اونچی گھاس سے بھری ہوئی تھی انھیں زمین میں لگی ہوئی بارودی سرنگوں کا بھی خطرہ تھا۔ بلے اسمگلر نے ان بارودی سرنگوں کے بارے میں ان دونوں کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ رینگتے رینگتے دونوں خشک نالے کے کنارے پہنچ گئے نالے میں پانی نہیں تھا اس کے کنارے زیادہ اونچے بھی نہیں تھے مگر نالہ کافی کشادہ تھا۔ نجمی نے لیٹے ہی لیٹے اپنے آپ کو نالے میں لڑھکا دیا۔ ندیم نے بھی اس کے پیچھے ایسا ہی کیا۔ وہ خشک نالے کی ریتلی تہہ میں گر پڑے۔ ان کے گرنے سے ہلکی سی آواز پیدا ہوئی۔ دونوں وہیں پڑے رہے۔ جب انھیں یقین ہو گیا کہ ہر طرف خیریت ہے اور ان کے گرنے کی آواز کسی دوسرے نے نہیں سنی تو نجمی نالے میں اس کے دوسرے کنارے کی طرف رینگنے لگی۔ ندیم اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ نالے کے دوسرے کنارے پر گھنی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ جب وہ ان جھاڑیوں کے پاس پہنچے تو نالے میں ایک طرف سے روشنی ہو گئی۔ ساتھ ہی جیپ کے انجن کی آواز سنائی دی۔ وہ تیزی سے لڑھکتے ہوئے جھاڑیوں میں گھس گئے۔ یہ انڈین بارڈر فورس کی جیپ تھی جو تیزی سے خشک نالے میں سے گزر گئی۔ جیپ میں بارڈر فورس کے سپاہی بیٹھے ہوئے تھے۔

نجمی نے آہستہ سے کہا "میرا خیال ہے نالے کے اس کنارے کے پار پاکستانی بارڈر ہے۔"

ندیم نے نجمی کا بازو دباتے ہوئے کہا "جینا تمھارے ساتھ مرنا تمھارے ساتھ اللہ کا نام لے کر پاکستان کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔"

نجمی ابھی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ندیم نے نجمی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور رات کی تاریکی میں جتنی تیز دوڑ سکتا تھا سامنے کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ قسمت ان دونوں مصیبت کے ماروں اور ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرنے والوں کا ساتھ دے رہی تھی۔ قدرت کو بھی اب ان پر رحم آگیا تھا اور وہ دو دلوں کا ملاپ چاہتی تھی۔ وہ ایک ایسی ڈگر پر اندھیرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں دوڑ رہے تھے۔ جدھر سے ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک بارڈر اسکوارڈ گزرا تھا۔ یہ ایک فرلانگ کا سارا علاقہ جھاڑیوں سے بالکل صاف تھا جو دونوں محبت کرنے والوں نے دوڑ کر طے کر لیا۔ آگے پھر جنگلی جھاڑیوں اور اونچے نیچے مٹی کے تودوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جن پر کانٹے کی لمبی لمبی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ دونوں بے دم ہو کر ان جھاڑیوں کے پاس گر گئے۔ وہ ہانپ رہے تھے وہ ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے ڈر رہے تھے کہ کوئی ان کی آواز نہ سن لے۔ جب ان کا سانس درست ہوا تو انھوں نے وہیں لیٹے لیٹے رینگنا شروع کر دیا۔ مٹی کے تودے ختم ہو گئے شور زدہ زمین آ گئی۔ یہ علاقہ بھی انھوں نے رینگتے ہی پار کیا۔ آگے پھر جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا یہاں وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ نجمی نے ندیم کے کان میں کہا "ہم پاکستان میں آ گئے ہیں۔" وہ اندھیرے میں سامنے گھور رہے تھے جہاں کالے کالے درختوں کی قطار دائیں سے بائیں جانب دور تک چلی گئی تھی ان کے پیچھے ایک جیپ روشنی کے سیلاب کے ساتھ شور مچاتی تیزی سے گزر گئی۔ ایک طرف پہاڑیاں تھیں جنگلی جھاڑیوں کو پار کرنے کے بعد انھوں نے ٹیلوں کی گھاٹی میں دوڑنا شروع کر دیا۔ یہاں اندھیرے میں پہلی بار انھوں نے ٹیلوں کی ڈھلانوں پر چھوٹے چھوٹے کھیت دیکھے وہ بھاگتے چلے گئے۔ گھاٹی سے نکلے تو سامنے ایک چھوٹی سی پگڈنڈی تھی جو چیڑھ کے درختوں میں گھری ہوئی تھی۔

دور ایک جگہ انھوں نے ٹمٹماتی ہوئی روشنی دیکھی وہ قریب گئے تو ایک چھوٹا سا کچا مکان تھا جس کے باہر لالٹین روشن تھی۔ رات کے دو اڑھائی بجے کا وقت ہو گا۔ سرد ہوا چل رہی تھی پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں سردی تھی مگر ندیم اور نجمی کو بالکل سردی نہیں لگ رہی تھی

ندیم نے نجمی کو ایک طرف لے جا کر کہا "کہیں ہم انڈیا کے علاقے میں ہی نہ ہوں۔"

نجمی نے درختوں ٹیلوں اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہاں مجھے میرے پیارے وطن پاکستان کی مٹی کی خوشبو آ رہی ہے۔ تم میرے ساتھ آؤ۔"

نجمی نے کچے مکان کے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھے نے دروازہ کھول کر پوچھا "کون ہے بھئی اس وقت؟" ندیم نے بے تابی سے پوچھ لیا "یہ پاکستان ہے بابا۔؟"

"ہاں" بوڑھے نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا "تم کہاں سے آ رہے ہو۔ کون ہو تم؟"

نجمی اور ندیم وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔ نجمی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ چہرہ اپنی ہتھیلیوں میں چھپا کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔ ایک مدت کے بعد اس نے اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ ایک مدت کے بعد اس کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہہ رہے تھے، یہ خوشی کے آنسو تھے، غم کے آنسو تھے، پچھتاوے اور ملال کے آنسو تھے۔ نجمی کو کچھ معلوم نہیں تھا وہ بچوں کی طرح چہرہ تھامے رو رہی تھی۔ بوڑھا حیران کھڑا تھا اور ندیم اسے دلاسہ دینے کی کوشش کرتے ہوئے خود بھی آنسو بہا رہا تھا۔

...

نجمی اور ندیم پاکستان پہنچ گئے۔ نجمی لاہور میں اپنا پرانا مکان دیکھنے گئی اور نہ ہی اپنے کالج کو ایک نظر دیکھنے گئی۔ ایک دن وہ لاہور کے ایک ہوٹل میں وہ ٹھہرے اور اگلے دن پنڈی اور ہری پور ہزارہ سے ہوتے ہوئے ایبٹ آباد اور پھر وہاں سے کاغان کی طرف نکل گئے۔ یہاں ایک گاؤں میں انھوں نے ایک امام مسجد کے پاس جا کر چار مسلمان گواہوں کی موجودگی میں شادی کر لی اور پھر اسی چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں اپنی نئی زندگی شروع کر دی۔

ایک رات اچانک وادی میں گولی چلنے کی آواز گونج گئی۔ نجمی سو رہی تھی۔ اس کا ہاتھ... بے اختیار دائیں جانب اٹھا جیسے وہ اپنی رائفل اٹھانے لگی ہو۔ اس کا ہاتھ رائفل کی بجائے ندیم کے شانے پر گیا۔ ندیم جاگ پڑا "کیا بات ہے نجمی؟" نجمی مسکرا دی۔

"کہیں گولی کا دھماکہ ہوا تھا۔ میں سمجھی دشمن آ گیا ہے اور میں اپنی رائفل اٹھانے لگی تھی۔"

ندیم نے نجمی کا ہاتھ چوم کر کہا "یہاں دشمن اب کبھی نہیں آئے گا۔" باہر وادی کی سرد رات میں گلاب اور چیڑھ کی خوشبو پھیلتی چلی گئی اور رات چلتے چلتے جیسے رک گئی۔

ختم شد